ہم عصر افسانہ نمبر
شیرازہ
جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز

ماہنامہ

شیرازہ

سرینگر، کشمیر

جلد: ۵۱ | ہم عصر افسانہ نمبر | شمارہ: ۱ تا ۳

نگران : خالد بشیر احمد

مُدیرِ اعلیٰ : محمد اشرف ٹاک

معاون مدیر : سلیم سالکؔ

معاونین : سلیم ساغرؔ، محمد اقبال لون

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ناشر : سیکریٹری، جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

کمپیوٹر کمپوزنگ : فیروز احمد کمار

مطبع :

قیمت : ۱۰۰ روپے

''شیرازہ میں جو افسانے شائع ہوئے ہیں اُن میں ظاہر کی گئی آرا سے اکیڈیمی یا اِدارے کا کُلاً یا جُزواً اتفاق ضروری نہیں''۔

☆......خط و کتابت کا پتہ:

مدیر اعلیٰ ''شیرازہ'' اردو

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز

سرینگر/جموں

فہرست

...........☆☆☆...........

حرفِ آغاز

کلچرل اکیڈیمی اپنے فرائض منصبی کی عملداری میں فن، ثقافت اور ادب کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرنے اور ان کی آبیاری میں زمانے کے سرد وگرم کے باوجود کامیابی کے ساتھ رواں دواں ہے۔ آج ہم ریاست میں اردو ادب کی ایک اہم صنف افسانہ کا احاطہ کرنے والا ''ہم عصر افسانہ نمبر'' آپ کے ہاتھوں میں دے رہے ہیں۔

ہماری ریاست کے تینوں خطوں جموں۔ کشمیر اور لداخ سے گزشتہ سینکڑوں برسوں سے ایسے قلم کار اُٹھے جو ادبی سرمائے کے عالمی منظرنامے پر امتیازی شان کے ساتھ نظر آئے ہیں۔ اس عرصے میں جو ادبی جدوجہد جاری رہی اس کے رجحانات مختلف زمانوں میں متنوع رہے جو کہ تخلیقی ادب کا خاصا بھی ہے۔ زبانوں کی ترویج، ان کا دامن وسیع کرنے، ثقافتی اساس کے تحفظ اور اس کی ترویج میں نثری سرمایہ کلیدی کردار ادا کرتا رہا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ مختلف ادوار میں یہ سرمایہ اکثر و بیشتر گزرتے وقت کی دبیز تہہ کے نیچے چھپ جاتا ہے کیونکہ اس کو بروقت مناسب دستاویزی شکل نہیں دی جاتی۔ اس افسوس ناک زیاں کا احساس ہر ذی شعور کو ہوتا ہے۔ اپنے ممکنہ وسائل سے استفادہ کرتے ہوئے اس کوتاہی کا ازالہ کرنے کے لئے یہ فیصلہ لیا گیا کہ ریاست میں اردو افسانہ کا ایک خوبصورت انتخاب ''ہم عصر افسانہ نمبر'' کے نام سے شائع کیا جائے۔

آج سے کئی برس قبل اکیڈیمی نے ''ہم عصر شعری انتخاب نمبر'' مرتب کر کے اپنے

محترم قارئین کے ہاتھوں میں سونپ دیا تھا جس کو کافی پذیرائی حاصل ہوئی بعد میں ''ہم عصر تھیٹر نمبر'' شائع کیا گیا جو کہ اپنی نوعیت کی پہلی کوشش تھی۔ آج ہم ''ہم عصر افسانہ نمبر'' لے کر حاضر ہوئے ہیں جس میں ریاست کے ہم عصر افسانہ نگاروں کے کسی قدر مختصر تعارف کے ساتھ ساتھ اُن کا ایک ایک نمائندہ افسانہ شامل کیا گیا ہے۔ سلسلے کو کافی وسیع کیا جا سکتا تھا لیکن طوالت کے خوف سے ہم نے ہر افسانہ نگار کے صرف ایک ہی افسانے پر ہی اکتفا کیا ہے۔

مشاہدے میں آیا ہے کہ ریاست کے دور دراز علاقوں میں رہائش پذیر ہمارے اصحاب قلم کو وہ سہولیات اور مواقع میسر نہیں ہو پاتے جو شہروں یا بڑے قصبوں کا خاصا ہے۔ ہماری کوشش ہے کہ ریاست کے دور دراز علاقوں کے اہلِ قلم کو علمی و ثقافتی کارواں کا حصہ بنانے کے لئے مناسب سہولیات فراہم کر سکیں۔ زیرِ نظر اشاعتِ خصوصی میں اس امر کو خاص طور ملحوظ رکھا گیا ہے کہ افسانہ سے قبل افسانے نگار کا مختصر سوانحی خاکہ پیش کیا جائے اور ساتھ ہی یہ کوشش بھی کی گئی ہے کہنہ مشق افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ اس صنف کے ساتھ وابستہ نو آموز افسانہ نگاروں کی تخلیقات کو بھی مناسب جگہ ملے۔ امید ہے کہ یہ کاوش پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جائے گی۔

اگر چہ ہم نے اپنے محدود وسائل کے باوجود اس اشاعت کو جامع بنانے کی کوشش کی ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ کوئی افسانہ نگار اس اشاعت میں شامل ہونے سے رہ گیا ہو۔ اگر یہ تسامح واقعی ہم سے ہو گیا ہو تو اِس سلسلے میں ہماری رہنمائی کی جائے تاکہ آئندہ اشاعت میں اِسے دُرست کیا جا سکے۔

زیرِ نظر اشاعت خصوصی کے بارے میں آپ کی آراء کا انتظار رہے گا۔

☆...... محمد اشرف ٹاک

حامدی کاشمیری

نام	:حبیب اللہ بٹ
قلمی نام	:حامدی کاشمیری
تاریخِ پیدائش	:۲۹؍جنوری ۱۹۳۲ء، بہوری کدل، سرینگر
تعلیم	:پی۔ایچ۔ڈی (اُردو)
تصانیف	:تنقید......۲۹ کتابیں، فکشن......۹ کتابیں شاعری......۱۰مجموعے
افسانوی مجموعے	:وادی کے پھول (۱۹۵۷)، سراب (۱۹۵۹) برف میں آگ (۱۹۶۱)، شہرِ افسوں (۲۰۰۹)
ناول	:(۱)بہاروں میں شعلے، (۲) پگھلتے خواب، (۳) اجنبی راستے، (۴) بلندیوں کے خواب، (۵) پرچھائیوں کا شہر
اعزازات	:پدم شری، ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، کلچرل اکیڈیمی ایوارڈ، اُترپردیش اُردو اکادمی ایوارڈ، غالب ایوارڈ، بنگال اُردو اکادمی ایوارڈ، بہار اُردو اکادمی ایوارڈ
پتہ	:کوہِ سبز، مسعود منزل، شالیمار، سرینگر

☆......پروفیسر حامدیؔ کاشمیری

نملی

کمرے کی کھڑکی سے صبح کی تازہ دھوپ اندر آکر سفید دیوار پر تھرتھرا رہی تھی اور میں بیڈ پر تکیے سے ٹیک لگائے، ٹانگوں پر رضائی اوڑھے سگریٹ پی رہا تھا۔ کمرہ آج خالی خالی سا تھا۔ دیوار کے ساتھ لگا ہوا بیڈ خالی تھا۔ دیواریں ننگی تھی۔ کل شام تک یہ کمرہ کتنا بھرا بھرا سا تھا۔ چیزوں سے اٹا ہوا۔ کچھ چیزیں قرینے سے تھیں اور کچھ بکھری بکھری سی۔ میلے کپڑے، صاف کپڑے، جوتے، سینڈل، ہینڈ بیگ، کھلونے، ربڑ کی ایک بڑی گڑیا سکٹ کے ڈبّے، کریم کی خالی شیشیاں، کاغذ کے پُرزے چھوٹا سا رنگین چھاتا، ربڑ کے بال، ابھی ابھی چیزوں کو سنبھال کر قرینے سے رکھا جاتا اور ابھی مسعود ایک ڈھیر سا لگا دیتا۔ ہر چیز کو اپنی جگہ سے ہٹاتا، تہس نہس کرتا، کمرے کو کباڑ خانہ بناتا اور پھر ممی کی ڈانٹ کھاتا، ڈانٹ کھا کر یا تو غصے میں چیزوں کو اور زیادہ الٹ پلٹ کرتا، یا چپکے سے کمرے سے باہر نکلتا اور نملی کے پاس جاتا اور ہم دونوں پھر کمرے کی تزئین میں لگ جاتے۔ لیکن آج سارا کمرہ لٹالٹا سا لگ رہا تھا۔ ایک عجیب سی ویرانی کا احساس میرے دل کو کچو کے لگا تا رہا اور میں تیز تیز سگریٹ پیتا رہا۔

بیوی بچوں کے بغیر انسان کی زندگی کتنی اجاڑ اور بے معنی سے معلوم ہوتی ہے۔ آج کی صبح کتنی بے رنگ اور پھیکی سی تھی مجھے شدت سے محسوس ہو رہا تھا کہ میں اپنے وطن سے دور ہوں اپنے گھر سے دور۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔

میں دستک کو فوراً پہچان گیا، یہ نملی تھی۔ وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے دروازہ

پیٹ رہی تھی میں چپ رہا۔لیکن وہ برابر دروازہ کھٹکھٹاتی رہی۔آخر تنگ آ کر میں نے روکھے سے لہجے میں کہاں، انجان بن کر۔

''کون ہو؟''

''میں ہوں نملی کھولو درواجا ماشود''نملی کی آواز بند دروازے کو چیر کر آرہی تھی،

''مسعود یہاں نہیں ہے''میں نے بستر میں بیٹھے بیٹھے ہی جواب دیا۔

''ہاں ماشود ہے۔ کھولو درواجا، وہ ینچے نی ہے''،نملی ضد کر رہی تھی، یہ اس کی عادت تھی اور میں بے چینی اور جھنجھلاہٹ سی محسوس کرنے لگا۔میں نے زور سے کہا۔

''نملی تم چلی جاؤ، مسعود کل گھر گیا ہے۔ممی ہے ساتھ''

''ماشود نی گیا، ماشود اپنا گھر میں ہے۔ماشود کھولو درواجا......''

نملی زور سے چیخ رہی تھیں اور ساتھ ہی وہ دونوں ہاتھوں سے دروازہ پیٹ رہی تھی۔ میں اس کی ضد سے واقف تھا۔روز صبح ہوتے ہی، جب کہ ابھی ہم بستر ہی پر پڑے ہوتے، وہ آکر دروازہ کھٹکھٹاتی اور اس وقت تک برابر کھٹکھٹاتی جب تک میں بستر سے نکل کر دروازہ نہ کھولتا اور ادھر مسعود کی آنکھ بھی تکرار اور سوال و جواب میں کُھل جاتی تو پلکوں پر نیند کے بوجھ کے باوجود وہ نملی کا ساتھ دیتا اور دروازہ کھولنے پر احتجاج کرتا اور مجھے دروازہ کھلونے میں مزید تامل کی گنجائش نہ رہتی، میں دروازہ کھول دیتا اور نملی سیدھے مسعود کے بیڈ پر آجاتی اور وہ دونوں بہت شور مچاتے۔ایک دوسرے کو گلے لگاتے......

''آہا ماشود''

''نملی، نملی''

مسعود فوراً ممی سے بسکٹوں کا روزمرہ کا کوٹا حاصل کرتا اور نملی کے ساتھ مل کر کھاتا اور پھر دونوں کھیل میں مصروف ہو جاتے، شور مچاتے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے۔یہ اُن کا روزمرہ کا معمول تھا اور نملی دو مہینوں سے ہمارے کمرے میں آرہی تھی اور......

میں نے بستر سے نکل کر دروازہ کھول دیا۔

اور نملی ایک نئے پھول دار فراک میں ڈھلے ہوئے منہ کے ساتھ کمرے کے اندر آئی، تالی بجاتی ہوئی۔

وہ سیدھے دیوار کے ساتھ لگے بیڈ کی طرف گئی۔ لیکن چند قدم آگے جا کر رُک گئی۔

''کہاں ہے ماشود'' ......؟ وہ کمرے کو بغور دیکھ رہی تھی۔

''میں نے کہا نا، مسعود گھر گیا ہے۔ ممی کے ساتھ...... وہ کل گیا''

''نی نی یہ ماشود کا اپنا گھر ہے...... وہ کہا ہے؟'' وہ احتجاج کرنے لگی اور میں نے ٹیبل سے ٹوتھ پیسٹ اٹھایا اور بُرش پر پھیلانے لگا۔

''ہاں ہاں: اچانک وہ خوشی سے اچھل پڑی۔'' وہ باتھ روم میں ہے ہمارا ماشود اور یہ کہہ کر وہ باتھ روم کے بند دروازے کو زور زور سے کھٹکھٹانے لگی۔

وہ باتھ رُوم میں نہیں ہے لو میں دروازہ کھولتا ہوں، دروازہ کھل گیا اور وہ بے تحاشا اندر چلی گئی،

میں اس کے ساتھ ہی کھڑا دانتوں پر برش پھیر رہا تھا۔

وہ پل بھر تک باتھ روم کو دیکھتی رہی۔ اس کا چھوٹا سا گول مٹول چہرہ اداس ہو گیا اور وہ بڑبڑانے لگی۔

''ماشود نہیں ہے، وہ کہاں ہے؟'' وہ مڑی کمرے پر ایک اور نظر ڈال کر وہ کچھ سوچتی رہی۔ اچانک اس کا چہرہ کھل اٹھا اور خوشی سے پکار اٹھی۔

''ہاں ہاں ماشود نیچے ہے...... ابھی لاتی ہوں......'' یہ کہہ کر وہ ہوا کے ایک تیز جھونکے کی طرح کمرے سے نکل گئی''۔

میں نے دروازہ بند کیا اور باتھ روم میں داخل ہوا۔

میں ڈرائنگ روم میں ٹیبل پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ تنہا تنہا، چپ چاپ مقبول نے چائے کا سامان لگایا تھا اور اب وہ کچن میں مصروف تھا۔ کمرے میں خاموشی تھی۔ ٹیبل پر آج دوسری پیالیاں اوندھے منہ رکابیوں پر پڑی تھیں میں نے جلدی سے پہلا کپ خالی کیا

اور دوسرا کپ بنانے لگا۔ آج چائے پینے میں کوئی لطف نہیں آ رہا تھا۔ آج پیالی میں بیوی چینی نہیں ڈال رہی تھی اور نہ ہی چمچے سے چینی گھول رہی تھی۔ مسعود بھی وہاں نہیں تھا اور نہ ہی مسعود کے بغل میں نملی بیٹھی تھی۔ سارے ہنگامے خاموش ہو چکے تھے۔ مجھے پھر ایک بار شدت سے اپنے اکیلے پن کا احساس ہوا۔ اگر میں کل ان کے ساتھ ہی گھر روانہ ہو گیا ہوتا۔ تو کتنا اچھا ہوتا، لیکن...... لیکن مجھے انشورنس کا کافی کام کرنا تھا اور اس مہینہ میں تمام امور کو طے کرنا چاہتا تھا۔ تین مہینوں کے اس وقفہ میں دفتری امور سے نمٹنے کے علاوہ میں نے مسعود کو دلی کے ایک معروف چائلڈ سپیشلسٹ کو دکھایا تھا اور اس کا باقاعدہ علاج کرایا تھا۔ ڈاکٹر ورمانے مسعود کے علاج معالجے میں ہمدردی اور شفقت کا مظاہرہ کیا تھا۔ ہمارے شہر کے ہسپتال کے ڈاکٹروں کی رعونت سے اگر مریض کی حالت اور زیادہ خراب ہوتی ہے۔ تو تعجب کی بات نہیں۔ لیکن ڈاکٹر ورما کتنی توجہ سے اس کا معائنہ کرتے رہے...... پچھلے سال مارچ...... ہاں مارچ کا مہینہ ہی تو تھا۔ وہ بیمار ہو گیا اور معمولی سے زکام نے رات کو دمہ کی شکل اختیار کی اور ساری رات اس کا سینہ دھونکنی کی طرح ہلتا رہا کچھ دیر تک وہ میری گود میں رہا اور اس کے سینے کے ہلنے سے میرا سارا جسم ہل رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے سارا مکان ہل رہا ہے۔ کتنی طویل رات تھی۔ پہاڑ کی طرح بھاری، نامعلوم اندیشے مجھے پریشان کر رہے تھے اور صبح کی نرم روشنی میں جب لان میں پھولوں کی شاخوں نے انگڑائی لی اور غنچوں نے آنکھیں کھولیں تو اُسے قرار آیا اور وہ گہری نیند سو گیا اور پھر......؟ بیماری کا یہ حملہ ہر مہینہ ہوتا رہا اور ڈاکٹروں نے دوائیں کھلا کھلا کر اس کی قوتِ مدافعت ختم کر کے رکھ دیا۔ یہ ڈاکٹری علاج بھی کتنا Inexact ہوتا ہے۔ ہر ڈاکٹر اپنی سمجھ اور علم کے مطابق نسخہ لکھ مارتا ہے اور دو ڈاکٹروں کے اپروچ میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ مولئیر نے اپنے کسی ڈرامے میں خوب لکھا ہے۔ کہ انسان کی سب سے بڑی حماقت یہ ہے کہ وہ انسان کا علاج کرتا ہے۔

مقبول آیا۔

"صاحب شام کے لئے کیم پر گوشت پکانا ہے؟"

''جو تمہاری مرضی......'' میں ٹیبل سے اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ کچن سے ملحق دروازہ کھل گیا اور نملی دوڑتی ہوئی اندر آئی، وہ سیدھی میرے سامنے آئی اور پوچھنے لگی۔

''ماشود کہاں ہے؟...... یہاں نی ہے، اوپر نی ہے۔ باغ میں نی ہے گیتا کے پاس نی ہے......وہ کہاں گیا؟''

میں نے غور سے اُسے دیکھا۔ اس کے ابھرے ابھرے پپوٹوں میں پھنسی ہوئی گول گول چھوٹی چھوٹی آنکھیں بے چینی سے پھر رہی تھی۔ اس کے غبارے کی طرح پھولے ہوئے چھوٹے سے گول سانولے چہرے پر تردّد تھا۔ جیسے اسے اب گمان ہو رہا تھا کہ مسعود چلا گیا ہے...... بیچاری کو اپنے دوست کی جدائی شاق گزر رہی ہے۔ مسعود اطلاع دیئے بغیر نا معلوم طریقے پر وہاں سے چل دیا تھا اور نملی کا چھوٹا سا ذہن پریشان تھا۔ یہ مسعود صبح سویرے پر لگا کر کہاں اُڑ گیا؟ اس کی یہ پریشانی اور اضطراب دیکھ کر مجھے اپنے غم کا احساس تیز ہوا۔ نملی تھوڑی دیر کے بعد گیتا اور دوسری ہمجولیوں کے ساتھ کھیلنے میں لگ جائے گی اور مسعود کو بھول جائے گی۔ میں نے اسے پھر سمجھایا۔ لیکن وہ مجھے ساکت آنکھوں کے ساتھ تکتی رہی۔

مقبول ٹیبل صاف کر رہا تھا۔

اور میں اوپر کمرے میں کپڑے تبدل کرنے کے لئے سیڑھیاں پھلانگنے لگا۔

میں شام کو واپس لوٹا۔ تھکا تھکا سا، آج مجھے کام کے سلسلہ میں ہیڈ آفس جانا پڑا تھا۔ چائے میں نے دفتر میں پی لی تھی۔ کمرے میں پہنچتے ہی میں بستر پر لیٹ گیا۔ اتنے میں نملی آ گئی۔

''ماشود آیا؟'' وہ بڑی بے تکلفی سے میرے سرہانے کے قریب آئی اور لمحہ بھر کے بعد اس کی نظر تپائی پر پڑی جس پر میں نے بازار سے فریدا ہوا ٹوتھ پیسٹ، صابون کی ایک ٹکیہ اور بلیڈ کا ایک پیکٹ رکھا تھا۔ وہ ان چیزوں کو الٹنے پلٹنے لگی۔ اس نے اپنے ننھے ہاتھوں سے ٹوتھ پیسٹ کے ٹیوب کو کور سے نکالا۔ کچھ سوچ کر اس نے اسے تپائی پر رکھ دیا اور بلیڈ کے پیکٹ کو کھولنے کی سعی کرنے لگی۔ وہ اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔

''تم اچھا چیزیں لاتا ہے، ماشود کے لئے لاتا ہے نا، ہمالا پاپا بی لاتا ہے۔ ممی

بہت اچھا ہے۔ ہمارے کو مارتا نہیں۔ پاپا مارتا ہے۔ تم ماشود کوئی مارتا۔ ماشود ہمالا ہے۔

نملی ...... نملی ......'' اتنے میں باہر سیڑھی سے نملی کی آیا کی آواز آئی۔ وہ دروازے پر آکر رُک گئی۔ آٹھ نو سال کی لڑکی، سیاہ فام، سیاہ چشم، ڈھیلے ڈھالے فراک میں ملبوس۔

آؤ نملی پاپا بلاتے ہیں......'' آیا کی برچھی کی طرح تیز آواز سنتے ہی نملی کچھ کہے بغیر اس کے پیچھے ہوئی۔

میں نملی کے پاپا کے بارے میں سوچنے لگا۔ مسٹر رمیش ان سے ہماری صرف ایک یا دو بار ملاقات ہوئی تھی، وہ ریلوے میں ملازم تھے اور زیادہ تر عدیم الفرصت ہی رہتے تھے۔ لمبے تڑنگے انسان، بند گلو کا شارٹ کوٹ پہنے، لمبی سی متحرک گردن، جس پر چھوٹا سا گول چہرہ یوں دکھائی دیتا جیسے اس پر چپکا دیا گیا ہو۔ ان کی گول آنکھیں ان کے موٹے عینک میں ہمیشہ چھپی رہتیں۔ میرا مشاہدہ تھا کہ وہ ہم سے زیادہ ملنے جلنے کے روادار نہ تھے۔ ہم سے ملنے کے لئے انھیں کئی دیواروں کو پھاندنا تھا۔ مذہب، رنگ، زبان اور اجنبیت کی دیواریں اور ایسا کرنے کے لئے شاید ان کے پاس ٹائم نہیں تھا۔ مسز رمیش البتہ کبھی کبھی ہمارے پاس آتیں۔ وہ نپی تلی باتیں کرتیں۔ مدھم مدھم خوابناک لہجے میں، ان کا سانولا رنگ نیلے یا سفید رنگ کی ساڑھی میں نکھر اٹھتا۔ سانولے رنگ کی خوبرو عورت......

صبح کو میں ابھی بستر ہی میں تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں فوراً پہچان گیا۔ یہ نملی ہے۔

''کھولو درواجا، ماشود، میں نملی ہوں......'' وہ زور زور سے کہہ رہی تھی میں چپ چاپ لیٹا رہا۔ مجھے اکتاہٹ سی ہوئی۔ یہ بچے بعض اوقات مصیبت بن جاتے ہیں۔

نملی دروازہ بجاتی رہی۔

میں چپ سادھے لیٹا رہا۔

''نملی......'' دفعتاً مسز رمیش کی آواز میرے کانوں تک آئی۔ وہ اوپر ہی آرہی تھیں۔

میں نے جھٹ رضائی پرے پھینک دی اور پاؤں میں چپل پہن کر دروازے کی

طرف لپکا اور فوراً اچٹخنی کھولی۔

نملی دوڑ کر اندر آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں امرود تھا۔

"یہ ماشود کے لئے ہے۔ بٹی لایا ہے۔ ماشود کہاں ہے؟" وہ پاگل کی طرح کمرے میں دیکھتی رہی اور باہر مسز رمیش کی آواز نزدیک آ رہی تھی۔

"نملی، دیکھو ماشود یہاں نہیں ہے......" میں اس کے سامنے کھڑے ہو گیا۔

وہ مجھے کریدتی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"تمہاری ممی بلاتی ہے نملی۔ دیکھو وہ آ رہی ہے......"

"نی، وہ باجار گیا ہے"

مسز رمیش دروازے پر آ کر رُک گئیں۔ انہوں نے نملی کو ڈانٹا،

"نملی، چلو پاپا بلاتے ہیں۔ فوراً اُسے وہاں میری موجودگی کا احساس ہوا اور اس نے مسکرا کر آداب کہا۔ اسکی مسکراہٹ بناوٹی تھی۔ نملی اس کے ساتھ گئی اور میں نے اطمینان کی سانس لی۔

نملی تیسرے دن بھی صبح سویرے آئی۔

وہ چوتھے دن بھی آئی۔

اور برابر آٹھ دن تک آتی رہی۔

اس کے بعد وہ نہیں آئی۔ میں آفیشل ورک میں جٹا رہا۔ دن رات تیزی سے گزرتے رہے اور دیکھتے دیکھتے پچیس دن بیت گئے ایک رات خاصی گرمی پڑ رہی تھی۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی اور میں غیر ارادی طور پر نملی اور مسعود کے بارے میں سوچتا رہا۔ نملی صبح سویرے دروازہ کھٹکھٹاتی ہے اور زور زور سے پکارتی ہے۔

ماشود کھولو درواجا، میں نملی ہوں" اور پھر وہ اندر آ جاتی ہے اور مسعود پلکوں پر نیند کا اڑتا ہوا غبار لے کر اس کی پیشوائی کے لئے آگے بڑھتا ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے کو گلے لگاتے ہیں۔

"آہا ماشود"

''نملی، نملی''

اور دونوں ننھے ننھے ہاتھوں سے تالیاں بجاتے ہیں۔

مسعود اُسے بسکٹ کھلاتا ہے اور نملی کبھی کچے ٹماٹر یا کبھی امرود لے آتی ہے اور دونوں مزے سے کھاتے ہیں۔

......وہ دونوں مسعود کے پلنگ پر، جس پر مسعود کا بستر بچھا ہوا ہے بیٹھ جاتے ہیں اور نملی مسعود کو کہتی ہے۔''ماشود، ہمالا ممی ٹرے سیکل لائے گا۔ ہم تم کو دے گا ماشود......'' یہ کہہ کر وہ زور سے ہنستی ہے اور مسعود کہتا ہے۔''ہمارے گھر میں، ادھر، ٹرے سیکل ہے۔ وہ میں چلاتا ہوں وہ میرا ٹرے سیکل ہے سب کو اٹھاتا ہوں......ٹی ٹی......ٹی ٹی......'' وہ جیسے سچ مچ ٹرے سیکل چلانے لگتا ہے۔

''ہم کو نی بٹھاتا ماشود؟'' اور نملی خوش ہو کر تالی بجاتی ہے۔

وہ دونوں ہنس پڑتے ہیں اور شور مچاتے ہیں۔

اتنے میں نملی کی نظر مسعود کی چھوٹی سرخ رنگ کے شنیل کی رضائی پر پڑتی ہے۔

''یہ کس کا ہے ماشود؟''

مسعود ٹکر ٹکر اُسے دیکھتا ہے۔

''یہ ماشود کا نی ہے''

''کس کا ہے؟''

''یہ راج کمار ہے، تم راج کمار ہے ماشود، گورا گورا...... اور میں مہارانی ہوں......'' ''تم مہارانی''، مسعود خوش ہو کے کہتا ہے'' اور میں راج کمار'' دونوں قہقہے لگاتے ہیں اور میں بیوی کی طرف دیکھتا ہوں۔ ہم دونوں مسکرا کے رہ جاتے ہیں...... نملی مسعود سے روٹھی ہوئی ہے۔ مسعود کے ہاتھ میں دو ٹافیاں ہیں نملی ٹافی لینے سے انکار کرتی ہے۔ منہ سے کچھ نہیں کہتی۔ صرف سر ہلاتی ہے۔

انکار میں، مسعود روہانسا ہو گیا ہے۔ مجبور ہو کر اس نے مجھ سے رجوع کیا ہے

''ڈیڈی، نملی ٹافی نہیں کھاتی......''

''کیوں نہیں کھاتی، نملی لو نا ٹافی، مسعود نے تمہارے لئے رکھی ہے''

''ہم نی لے گا۔'' وہ مسعود کی طرف پیٹھ کر کے بولتی ہے۔

''کیوں؟'' میری دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔

''ماشود گیتا سے کھیلتا ہے''

مسعود تعجب سے کبھی نملی کو دیکھتا ہے اور کبھی مجھ کو، ''کھیلتا تو ہے''

''ہم نے گیتا کو گھر سے نکال دیا......''

''کیوں؟''

اس نے ہمالا گڑیا چھوری کیا......

ہاں وہ چھور ہے......

''چور...... گیتا چور ہے۔'' مسعود پکار اٹھتا ہے اور نملی اس کے ہاتھ سے ٹافی چھین کر منہ میں رکھ لیتی ہے۔

......اتوار کو مسعود نملی کے گھر سے بھاگ آتا ہے اور سیدھے میری گود میں آ بیٹھتا ہے۔ اس کا چہرہ اتر ہوا ہے۔

''کیوں بیٹے کیا بات ہے؟''

''ڈیڈی، میں مسعود ہوں نا؟''

''ہاں تو اس میں کیا شک ہے؟''

''لیکن نملی کا پاپا ہے نا؟''

''ہاں ہے تو......''

''وہ کہتا ہے۔ تم مسلمان ہو۔ مسلمان کیا ہوتا ہے؟

اچھا تو تم نے کیا کہا؟

میں نے کہا میں تو مسعود ہوں۔

''تم نے ٹھیک کہا بیٹے۔''

''وہ نملی کو میرے ساتھ کھیلنے نہیں دیتے''۔ وہ روہانسا ہو گیا۔

سوموار کو میری بیوی اور مسعود آ رہے تھے مجھے آج ہی ان کا خط ملا تھا۔ بیوی نے لکھا تھا کہ مسعود کی صحت پہلے سے بہت بہتر ہے۔ اُسے بھوک بھی لگتی ہے۔ نملی کو وہ اب بھول چکا تھا۔ گھر پہنچنے سے پہلے دو تین دنوں تک وہ نملی کو بہت یاد کرتا رہا۔ صبح شام نملی کا ذکر، اُسے گیتا بھی یاد آتی رہی۔ لیکن اب وہ دلی کے سب دوستوں کو بھول چکا تھا...... ادھر نملی بھی اب اسے بھول چکی تھی۔ وہ بھول کر بھی اب ہمارے فلیٹ میں نہ آتی اور نہ ہی اس دوران میں نے مسز رمیش کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ بٹ بھی غائب تھی۔ یہ لوگ کہاں تھے مجھے معلوم نہ تھا۔

میں رات کا کھانا کھا رہا تھا۔ مقبول نے سبزی پکائی تھی وہ میرے سامنے ہی کھڑا تھا۔

''مقبول!''

''ہاں جی......''

''یہ نملی کہاں غائب ہو گئی۔ نظر ہی نہیں آتی۔''

''پتہ نہیں صاحب''

''مسز رمیش کہاں ہے؟''

''گھر میں ہے۔''

''لیکن......''

''اُن کے گھر میں ڈاکٹر آیا تھا......''

''کب؟''

''آج شام کو، کل بھی میں نے دیکھا تھا۔ ان کے کمرے سے ڈاکٹر نکل رہا''

''پتہ نہیں کون بیمار ہے؟ شاید مسز رمیش......''

''بٹ بھلی چنگی ہے''

''ہونہ ہو مسٹر رمیش نا ٹھیک ہوں گے''

''میرا بھی یہی خیال ہے''

''لیکن انہوں نے ہم سے کہا تک نہیں۔''

''یہ نہیں کہتے، مسٹر رمیش نے منع کیا ہے، بٹی کہتی ہے۔ پاپا بہت ڈانٹتے ہیں سبھوں کو، نملی کو زور سے پیٹا ہمارے یہاں آنے پر......''

''عجیب آدمی ہیں وہ تو......''

''مسز رمیش بھی اسی لئے ہمارے پاس نہیں آتی۔ ڈرتی ہے بیچاری......''

''اچھا تو یہ بات ہے، خیر چھوڑو۔ وہ نہیں آتے ہیں تو نہ سہی۔''

میں نے ٹھنڈے پانی کا گلاس خالی کیا اور سنک میں ہاتھ صاف کرنے کے لئے کھڑا ہوا۔ مقبول نے آج میرے کمرے کی خوب صفائی کی تھی۔ چیزوں کو ٹھیک سے رکھا تھا۔ میں سات بجے کے قریب آیا تھا اور کمرے کی صفائی اور سجاوٹ دیکھ کر خوش ہوا۔ کوٹ میں نے ہینگر پر ٹانگ دیا اور آج کا اخبار دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔

میں نے جھٹ سے دروازہ کھولا۔

سامنے مسز رمیشن تھی۔ میلی سی ساڑی میں ملبوس، بال اُلجھے اُلجھے سے، اترے ہوئے چہرے پر رات کی تاریکی اور آنکھوں میں لرزتے آنسو......

''آپ؟ خیریت تو ہے؟

''نملی بیمار ہے......''

''نملی بیمار ہے۔؟ کب بیمار ہوئی......''

''وہ دس بارہ دن سے بیمار ہے، اور آج......وہ......''

''لیکن آپ رو کیوں رہی ہیں۔؟''

''وہ بے ہوش ہوگئی......''

''بے ہوش ہوگئی؟......'' ڈاکٹر کو نہیں بلایا؟''

''گھر میں کوئی نہیں؟''

میں مسز رمیش کے ساتھ نیچے ان کے کمرے میں دوڑتا ہوا گیا۔ نملی پلنگ پر پڑی تھی۔ آنکھیں بند کئے ہوئے۔ وہ گلے تک ایک سفید چادر میں ڈھکی ہوئی تھی۔ ،اُف......، یہ نملی کی کیا حالت ہوگئی تھی اس کی آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ دائرے تھے، بجلی کی مدھم روشنی میں اس کا چہرہ بے حد پیلا دکھائی دے رہا تھا۔

''نملی ...... نملی دیکھو بیٹا نملی ......'' وہ اب بھی بے ہوش پڑی تھی۔ میں نے اس کی نبض دیکھی نبض تیز چل رہی تھی۔

''اچھا میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں......''

ڈاکٹر نے دوا تجویز کی اور فوری طور پر نملی کو ایک انجکشن لگوایا اور تب کہیں اس نے پلکیں کھولیں مجھے اپنے سرہانے دیکھ کر اس نے میری طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھا اور برابر پلکیں جھپکاتی رہی۔

''نملی نملی ، دیکھو بیٹا......'' میں اسے پیار سے کہتا رہا۔

نملی نے آنکھیں کھولیں۔ تو مسز رمیش اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہہ نکلی اور اس نے نملی کے تپتے ماتھے کو چوما۔

اور نملی کے پیڑی جمے سیاہ ہونٹوں پر ہلکی سی لرزش پیدا ہوئی۔ وہ ہڈیوں کا ایک مختصر سا ڈھانچہ بن کر رہ گئی تھی۔

معاً اس کی بے جان سے آنکھوں میں ہلکی سی چمک آئی

''ما......شو......دا آگیا؟''

''ہاں بیٹی مسعود آگیا ہے۔'' میں نے اسے پچکارتے ہوئے کہا۔

مجھے دیکھ کر اسے فوراً مسعود کی یاد آگئی تھی۔

جلد ہی اس کی پلکیں جھپکنے لگیں۔ انجکشن اور دوا نے اپنی تاثیر دکھائی ڈاکٹر کہہ گیا تھا کہ نملی ہوش میں آتے ہی سو جائے گی۔

''بھابی کب آرہی ہیں؟'' مسز رمیش کے لہجے میں بیچارگی تھی۔

''کل آرہی ہیں''

''اچھا؟ ماشود بھی آرہا ہے نا؟''

''ہاں ہاں۔ اُسے پھر ڈاکٹری معائنہ کرانا ہے۔''

نملی ماشود کو بہت یاد کرتی ہے......''، ماشود نام اس کی زبان سے اترتا ہی نہیں...... ہم نے کہا وہ گھر گیا ہے۔ تو بہت روتی رہی۔ کھانا پینا چھوڑ دیا۔ پاپا نے بہت ڈانٹا۔ لیکن یہ روتی رہی اور چند دنوں سے رات کا کھانا نہیں کھایا۔ صرف ماشود کہتی رہی۔ پاپا نے تھپڑ مارا اور رات کو بخار آیا اور پھر اس رات سے بخار اترتا ہی نہیں...... ۱۰۲ ڈگری فیور رہتا ہے''

''اچھا تو یہ بات ہے؟'' مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے میرے پاؤں تلے سے زمین نکل رہی ہے اور سارا کمرہ گھوم رہا ہے۔

دوسرے دن میں دس بجے سٹیشن سے بیوی اور مسعود کو لے کر آیا کمرے میں سامان وغیرہ رکھوا کر میں مسعود کا ہاتھ پکڑ کر اسے سیدھے نملی کے پاس لے گیا۔ بیوی کمرے میں سامان وغیرہ درست کرنے لگی۔

نملی کے سرہانے مسز رمیش بیٹھی تھی۔ ہاتھ میں دوا کا چمچہ لئے ہوئے نملی پینے سے انکار کر رہی تھی۔

نملی...... نملی دیکھو مسعود آ گیا ہے......'' میں اس کے سرہانے بولا

نملی نے میری طرف دیکھا اور پھر مسعود کو دیکھا۔ معاً اس کے سیاہی مائل زرد چہرے پر ایک خفیف چمک سی آئی۔ جیسے راکھ کے ڈھیر میں چند چنگاریاں سلگ اٹھی ہوں۔''

..........☆☆☆..........
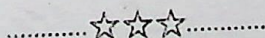
نور شاہ

نام :نور شاہ

تاریخِ پیدائش :۹ر جولائی ۱۹۳۶ء: درگجن ڈلگیٹ، سرینگر

تصانیف :افسانے ۸ مجموعے......ناول ۳......ناولٹ ۲

افسانوی مجموعے :بے گھاٹ کی ناؤ، ویرانے کے پھول، من کا آنگن اُداس اُداس، ایک رات کی ملکہ، گیلے پتھروں کی مہک، بے ثمر سچ، آسمان پھول اور لہو، کشمیر کہانی

ناول، ناولٹ :پائل کے زخم، نیلی جھیل کالے سائے، آؤ سو جائیں، آدھی رات کا سورج، لمحے اور زنجیریں

دیگر تصانیف :انتخابِ اُردو ادب ریاست جموں وکشمیر، بند کمرے کی کھڑکی، کہاں گئے یہ لوگ، جموں کشمیر کے اُردو افسانہ نگار

اعزازات :بیسٹ بک ایوارڈ (جموں وکشمیر)، ہرموکھ ایوارڈ، اُردو اکیڈیمی ایوارڈ (جموں وکشمیر)

پتہ :لل دید کالونی، گوری پورہ، راول پورہ سرینگر

فون نمبر :9906771363

❖

☆......نور شاہ

رشتے ناطے

جب رات کی خاموشیاں جاگ اٹھتی ہیں اور آنگن میں کھلے پھول مستی میں جھومتے خوابوں کی وادیوں میں کھو جاتے ہیں تو میں گھر لوٹتا ہوں، اپنے کمرے کا دروازہ کھولنے پر میری نظریں بے ساختہ گلی والی کھڑکی سے جاٹکراتی ہیں اور میں اس کے پٹ ایسے کھول دیتا ہوں جیسے رات کی حسینہ اپنی گہری سیاہ زلفوں کی مانگ میں یادوں بھری کہانیوں کی کہکشاں سنوار رہی ہو......!

یادوں بھری کہانیاں!

یوں تو میرے کمرے میں تین کھڑکیاں ہیں لیکن کو کھڑکی گلی کی طرف کھلتی ہے مجھے بہت پسند ہے، یہ کھڑکی میری ہم راز ہے اوراس پر لٹکے فاختائی رنگ کے پردے کی سرسراہٹ میں میرے دل کی دھڑکنوں کی دھیمی دھیمی سی آواز بھی شامل ہے لیکن آج میں یہ کھڑکی کی کھولنا نہیں چاہتا، میں تاروں بھری اس رات کی تاریکی میں اپنے دل کی دھڑکنوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سُلانا چاہتا ہوں تاکہ سامنے والی کھڑکی سے ابھرنے والی یہ نیم سریلی آوازیں اُن یادوں بھری کہانیوں کو میرے سامنے نہ دھرائیں جنہیں میں بھول جانا چاہتا ہوں۔

میں اپنا سیمیں بدن دودھ میں نہلاؤں گی
مجھے تیری محبت یاد آنے لگی
میں صندل کا پانی اپنے پر چھڑکوں گی

اے محبوب آ
میں اپنا سر تجھ پر قربان کروں......!
میں کبھی اِن گیتوں پر جان دیتا تھا۔ اب اُنہیں سننا نہیں چاہتا۔ اب مجھے اِن نیم سریلی آوازوں سے بھی نفرت ہوگئی ہے۔
''کھول دے یہ پٹ''
''نہیں نہیں آج مجھے ٹھنڈی تازہ ہوا کی ضرورت نہیں، آج میں اپنے بند کمرے میں گھٹ گھٹ کر رونا چاہتا ہوں، میں اپنی اُن ساری کہانیوں کو اپنے کمرے کی گھٹن میں دفن کرنا چاہتا ہوں تاکہ صبح کوئی نئی کہانی نہ جاگے، کسی نئی کہانی کا جنم نہ ہو میں نئی صبح کو دلہن کو اندھیاروں میں بیدار ہوتے نہیں دیکھ سکتا......!

اے میری ہم راز کھڑکی اس لڑکی پر رحم کر جس کی زندگی کی ساری تمنائیں لڑکپن کی ساری اُمنگیں اُن نیم سریلی آوازوں میں مچل رہی ہیں لیکن جو خود نہیں جانتی کہ اُسے کون پالکی میں بٹھا کر دور اجنبی وادیوں میں لے جا رہا ہے۔

کھول دے کھڑکی اور دیکھ اس پار والے مکان میں شادی کے کتنے ہنگامے ہیں، وہ دلہن بنی بیٹھی ہے، سرخ سرخ لبادے میں لپٹی چھوئی موئی سی دلہن اپنی آنکھوں میں انجانے محبوب کا تصور لئے اپنے دولہے کی منتظر، خوابوں کے شہزادے کے انتظار میں دودھ سے نہایا سیمیں بدن سرخ پھولوں اور گجروں سے سنوارا ہوا سراپا انتظار، شب عروسی کے سرخ جوڑے کے دامن میں جوہی اور ریحان کے کھلے ہوئے پھولوں کو پھیلائے ہوئے تصورِ جاناں کئے......!!

لیکن یہ سب ایک خواب ہے، ایک سپنا جو کبھی حقیقت کا روپ نہیں اپنا لیتا، کھڑکی پر لٹکے ہوئے فاختائی رنگ کے پردے میں ہلکی سی جنبش ہوتی اور مجھے محسوس ہوا جیسے میری ساری عمر کسی ان دیکھے خوابوں کے جزیرے میں ایک اجنبی سا خواب دیکھتے بیت چکی ہے!
ایک اجنبی سا خواب!!

''میں تمہارے خواب کی تعبیر ہوں، پھولوں کی خوشبو ہوں سنگیت کی لے ہوں''

میں آواز کی مٹھاس میں کھو گیا، میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنے دل کے بجھے بجھے سے چراغ کی ٹمٹماتی لَو کو بچانے کے لئے اپنا ہی خونِ دل جلانے لگا اور وہ لمحہ جب میں انے اپنے خوابوں کو صنوبر کا روپ اپناتے دیکھا گزر چکا ہے، خواب صرف خواب ہیں اور صنوبر ایک حقیقت، خواب جو کبھی حقیقت نہیں بنتے صرف ایک لمحہ آتا ہے اور گزر جاتا ہے اور اس لمحے کو یادیں ساری عمر کا روگ بن جاتی ہیں، میں بھی ایک روگی ہوں اور سامنے وہ چھوئی موئی سی دلہن بھی ایک روگی ہے۔

میں نے سوچا...... اس کا اپنا شیراز کنوارے خوابوں کا شہزادہ بن کر آئے گا اور اس کے بہار بھرے چمن میں پھولوں کی خوشبوئیں سونگھے گا، اس کے چاندنی سے بدن سے کھیلے گا، اس کے دودھ میں نہائے بدن کا لمس اُسے کندن بنادے گا، لاج اور شرم سے جھکا ہوا سر اوپر اٹھائے گا اور پھر......!

ہر لڑکی اپنے محبوب کے بارے میں ایسا ہی سوچتی ہوگی۔ ''نہیں نہیں''۔ ہر لڑکی اپنے محبوب کے بارے میں ایسا سوچتی تو کیا...... تو صنوبر نے میرے بارے میں ایسا کیوں نہ سوچا؟ اُس شام میں جھیل کے کنارے ایک انجان سی جگہ پر وائلن بجا رہا تھا میں حد اُداس تھا اور ایک دُھن کی تلاش میں تھا جس میں اپنی ساری اُداسیوں کو سمو سکوں۔ اچانک وائلن کے تار ٹوٹ گئے اور اُس کے ساتھ ہی کسی کے قدموں کی چاپ جاگی!

''آپ وائلن بہت اچھا بجاتے ہیں'' میں نے اپنی پلکیں اٹھا کر دیکھا، صندلی رنگ کا مرمریں جسم لئے ایک لڑکی کھڑی تھی اور اسے دیکھ کر محسوس ہوا جیسے میں ایک روح ہوں جو ازل سے ہی ایک ایسی ہی لڑکی کی تلاش میں اُداس ہو گئی ہو۔ وہ واپس مڑ گئی، ایک ہری بھری پشت پر نیچے جاتے جاتے سفید رنگ کا ریشمی فراک بے حد چُست ہو گیا تھا اور اس پر بھورے بالوں کے دو لمبے لمبے لَٹ لہرا رہے تھے، مجھے اپنا سارا وجود بالوں کی گھٹاؤں میں گھرا محسوس ہوا...... میں انے اپنی پلکیں جھکا لیں۔

وہ اپنی سفید رنگ کی ماروتی کار میں بیٹھ کر چلی گئی لیکن درمیان میں ایک ایسی لکیر اُبھر آئی کہ میں رات گئے تک سوچتا رہا کہ کیا یہ لکیر کبھی مٹے گی۔

گھر آیا اور وائلن کے تار ٹھیک کرنے لگا، مجھے وقت کا کوئی احساس نہ رہا، ذہن میں ایک ہی جملہ بار بار گونج رہا تھا ''آپ وائلن بہت اچھا بجاتے ہیں''

میں نے کھڑکی کھول دی اور گلی میں جو دو سائے نظر آئے اُنہیں پہچاننے میں دیر نہ لگی۔ ایک سایہ شیراز کا تھا اور دوسرا سایہ سلمیٰ کا۔ پھر دیکھتے دیکھتے ایک تیسرا سایہ نمودار ہوا، اس نے سلمیٰ کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور اسے گھسیٹ کرلے گیا جیسے سلمیٰ لڑکی نہ ہو، چاول کی بوری ہو، یہ تیسرا سایہ جو ابھی ابھی نمودار ہوا تھا احمد دین کا تھا، احمد دین جو سلمیٰ کا باپ ہے......!

''میرے پھولوں کے متوالے ساجن آجا......''

''میں نے اِس لڑکی کو کئی بار دیکھا ہے'' میرے ایک دوست نے کہا تھا ''ہاں ہاں بقول تمہارے صندلی رنگ کی مرمریں جسم والی لڑکی، جانتے ہو کس کی بیٹی ہے، کہاں رہتی ہے، کہاں آتی جاتی ہے''؟

''جانتا تو کیوں پوچھتا''

''اس کا نام صنوبر ہے، وہ اے آر خان کی بیٹی ہے اور جھیل ہی کے کنارے سرکاری کوٹھی میں رہتی ہے''

''اے آر خاں، وہ آئی اے ایس جو......''

''جی ہاں''

دیکھتے دیکھتے وہ تیسرا سایہ بھی غائب ہو گیا، اس رات میں نے ایک بار پھر سپنا دیکھا، بس وہی سپنا...... میں جھیل کے کنارے وائلن بجا رہا ہوں اور صنوبر مست ہرنی کی طرح وائلن کی دُھنوں پر تھرک رہی ہے!

''بابر'' میرا سپنا ٹوٹ گیا، بھابھی کی آواز تھی۔

''جی بھابھی''

''تمھارے بھائی کہہ رہے تھے کہ احمد دین نے کل رات سلمیٰ کو اس قدر پیٹا ہے کہ اُس کے سارے جسم پر داغ پڑ گئے ہیں، احمد دین کی عزت مٹی میں مل گئی......''

''بھابھی!'' میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''بھابھی یہ سب جھوٹ ہے، وہ ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں، پیار کرنا جرم نہیں، بھابھی میں آپ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اُن کی محبت پاک ہے''۔

تم کیسے جانتے ہو''

''میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، کئی بار دیکھا ہے، اُن کی باتیں سُنی ہیں، آپ بھیا کو کہہ دیجیے کہ وہ احمد دین سے سلمیٰ اور شیراز کی شادی کی بات کریں''

کیسی عجیب بات ہے، کیسی عجیب دنیا ہے، کیسے عجیب لوگ ہیں، یہاں گلیوں میں ملنے والے دو پریوں کا مقدس اور پاکیزہ پیار رسوا ہو جاتا ہے اور وہاں فرش مرمر پر ملنے والوں کے گناہ اور ثواب کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں......!

''ویٹر''

''سر''

''ایک بلیک اینڈ وہائٹ''

''ایک بئیر''

''دو کپ کافی''

میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں اچانک زندگی کے آثار ایک ساتھ جاگ پڑے، آرکسٹرا پر کوئی سریلی دُھن چھڑ گئی تھی اور فرشِ مرمر پر جوان جسم ناچ رہے تھے......

دروازے سے ابھی ابھی داخل ہونے والی صنوبر گوشے والی میز پر ایسے بیٹھی تھی جیسے سنگِ مرمر کے حوض میں گل دوپہر کا پھول ہو...... بے داغ پھول!!

یہاں کی دنیا جاگ رہی ہے اور باہر کی دنیا سو رہی ہے۔

ایک یہ ہے جو سنگ مرمر کے محل میں موتیوں کی مالا پرو رہی ہے، ایک وہ ہے جو

آنسوؤں کی مالا پرو رہی ہوگی......

صنوبر!

سلمیٰ!

''صاحب! وہ میم صاب آپ کو یاد کرتی ہیں''

''مجھے'' میں نے بے ساختہ صنوبر کی طرف دیکھا، وہ مسکرا رہی تھی۔

اُس نے ایک بار پھر وائلن بجانے کی بات چھیڑ دی...... ''وائلن آپ واقعی بہت اچھا بجاتے ہیں''۔

''کوشش کرتا ہوں''

''جی نہیں میں تو اس شام بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گئی''

''شکر ہے کہ وائلن کے تار ٹوٹ گئے تھے، ورنہ آپ شاید واقعی......''

وہ مسکرا دی اور میں نے جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

کافی پینے کے بعد وہ چلنے لگی...... ''آپ ابھی ٹھہریں گے؟''

''جی نہیں، میں بھی جانا چاہتا ہوں'' ہم باہر آ گئے، سفید ماروتی اس کی منتظر تھی۔

''آپ کو کہاں جانا ہے''

''جھیل کے کنارے......''

''تو آیئے وہاں تک میں آپ کا ساتھ دوں گی''

''اور اُس کے بعد......'' بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا، وہ مسکرا دی اور پھر میری طرف ایسے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو...... ''تیرا میرا تو جنم جنم کا ساتھ ہے، میں تو ازل ازل سے تمہارے تلاش میں بھٹک رہی ہوں، میں تمہارے سنگیت کی لے ہوں، ساز کی آواز ہوں، تمہارے وائلن پر اُبھرنے والی دُھن ہوں، نغمہ ہوں......!''

اور میں اطمینان کا سانس لیا!

''بھیا اُس کا من ہوتا، دل اور دل کی دھڑکنیں ہوتیں تو وہ اپنی بیٹی کا سودا نہ کرتا''

''سودا یہ تم کیا کہہ رہے ہو بابر!''

''بھیا میں ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں، من نام ہے ضمیر کا، محبت کا، شرافت کا اور احمد دین کے پاس ان میں سے کوئی شئے نہیں، وہ بھوکا ہے''۔

''وہ بھوکا ہے''

''وہ پیٹ کا بھوکا ہے اور یہ بھوک سلمیٰ کی شادی کرنے سے مٹ سکتی ہے، ورنہ وہ جانتا ہے کہ سلمیٰ شبنم کے قطروں کی طرح پاک ہے اور شیراز اسے دل کی گہرائیوں سے پیار کرتا ہے لیکن شیراز غریب ہے اور احمد دین کو روپیوں کی ضرورت ہے''۔

''بابر''

''ہاں بھیا! دراصل اس کا بھی کوئی قصور نہیں، ہم سب کو اچھے مکان، اچھے کپڑوں اور اچھی خوراک کی ضرورت ہے، ہم اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے دوسرے کو قربانی کا بکرا بناتے ہیں''

''کل ہمارے ہاں نئے سال کی پارٹی ہے، آپ بھی آیئے گا اور......''

''اور کیا......''

''اپنا وائلن بھی ساتھ لایئے گا، میں آپ کا انتظار کروں گی، آئیں گے نا آپ......''

سنگِ مرمر کا ہوٹل ہو یا گلابی رنگ ڈرائینگ روم، ایک جیسی دنیا ہے،، ایک جیسا ماحول ہے، ایک جیسی باتیں ہیں، ایک جیسے لوگ ہیں، وہاں بھی شراب کے جام میں دنیا بستی ہے اور یہاں بھی......بس فرق اتنا ہے کہ وہاں لوگ نقلی چہرے لگا کر آتے ہیں اور کلچر کی باتیں کرتے ہیں یہاں نقلی چہرے اتر جاتے ہیں اور اصلی چہرہ وجود میں آجاتا ہے، بہکے بہکے لوگ، بہکی بہکی باتیں، بہکی بہکی بیویاں اور ایسی ہی دنیا میں صنوبر تھی، اس کی آنکھوں میں عجیب سی مستی تھی، عجیب سی بے قراری تھی......!

ٹک، ٹِک، ٹِک،!

Happy new Year to You

نیا سال مبارک ہو...... ملی جلی آوازیں ایک ساتھ فضا میں گونجیں اور اس کے ساتھ یہ ساری روشنیاں بجھ گئیں، صرف سانسوں کی آوازیں سنائی دیں، میں نے اسی تاریکی میں سانسوں کے اسی مدو جزر میں اپنا وائلن اٹھایا اور دھن چھیڑ دی!

جب جواں دل دھڑکتے ہیں

تارے لرزتے ہیں

رات مُرجھا جاتی ہے

محبت کا دیوتا ہنستا ہے

اور فرشتے بھی محبت کر سکتے!

دفعتاً بجلی کے قمقموں میں روشنی لوٹ آئی اور میں نے صنوبر کو ایک نوجوان کی آغوش میں دیکھا، میرے وائلن کے تار ٹوٹ گئے، میرا ہاتھ بری طرح زخمی ہوا، میری انگلیوں سے خون بہنے لگا، کچھ دن بعد میرا ہاتھ بالکل ٹھیک ہو گیا مگر ڈاکٹر نے کہا کہ اب یہ انگلیاں کبھی وائلن کے تاروں کو نہ چھیڑ سکیں گی، وہ نغمہ ڈوب چکا جو دلوں کو ملاتا ہے......!!

آخر یہ دل بھلا کس شئے کا نام ہے!

دل اور محبت کا کیا رشتہ ہے آپس میں!!

یہ ابھی ابھی میرے گھر آنے سے پہلے کی بات ہے، صنوبر کے ہاں پارٹی تھی، اس کے باپ اے۔آر۔خان نے مسکراتے ہوئے کہا...... ”آج کی یہ پارٹی صنوبر اور لیاقت کی شادی کی ابتداء ہے، اب میں ریٹائر ہو رہا ہوں، لیاقت کو آپ جانتے ہیں، خواجہ عبدالصمد کے اکلوتے بیٹے ہیں، اُن کا لاکھوں کا کاروبار ہے، مجھے اس ملاپ پر مسرت ہو رہی ہے......“

”آپ کا وائلن کہاں ہے......“

”میرے وائلن کے تار ٹوٹ چکے ہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے“

”وہ وائلن مجھے دیجیئے نا“

”آپ کو دے دوں تو میرے پاس کیا رہے گا“

"عجیب فلسفہ ہے..... "لیاقت نے کہا۔

"آؤ ڈارلنگ ہم مل کر اپنے دل کے وائلن پر ایک نئے نغمے کی تخلیق کریں گے"۔

"نہیں لیاقت مجھے وائلن چاہیئے"

"بس وائلن کی ہی بات ہے، کل ایک درجن لے آؤں گا"

"مجھے صرف بابر کا وائلن چاہیئے"

"اس کے تو تار بھی ٹوٹ چکے ہیں" میں نے کہا۔

"ٹوٹنے دیجیئے مجھے ہر قیمت پر بس بابر کا ہی وائلن چاہیئے"

"تو لے لو نا اس کی قیمت دے دیں گے"

"لیاقت صاحب! آپ زندگی میں ہر شئے پیسوں سے خریدنے کے عادی ہیں، اس سے بڑھ کر بھی کوئی چیز ہوتی ہے"۔

"کوئی چیز، میں تمہارا وائلن خریدنا چاہتا ہوں، کتنی قیمت چاہیئے، ہزار، دس ہزار، پچاس ہزار......"

اور وہ صنوبر کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر چلا گیا!

"میرے پھولوں کے متوالے ساجن آجا......"

تصدیق کی جاتی ہے کہ شوکت احمد جس کی شادی سلمٰی دختر احمد دین سے طے ہوتی ہے نکاح خوانی سے پہلے احمد دین کو تیس ہزار روپئے نقد ادا کرے گا اور دو سال تک ہر ماہ تین سو روپئے ادا کرتا رہے گا......!

یہ تحریر مجھ سے سنی نہیں جاتی

"شوکت احمد آپ کو منظور ہے"

"منظور ہے"

اور سلمٰی بی بی

کوئی آواز نہیں اور اس خاموشی کے ساتھ ایک ہنگامہ بپا ہوا، احمد دین غصے سے

پاگل ہورہا تھا۔

''یہ شادی ہوگی ،لڑکی ہاں کرے یانا......'' احمد دین چلاّ اٹھا۔

''ٹھہرو......'' میں چلا اُٹھا، ایک لمحے کے لئے ہر طرف سکوت چھا گیا، سلمٰی کی شادی شوکت سے نہیں، بلکہ شیراز سے ہوگی ،صرف شیراز سے اور احمد دین تم کو تمہاری رقم مل جائی گی میں شیراز کی طرف سے تمہیں یہ رقم دینے کے لئے تیار ہوں......''

''تمہارے پاس یہ رقم کہاں سے آئی گی بابر! تیس ہزار روپئے بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔ تمہیں احساس ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو''؟

''بھائی میں جانتا ہوں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں''

''اور یہ رقم''

''میں اپنا وائلن کسی کو دے کر یہ رقم حاصل کروں گا، مجھے صرف آج رات کی مہلت چاہیے''۔

میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھول دی ہے۔ احمد دین کے مکان میں اب کوئی ہنگامہ نہیں، کوئی شور نہیں، صرف دو نیلی آنکھیں گلی میں جھانکتی نظر آرہی ہیں، یہ سلمٰی کی آنکھیں ہیں جنہیں شیراز کا انتظار ہے......!!

میرے پھولوں کے متوالے ساجن آجا......!!!۔

............☆☆☆............

عبدالغنی شیخ

نام :عبدالغنی شیخ

تاریخِ پیدائش :۵/مارچ ۱۹۳۶،قصبہ لیہہ لداخ

تعلیم :ایم۔اے ہسٹری

تصانیف ناول ۲......افسانہ ۳ مجموعے......دیگر کتابیں ۶

افسانوی مجموعے :(۱)زوجیلہ کے آر پار

(۲)دوراہا

The Forsaking Paradise(اردو افسانوں کا انگریزی ترجمہ)

ناول :(۱)وہ زمانہ،(۲)دل ہی تو ہے

اعزازات :کلچرل اکادمی ایوارڈ (۲ بار)، گاندھی جینتی ایوارڈ

پتہ :یاسمین گیسٹ ہاوس،لیہہ لداخ

فون نمبر 9419840050:

☆......عبدالغنی شیخ

جھنڈا والا

اخبار والا لڑکا صبح دو اخبار چھوڑ کر چلا گیا۔ سجاد اور سلطان نے ایک ایک اخبار اٹھایا اور اپنے پسندیدہ کالم دیکھنے لگے۔ مالکِ مکان کی بیٹی فلمی خبروں والا صفحہ نکال کر لے گئی۔

ہم چار اس مکان میں Paying Guest تھے۔ سجاد نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ اسد ایک پرائیوٹ دفتر میں کام کرتا تھا۔ سلطان جو محلے میں انکل باؤلر کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ہم چاروں دیہی علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔

چار ماہ پہلے جب میں یہاں آیا، تب محلے کی گلی میں سلطان چند بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیل رہا تھا۔ اس کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں یہاں ٹھہرنے کے لئے آیا ہوں تو گیند اور بلا چھوڑ کہ میرے پاس آیا اور سوالات کی بوچھاڑ کی۔ باپ کیا کام کرتا ہے؟ کتنی تنخواہ پاتا ہے؟ کس گاؤں سے آیا ہے؟ کب تک رہنا ہے؟ ماں گرہستن ہے یا ملازمہ؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس دوران چھ سات سالہ ایک بچہ اپنا بلا لے کر سلطان کے پاس آیا اور لجاجت سے بولا۔ ''انکل'' مجھے بال پھینکونا''۔ ''عبید!'' سلطان نے پکارا اور ایک لڑکا دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا۔ ''اس کو بال پھینکو''۔ سلطان نے حکم دیا اور بچے سے مخاطب ہو کر کہا۔ '' جاؤ عبید بال پھینکے گا''۔

میں نے آتے ہی اخبار والے لڑکے کو کہا کہ میرے لئے ٹائمز آف انڈیا اور ایک مقامی اخبار ڈالا کرے۔ اخبار بینی مجھے اپنے باپ سے ورثہ میں ملی ہے۔ اپنے امتحان کے سلسلے میں انہوں نے مجھے بلاناغہ اخبار پڑھنے کی ہدایت بھی دی تھی۔

ہمارے کمروں کے سامنے ایک چھوٹا سا آنگن تھا جہاں دو بوسیدہ بنچیں لگی تھیں ۔ صبح یہاں دھوپ پڑتی تھی ۔اس لئے ہم یہیں بیٹھا کرتے تھے۔

سجاد کھیل کود کے کالم پڑھتا تھا اور آٹھ دس منٹ میں ختم کرتا تھا۔ سلطان صرف اشتہارات پڑھتا تھا اور سات آٹھ منٹ سے زیادہ نہیں دیتا تھا۔ دو مرتبہ اس نے مجھے مطلوبہ معلومات فراہم کیں۔ مجھے باپ نے گھاس کاٹنے کی ایک مشین لانے کے لئے کہا تھا۔ مارکیٹ میں یہ مجھے نہیں ملی اور ایک روز باتوں باتوں میں سلطان سے اس کا ذکر کیا۔ سلطان نے مجھے اشتہار دکھاتے ہوئے کہا۔ ’’یہ لو...... گھاس کاٹنے کی مشین کا اشتہار۔ شاید آپ کے کام کا ہے‘‘۔

اسی برانڈ کی مشین مجھے درکار تھی ۔ ایڈ پر کمپنی کا نام اور فون نمبر دیا تھا۔ دوسری مرتبہ اس نے ایک مقبول سکول میں نرسری سطح کے بچوں کے داخلہ کے سلسلے میں انٹرویو کی تاریخ سے آگاہ کیا۔ مجھے اپنی بھانجی کا داخلہ کرانا تھا۔ میں دو مرتبہ اس سکول میں تاریخ پتہ کرنے گیا تھا اور...... کلرک نے اخبار دیکھنے کے لئے کہا تھا۔ میں نے سلطان کو اس ضمن میں خیال رکھنے کے لئے کہا تھا۔

مالکِ مکان کی بیٹی کو صرف فلمی خبروں اور فیچروں سے دلچسپی تھی ۔اس کے ذوق کو دیکھ کر میں کبھی کبھی سٹارڈسٹ یا فلم فیئر خرید کر لاتا تھا۔

ہمارے ایک اور ساتھی اسد کو اخبار پڑھنے کا شوق نہیں تھا۔ ہمیں اخبار پڑھتے دیکھ کر وہ اکثر کہتا تھا۔ ’’کوئی خاص خبر!‘‘ جواب سننے سے پہلے وہ اکثر اپنی راہ لیتا تھا۔

میں ہی اکیلا خبریں، ادرائیے اور اخبار میں چھپنے والے مضامین پڑھتا تھا۔

ہم میں زیادہ پڑھے لکھے مالکِ مکان تھے۔ وہ ہفتہ عشرہ کے بعد گھر آتے تھے اور ایک یا دو دن گزار کر چلے جاتے تھے۔ وہ ایک کالج میں استاد تھے۔

ایک روز انہوں نے مجھ سے اخبار لیا اور اس پر نظر ڈال کر ڈیڑھ دو منٹ کے بعد واپس کرتے ہوئے بولے۔ ’’جرائم کے ارتکاب میں آبادی کے تناسب سے مسلمانوں کی

نمائندگی اچھی خاصی ہے۔ پچیس، تیس فیصد سے کم نہیں ہوگی۔ چاہے قتل ہو، ڈکیتی ہو، ریپ ہو یا چھل کپٹ اور دھوکا دہی ہو"۔

بکس میں ایک چھوٹی سی خبر تھی۔ پولیس نے کرایہ کے تین قاتلوں کو پکڑا تھا۔ ان میں ایک مسلمان نام بھی تھا۔

"ایسے معاملوں میں مسلمانوں کی غیر مسلموں سے اچھی ملی بھگت رہتی ہے۔ البتہ تعلیم خاص کر ملازمت میں مسلمانوں کی شرحِ نمائندگی تین چار فیصد سے زیادہ نہیں ہوتی ہے"۔

وہ مجھے بڑے دل چسپ آدمی لگے۔

ایک روز میں کوچینگ سنٹر سے لوٹا۔ سلطان گلی میں ایک دکان کے تھڑے پر بچوں کے جھرمٹ میں بیٹھا ہوا بچوں کے لئے ایک پتنگ بنا رہا تھا۔ سامنے قینچی اور لئی رکھی ہوئی تھی۔ وہ یہ کام چھوڑ کر میرے ساتھ آنگن میں آیا اور مجھ سے پوچھا۔

"ٹرانسپورٹ کے وزیر کو تو نہیں جانتے ہو؟"

"میں اس کے سایہ کو بھی نہیں جانتا ہوں"۔

یہی سوال اس نے سجاد سے کیا۔ سجاد بولا۔ "منسٹروں تک ہماری پہنچ کہاں ہے انکل؟"

"بات کیا ہے؟ میں نے پوچھا"۔

"ایک پوسٹ نکلا ہے"

"کیسے پتہ چلا؟" سجاد نے سوال کیا۔

"اخبار میں تھا۔ میں ٹرانسپورٹ کے دفتر گیا۔ وہاں تصدیق ہوئی"۔

"کچھ پیسہ خرچنا تھا" سجاد بولا۔

"وہ تو میں تیار ہوں"۔ سلطان بولا۔ "بابو کہتا ہے ٹرانسپورٹ یا کسی منسٹر سے ایک سفارشی خط لاؤ، وہ کام کرا دے گا"۔

کچھ توقف کے بعد وہ بولا۔ "کام مشکل نہیں ہے۔ یارڈ میں بیٹھنا ہے اور مہینے کے آخر میں تنخواہ لینی ہے۔ آپ دونوں کی طرح میں زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ یہ کام ملے

تو میرے لئے غنیمت ہے''۔

وہ دن کو غائب رہنے لگا اور شام کو آ کر ہم کو بتاتا تھا کہ کوئی کام نہیں بنا۔ کئی روز گزر گئے۔

مجھے اچانک جھنڈا والا یاد آیا۔ میں نے سلطان سے کہا۔ ''میں ایک آدمی کو جانتا ہوں جو حکمران طبقہ کے جلسے جلوسوں میں جھنڈا لے کر ہمیشہ آگے آگے چلتا ہے اور جھنڈا والا کہلاتا ہے۔ اگر اس سے یہ کام ہو سکے تو میں آپ سے ملاؤں گا''۔

میں نے جھنڈا والا سے سلطان کی ملاقات کرائی۔ سلطان نے اشتہار کے تراشے کی فوٹو کاپی بنا کر جھنڈا والے کو دی۔

چار روز بعد سلطان خوشی خوشی ہمارے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں پیڈ پر لکھا ہوا وزیر کا سفارشی خط تھا۔ اس نے لفافے میں سے خط نکال کر بڑے فخر سے ہم کو دکھایا پھر مالکِ مکان کی سائیکل پر خط حوالہ کرنے ٹرانسپورٹ دفتر گیا۔

بابو نے اس کو ایک ہفتہ بعد آنے کے لئے کہا تھا۔ سلطان بولا۔

''میں تم دونوں سے عمر میں آٹھ دس سال بڑا ہوں۔ عمر زیادہ ہو جائے تو مجھے کبھی ملازمت نہیں ملے گی''۔

دوسرے روز وہ گاؤں چلا گیا۔ چار روز بعد جب لوٹا تو ہمارے لئے سیب کی ایک پیٹی لایا تھا۔ اس نے پہلے بھی ہمارے لئے سیب لایا تھا۔ وہ اکثر گاؤں میں اپنے سیب کے باغ کا ذکر کرتا تھا۔

دوسری صبح وہ حسبِ معمول اخبارات کے اشتہارات پڑھنے لگا۔

سجاد بولا۔ ''اب ملازمت پکی ہوئی ہے۔ اشتہارات پڑھنا چھوڑ دو''۔

''اشتہارات پڑھنے میں اپنا مزہ ہے''۔ سلطان بولا۔

میری نظر ایک خبر پر پڑی۔ کائنات میں ایک ایسا سیارہ دریافت ہوا تھا جو خالص الماس کا بنا ہوا ہے۔ میں نے خبر پڑھ کر سنائی۔

''الماس کیا ہوتا ہے؟'' سلطان نے پوچھا۔

''Diamond کو کہتے ہیں۔ ہیرا سمجھ لو''۔

''چاچی!'' سلطان مالکن کی طرف دیکھ کر چلایا جو آنگن میں الگنی پر کپڑے سکھانے کے لئے ٹانگ رہی تھی۔ ''ایک خوش خبری سنو''

مالکن نے سلطان کی طرف دیکھا۔

''آسمان پر ایک ستارے کا پتہ چلا ہے جو خالص ہیرے کا بنا ہوا ہے''۔

''جب جاؤ گے تو میرے لئے بھی ایک چھوٹا سا ٹکڑا لے آنا''۔ وہ خاتون بولی۔

''چھوٹا کیوں، میں بڑا سا لے آؤں گا''۔

''انکل باؤلر کیا بول رہا ہے؟'' مالکِ مکان باہر آ کر مسکراتا ہوا بولا۔

''سر، یہ ڈائمنڈ والے سیارے کی بات کر رہا ہے''۔ سجاد بولا۔

انہوں نے سجاد کے ہاتھ سے اخبار لیا۔ یہ خبر پڑھی۔ سر کو ہلکی سی جنبش دی اور الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر ہم سے مخاطب ہوئے۔

''ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت اپنی جگہ، باپ اپنی نوعمر بیٹی سے منہ کالا کرتا ہے پھر چچا اور بیٹا اس میں اس شامل ہوتے ہیں اور آبرو ریزی جاری رہتی ہے۔ ماں اپنے نوزائیدہ بچے کو کوڑے دان میں پھینکتی ہے۔ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی ایک چھ سال کی بچی کی عصمت دری کرتا ہے اور پھر گلا گھونٹ کر مارتا ہے۔ قدیم روما اور یونان میں ایسی باتیں پڑھنے کو ملتی تھیں۔ آج ہم آئے دن ایسی خبریں پڑھتے ہیں۔ عینیت پسند لوگ کہتے ہیں کہ انسان سے مایوس نہ ہوں۔ انسان سے مایوس کیوں نہ ہوں؟''

''سر کیا اخبار میں کوئی ایسی خبر دی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ پڑھو'' انہوں نے خبر دکھائی۔

ادھیڑ کے ایک آدمی نے چھ سالہ بچی سے منہ کالا کر کے اس معصوم کا گلا گھونٹ کر مار دیا تھا۔

ہفتہ پورا ہونے پر سلطان ٹرانسپورٹ آفس چلا گیا۔ جب لوٹا تو منہ لٹکا ہوا تھا۔

''بڑے پریشان لگتے ہو۔ خیریت تو ہے''۔ میں نے پوچھا۔

''وزیر نے ٹرانسپورٹ کے اس پوسٹ کے لئے الگ الگ تین آدمیوں کے لئے حکم اجرا کیا ہے۔ تین اور سر بہ مُہر لفافے پڑے تھے۔ بابو بولا۔ ان میں بھی اسی پوسٹ کے لئے سفارش ہونی چاہیئے۔ اس لئے ہم نے ابھی ان کو نہیں کھولا ہے''۔

''پھر؟''

''میں نے ایک بابو سے پوچھا۔ میرا کوئی چانس ہے۔ وہ بولا سفارش دو قسموں کی ہوتی ہے۔ ایک کچی اور ایک پکی۔ یہ ساری سفارشیں کچی ہیں۔ پکی سفارش کے لئے منسٹر آفسر سے براہِ راست باتیں کرتا ہے افسر کو بلا کر ذاتی طور ہدایت دیتا ہے......اب میں کیا کروں؟'' سلطان نے ہم سے مخاطب ہو کر کہا۔

''ہم کیا کر سکتے ہیں؟'' سجاد بولا۔

''جھنڈا والے سے دوبارہ ملو۔ شاید وہ کوئی راستہ دکھائے''۔ میں نے کہا۔

دو روز بعد میں نے سنا، سلطان بوریا بستر اٹھا کر مکان سے چلا گیا۔ اس نے کس کو کچھ نہیں بتایا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ محلّہ کے بچے روز آ کر ہمیں پوچھتے تھے کہ انکل باؤلر کب آئے گا۔

لگ بھگ دو ماہ ہوئے ہوں گے، ہم سلطان کو بھول چکے تھے۔ میں کوچنگ سینٹر جا رہا تھا۔ ایک جگہ سڑک پر ٹریفک جام تھا۔ ایک طرف سے جلوس آ رہا تھا۔ سڑک کے تھڑے پر تماشائی کھڑے تھے۔ میں بھی ان میں شامل ہوا۔ جلوس ہمارے سامنے سے گزرنے لگا۔ انکل باؤلر علم بردار بنا تھا۔ پارٹی کا ایک بڑا جھنڈا اٹھا کر وہ آگے آگے چل رہا تھا اور گلا پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگا رہا تھا۔

............☆☆☆............

مخمور حُسین بدخشی

نام	:محمد حُسین بدخشی
قلمی نام	:مخمور حُسین بدخشی
تاریخِ پیدائش	:یکم جنوری ۱۹۳۸ء سرینگر
تعلیم	:ایم۔اے (اُردو)
پیشہ	:درس وتدریس
تصنیف	:نیل کنول مسکائے (افسانوی مجموعے)
اعزاز	:جموں کشمیر اُردو اکیڈیمی ایوارڈ
پتہ	:ہل ویو کالونی راول پورہ سرینگر
فون نمبر	9906856826

☆......مخمور حُسین بدخشی

کاغذ کے پُھول

پیاری صفیہ!

گاؤں سے شہر کیا آئی کہ مُصیبت آئی۔ یہاں وہ پانپور کے زعفران کے کھیت کہاں۔ جن پیارے پیارے اور رنگ ونُور سے بھرے ہوئے کھیتوں میں تم اور میں شام کی تنہائی میں چاندنی کے مزے لوٹا کرتی تھیں۔ شہر کی بات سوچا کرتی تھیں۔ روز شہر کی بات۔ شہر کا نام ہی ہمارے دل میں ننھی ننھی دھڑکنیں پیدا کرتا۔ آنکھوں میں ٹھنڈک سی آجاتی اور پھر ہم کتنے ہی حسین خوابوں میں کھوجایا کرتے۔ خواب جن میں رنگ اور رَس ہوتا ہے۔ کلیوں کا شباب اور پھولوں کا نِکھار ہوتا ہے اور ان ہی خوابوں کی دنیا میں تمہیں شہر آنے کی کتنی تمنائیں اور آرزوئیں تھی اور ان تمناؤں اور آرزوں پر اس دن اور زیادہ نکھار آیا جب ہمارے گاؤں میں وہ پیاری البیلی سی لڑکی فاطمہ آئی تو تم نے اس سے شہر کی کتنی باتیں پوچھیں۔ تمہیں اس کے بال بنانے کا انداز کتنا پسند آیا اور جب تمہیں معلوم ہوا کہ وہ شہر میں گرلز کالج میں پڑھتی ہے تو تمہاری آرزوں اور اُمنگوں میں کِتنا جوش آیا۔ تمہاری بے چینی اور بے قراری کس قدر بڑھ گئی اور خود میری بھی۔ میں بھی چاہ رہی تھی کہ میرے پَر لگ جائیں اور میں ابھی اُڑ کر گرلز کالج پہنچ جاؤں۔ اُس گرلز کالج میں، جہاں ہمیں معلوم تھا آزادی ہے اور اس آزادی میں ہم بہت کچھ سیکھ جائیں گی اور پھر ہمارا شمار دنیا کی بڑی بڑی عورتوں میں ہوا کرے گا۔ یہی تمنائیں اور تمناؤں کے دلفریب رنگ تھے جو ہمیں گرلز کالج پہنچ جانے کے لئے بے قرار کرتے، تڑپاتے، ترساتے...... لیکن تُم کتنی اچھی ہو جو یہاں

آنے کی تمنا لئے ہوئے بھی یہاں نہ آسکیں......اور میں کتنی بُری ہوں جو اس اندھیرے غار میں جا گری۔ یہاں اندھیرا اور تاریکیاں ہیں۔ تاریکیاں جن میں نور ایک جھلک تک نہیں اور اندھیرے جن میں روشنی کی ہلکی سی کرن بھی نہیں پہلے دن جب میں یہاں پہنچی تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں ہوا میں پرواز کر رہی ہوں اور پرواز کرتے کرتے تختِ سلیمان سے بھی اوپر جا پہنچی ہوں۔ شنکر آچاریہ سے بھی بلند اُڑ رہی ہوں اور مجھ پر سُرخ سُرخ گل لالوں کی بارش ہو رہی ہے۔ مجھے موتیوں اور یمبرزلوں کے ہار پہنائے جا رہے ہیں۔ مجھے دنیا بھر کی عزت اور بڑھائی بخشی جا رہی ہے اور اس وقت مجھے تمہاری یاد آجاتی تو سچ مچ میں تمہاری بد قسمتی پر رو دیتی۔ مجھے کتنا افسوس ہوتا...... کاش ہم دونوں ساتھ ساتھ ہوتیں اور ساتھ ساتھ رہ کر زندگی کے مزے لوٹتیں۔ لیکن...... آخر کار میں یہ سب کچھ برداشت کرتے کرتے گرلز کالج میں رنگینیوں میں داخل ہوئی۔ یہاں مجھے رنگینیاں ہی رنگینیاں نظر آئیں۔ پانپور کے زعفران کے کھیتوں میں تو بس ایک ہی رنگ ہوتا ہے مگر یہاں...... یہاں تو قوس قزح سے زیادہ رنگ ہیں شوخ اور دلفریب رنگ...... رنگ جو دل کھینچ لیتے ہیں۔ آنکھوں میں اپنا عکس چھوڑتے ہیں اور پھر انسان ان ہی رنگوں کا شیدائی اور متوالا بن جاتا ہے۔

یہ سب رنگ مجھے پہلے ہی دن گرلز کالج کے رنگ برنگ پھولوں سے بھرے پرے باغ میں نظر آئے۔ اُف لڑکیاں ہی لڑکیاں...... اتنی ساری لڑکیاں تم نے پانپور میں زندگی بھر بھی نہ دیکھی ہوں گی اور پھر ان کی ترچھی نگاہیں اور بانکی ادائیں۔ آبشار کی طرح گرتی ہوئی زلفیں...... زلفیں جو یا تو کالی ہوتی ہیں۔ کالی کالی گھٹائیں۔ یا سنہری سونے کے باریک باریک تار۔ کون ہے جوان تاروں میں الجھ کر نہ رہ جائے۔ کون ہے جس پر کالی گھٹا نہ برسے۔ اُن کے ہونٹوں کی سُرخی رخساروں کی تمتماہٹ، گرمی اور نرمی دیکھنے کی چیز ہے۔ اُن کے نازک نازک جسموں میں گلاب کے غنچوں کی سی ہلکی ہلکی سرخی اور یمبرزل کی نازک نازک ڈنٹھلوں کی سی نرمی ہوتی ہے اور پھر ان یاقوتی اور سیمیں جسموں کے لباس۔ لباس پہننے کا ڈھنگ کتنا صاف ستھرا ہوتا ہے۔ اس میں کتنی فنکاری ہوتی ہے۔ یہ ہم نہیں کہ سامنے سے

فِرن اُٹھایا اور پہن لیا۔ ایک ہی بار دو دو مہینوں کے لئے بال بنا رکھے اور کام ختم۔ یہاں کی دنیا ہی نرالی ہے۔ یہاں فرن کہاں۔ ریشم کے قیمتی فراک ہوتے ہیں۔ شلوار اور غرارے ہوتے ہیں۔ ہوا میں لہراتی ہوئی نیلی نیلی ساریاں ہوتی ہیں۔ پیاری! یہاں لڑکیاں ننگے سر بھی چلتی ہیں اور سب سے تعجب کی بات تو یہ ہے کہ یہاں کی مُہذب لڑکیاں پتلون بھی پہنتی ہیں۔ اِن پتلونوں کی نوک پلک درست کر کے مٹک مٹک کر چلتی ہیں۔ پیاری یہ وہ مٹکنا نہیں جو ہم پنگھٹ پر پانی لے جانے والی لڑکیوں کا دیکھا کرتے ہیں۔ جن کے تنگ موری والے کھدر اور موٹی سے معمولی چھینٹ کے پاجامے گھٹنوں سے اُوپر سلے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہاں تو بوٹ کی نوک تک یہ رنگ برنگ کے پتلون لہراتے ہیں اور پھر ان پتلونوں میں مٹکنا اور نازک نازک ٹانگوں کا تھرکنا دیکھنے کی چیز ہے...... اِن لڑکیوں میں تو مجھے خوب صورتی نظر آئی ہیں جن کی تعریفیں سُن سُن کر تمہیں جنت دیکھنے کی بڑی آرزو تھی۔ اِن حوروں کو دیکھ کر میں سوچتی کاش! تم اس جنت میں آ کر ان حوروں کو دیکھ لیتی۔ پھر تمہارے دل میں جنت دیکھنے کی آرزو نہ دھڑکتی......! دیکھو تو میں بھی کیا کیا کہہ گئی۔ کہنا تو یہ تھا جب میں پہلے دن ان پریوں کے دیس میں آ پہنچی تو میں ٹھٹھک اور جھجک کر رہ گئی۔ ٹھٹھک اسی لئے گئی کہ میں نے اتنی ساری رنگ برنگی لڑکیاں پہلی بار دیکھی تھیں اور جھجک اسی لئے گئی کہ میرے پاس اُن جیسا زرق برق لباس نہ تھا۔ آخر گاؤں کی جو تھی۔ میں تو وہی بھیا کی شادی پر سلوائے ہوئے فراک میں تھی اور اب اُس کا بھی وہ رنگ نہ رہا تھا جو پہلے تھا۔ میں تو بہت خجل ہوئی وہ پہن کر اور یہ لڑکیاں بھی تو پہلے دن مجھے بہت کم پوچھتی تھیں......اور پوچھتی بھی کیوں؟ میرا اُن کا مقابلہ ہی کیا تھا۔ جس طرح گاؤں اور شہر کے مکانات میں کافی فرق ہے۔ گاؤں اور شہر کے کھانے پینے میں فرق ہے۔ اسی طرح گاؤں اور شہر کے انسانوں میں بھی فرق ہوتا ہے اور پھر پانپور کی لڑکی اور گرلز کالج کی لڑکی میں تو فرق ہی فرق ہے پیاری۔ اسی لئے تو وہ میرے ساتھ بہت کم چلتیں۔ یہاں کی ریت ہی میں نے عجیب دیکھی۔ ہر لڑکی اُس لڑکی کے ساتھ چلنا پسند کرے گی جو لباس اور دولت میں اُس سے بڑی ہو اور وہ لڑکی اُس سے بھی

اونچی کسی اور لڑکی کے ساتھ چلے گی اور پھر یہ کشمکش جاری رہتی ہے۔ لیکن اس سے تم یہ نہ سمجھ لینا یہاں کوئی غریب لڑکی پڑھتی ہی نہیں...... وہ بھی تو پڑھتی ہیں۔ لیکن خود کو وہ دوسروں کی نظروں میں غریب محسوس ہونے نہیں دیتی۔ لباس اچھا پہنتی ہیں۔ چاہے گھر میں وہ فاقے سے ہی کیوں نہ رہتی ہوں۔ وہ آدھا پیٹ کھا کر کوڑی کوڑی اور پیسہ پیسہ بچائیں گی۔ لیکن لباس قیمتی پہنیں گی اور پھر بڑے آدمیوں کی دولت مند لڑکیوں کے ساتھ ریس کریں گی۔ غرض اُس کے ہر ڈھنگ، طرز اور طریقے کی نقل اُتاریں گی۔ یہ نقل اُتارنے کا مرض تو مجھے بھی ایک حد تک لگ گیا ہے۔ اگر نہ لگتا تو پھر میں کالج نہ آتی۔ جیل خانے میں آجاتی...... پھر تو مجھ سے بولتی ہی کون؟ لباس جدید فیشن کا نہ ہو تو کون اتنی گری ہے جو تمہارے ساتھ چلے۔ اس لئے نقل یہاں بالکل عقل کے مطابق کی جاتی ہے۔ میرا یہاں پہلا ہی دن تھا کہ میں لائبریری میں پہنچی۔ یہاں کتابوں کی بڑی بڑی الماریاں ہیں۔ اتنی ہی بڑی لائبریری ہے یہ جتنا تمہارا گھر ہے۔ کتابوں کے انبار، رسالوں کے ڈھیر لیکن سبھی لڑکیاں تو سستے قسم کے رومانی ناول پڑھتی ہیں اور پھر گندی گندی باتیں وہ اس بے باکی سے کرنے لگتی ہیں کہ میں شرم سے پانی پانی ہو جاتی ہوں۔ لیکن دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر کون رکھے۔ یہاں میرے کانوں نے جو پہلی بات سنی وہ تھی عشق اور محبت کی بات۔ وہ محبت نہیں پیار ہے۔ یہ پیار یہاں بہت ہوتا ہے...... پیار کرو...... پیار کی بات کرو اور جیو...... ورنہ ڈوب مرو کہیں چلو بھر پانی میں...... یہاں تو اور بھی عجیب عجیب کھیل تماشے ہوتے ہیں اُس دن جب میں چار بجے کالج سے نکلی تو کیا دیکھتی ہوں، کوئی کالج کا لڑکا کتابیں تھامے میرے پیچھے پیچھے چل رہا ہے۔ میں پہلے ڈری تو نہیں۔ سمجھا یہ میرے پیچھے پیچھے تھوڑا ہی چل رہا ہے۔ ابھی ہٹ کر اُس طرف کو جائے گا۔ لیکن پیاری جب وہ بالکل میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا تو میری روح ہی نکل گئی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ہاتھ اور ٹانگوں میں عجیب سی مُردنی چھا گئی۔ اس سے پہلے تو میں یہ سوچ رہی تھی، اب کالج کے لئے کیسے کیسے کپڑے بنواؤں گی۔ وہاں کس طرح چلا کروں گی اور کیونکر وہ مجھے کوئی اجنبی پرائی لڑکی نہ سمجھیں۔ لیکن وہ سب

خیالات اُس وقت ریت کے محل کی طرح ِگر پڑے، جب وہ لڑکا میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میں بس اسٹینڈ پر پہنچی تو وہ میرے ساتھ ہی تھا۔ میں لال چوک میں آئی تو وہ ساتھ ہی لگا رہا۔ سینیما کی وجہ سے لال چوک میں کافی بھیڑ تھی۔ بھیڑ میں سے کسی نے اسے پکارا تو وہ اس کے پاس چلا۔ میری جان میں جان آئی۔ میں نے ٹھنڈی سانس بھری اور مائیسمہ کی طرف مڑی۔ میں ابھی کچھ ہی دور پہنچی تھی کہ پھر وہی لڑکا میرے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اب اس کے ساتھ دوسرا ابھی کوئی لڑکا تھا۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ کیا کیا کہہ رہے تھے میں تو کچھ سمجھی نہیں۔ میں چل رہی تھی لیکن اُن میں سے اب ایک لڑکا میرے بالکل ساتھ ساتھ چلنے لگا اور گانے لگا...... مانا کہ ہم غریب ہیں۔ دل تو نہیں غریب...... دولت تو آزمائی ہے دل آزما کے جا، اُو بلبل دل آزما کے جا۔ اُو بلبل دل آزما کے جا،...... اُو بلبل دل آزما کے جا...... اُو بلبل! اور میں مرگئی پیاری...... میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ برقعے میں پسینے سے شرابور ہو رہی تھی اور پھر نہ پوچھو کہ میری وہ رات کیسے گذری...... جیسے میں جنوں اور بھوتوں کے چنگل سے بچ کے آئی تھی...... جیسے کسی گہرے اندھیرے کنویں سے مجھے نکالا گیا تھا۔ جیسے سمندر کی تہہ سے دم گھٹتے گھٹتے مجھے بچایا گیا تھا۔ اتنی خوف زدہ ہوئی تھی میں۔ پھر کالج کے ماحول میں رس بس کے مجھے معلوم ہوا کہ یہ تو چھوٹی چھوٹی باتیں ہوئیں۔ اس سے بڑی بڑی باتیں اور شرارتیں یہاں ہوتی ہیں اور یوں ہوتی رہتی ہیں جس طرح ہمارے گاؤں کا وہ چشمہ دن رات پانی اُگلتا رہتا ہے اور ایک پل کے لئے بھی سوکھا اور خاموش نہیں رہتا۔ یہاں کی دنیا ہی عجیب ہے۔ ہمارے کالج کے پیچھے کچھ دائیں جانب تو ایک اور کالج ہے۔ نام تو بار بار یاد رکھ کر بھی مجھے یاد نہیں رہتا۔ لیکن ہے وہ لڑکوں کا کالج۔ اب دیکھو یہ لڑکے کتنے شریر ہیں۔ اُنہوں نے ہمارے کالج کی دیوار میں دو چار سوراخ کر ڈالے ہیں۔ صبح کے دس بجے سے لے کر شام کے چار بجے تک اُن ہی سوراخوں میں سے ہمیں جھانکا کرتے ہیں۔ کھیل کے وقت جب ہم باہر نکلتے ہیں تو اِن سوراخوں کا عجب حال ہوتا ہے۔ آٹھ آٹھ آنکھیں ایک ہی وقت ایک سوراخ پر لگ جاتی ہیں۔ جیسے دیوار کے

سوراخ نہ ہوئے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ہاتھوں میں دوربینیں ہوئیں۔ لیکن پیاری اس سے تمہیں یہ خیال نہ آنا چاہیئے کہ بس لڑکے ہی شریر ہیں۔ جو اس طرح سے شریف لڑکیوں کو ستاتے ہیں۔ یہ تمہاری غلطی ہے۔ میں کالج کی ہر ایک لڑکی سے واقف ہو چکی ہوں۔ یہاں کی لڑکی تو اُس وقت کولھے مٹکاتی، آنکھیں نچاتی، بال لہراتی اور نقرئی قہقہوں کے طوفان بکھیرتی ہوئی دل رُبانہ انداز سے چلے گی جب اسے معلوم ہوا کہ سوراخوں کے پیچھے سے اُسے بہت سارے لڑکے دیکھ رہے ہیں۔ یہاں تو حُسن اور عشق کا سنگم ہے ہاں ایک بات میں تمہیں ان لڑکیوں کی بتاؤں۔ تمہیں تو عجیب ہی معلوم ہوگی۔ لیکن تم سُن لو۔ جب یہ لڑکیاں دیکھتی ہیں کہ ان سوراخوں میں سے کوئی اُنہیں جھانکتا نہیں تو وہ کچھ سُست سی پڑنے لگتی ہیں۔ چہرے کی رنگت اُڑسی جاتی ہے اور پھر وہ نظریں بچائے دھیرے دھیرے دھبے دھبے پاؤں دیوار کے پاس پہنچ کر سوراخ میں سے جھانکتی ہیں۔ جب وہاں کوئی نہیں ہوتا تو غمگین اور مایوس ہو جاتی ہیں۔ جیسے ان کی زندگی کی ساری رنگینی اور تازگی چھین لی گئی ہو۔ شباب کی ساری مٹھاس اور رس چوس لیا گیا ہو۔ یہ یہاں کی شوخ وشنگ لڑکیوں کی فطرت ہے۔ ہم گاؤں کی بھولی بھالی لڑکیاں اسے کیا جانیں۔ یہاں ایک لڑکی ہے تھرڈ ائر میں پڑھتی ہے۔ نام ہے اُوما۔ وہ ایک دن مجھ سے یوں ہی اُوٹ پٹانگ باتیں کرنے لگی۔ یہی کہ کالج کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے۔ تم کس طرح کا عشق پسند کرتی ہو اور اس طرح کی اور بہت ساری باتیں پوچھنے لگی۔ بھلا میں کیا جانوں ان ہتھکنڈوں کو...... میں نے کہا میں تو یہ باتیں آج پہلی بار سن رہی ہوں۔ میں کیا جانوں ان باتوں کو..... میری بات سن کر وہ ہنس پڑی اور لگی شاعری میں بات کرنے۔ کہیں دل نہ لگانا۔ کہیں جال میں نہ آنا، کہیں پچھتانا نہیں،...... پھر میری ٹھڈی اپنی ہتھیلی میں لے کر کہنے لگی...... ''دیکھو نرگس! تم ابھی اس دنیا میں نئی نئی آئی ہو۔ جب ہی تو اتنی بے خبر معلوم ہوتی ہو...... یہ دنیا ہی نرالی ہے۔ اسی لئے ذرا پھونک پھونک کے قدم رکھنا پڑتا ہے۔ ورنہ گر کر انسان کسی کام کا نہیں رہتا...... اب ایک بات میں کہوں گی۔ یہ کالج کے لڑکے ہیں نا، اِنہیں خوب نچاؤ۔ اتنا نچاؤ کہ یہ خود ہی ناچ ناچ

کر گر پڑیں اور پھر تماشہ دیکھے گی میری نرگس، ورنہ یہ جنٹلمین تو بڑی اکڑ دکھاتے ہیں۔ پھر وہ ادھر اُدھر کی باتیں کر کے جو چلی تو کشوری مجھ سے ملی۔ اس سے پہلے میں اُسے جانتی نہ تھی۔ لیکن ہے بہت اچھی لڑکی دوپٹہ کبھی سر سے ڈھلکنے ہی نہیں دیتی۔ کالج سے نکلتے وقت آنکھیں جھکی جھکی ہی رہتی ہیں۔ جیسے کوئی اُس کی حیا نہ چھین لے۔ مجھ سے بہت ہی پیار سے کہنے لگی...... ''نرگس بہن۔ تم یہاں ان لڑکیوں کی باتوں میں نہ آنا۔ ان کے اس رنگ وروپ پر نہ جانا۔ یہ سب کھوٹ اور بناوٹ ہے۔ انہیں تو بس ٹیپ ٹاپ کی فکر ہے اور بس۔ لیکن ہم تو یہاں پڑھنے آئے ہیں۔ اس لئے اپنے کام سے کام رکھنا چاہیئے تم اوما سے ملتی ہو۔ یہ تم بہت بُرا کرتی ہو۔ اس لئے کہ اوما کہ جو پارٹی ہے اُس کا کوئی کریکٹر نہیں۔ یہ سب کچھ میں تمہیں ایک بہن کے ناطے کہہ رہی ہوں۔ تم جا کے اوما سے کہہ تو نہ دینا''۔ کشوری مجھ سے اکثر ملتی رہی اور مجھے معلوم ہوا کہ یہاں کشوری کی ہم خیال اور بھی بہت ساری لڑکیاں ہیں۔ جو شریر لڑکیوں سے راہ ورسم نہ بڑھا کر اپنے کام سے کام رکھتی ہیں۔ پڑھتی ہیں اور دل لگا کر پڑھتی ہیں نسرین کشوری کی فاسٹ فرینڈ ہے۔ اس لئے میری بھی دوست بن گئی ہے۔ بہت پیاری پیاری باتیں کرتی ہے اور صورت سے بھی تو پیاری ہی معلوم ہوتی ہے۔ اتنی معصوم ہے جتنا ایک ننھا بچہ۔ ایک دن وہ موڑ میں آکر مجھ سے کہنے لگی۔ ''یہ کالج کی لڑکیاں تو اکثر یوں ہی بدنام ہو جاتی ہیں۔ ساتھ والے کالج کے لڑکے بہت شریر ہیں۔ جوں ہی ہمارے کالج کی کسی لڑکی کا نام معلوم ہوا بس لکھ مارتے ہیں ایک بے نام خط۔ جس میں واہی تباہی لکھ جاتے ہیں۔ کارڈ تو ضروری ہے یہاں ساری لڑکیاں پڑھ لیں گی اور پھر شور شرابا، ہنگامہ اور یہ معصوم لڑکی اتنی بدنام ہو جاتی ہے کہ منہ چھپانے کو جگہ نہیں ملتی اُسے'' نسرین کی یہ بات سچ ہے۔ یہاں کی اکثر لڑکیاں تو ان تیروں کا شکار ہو چکی ہیں۔ لیکن شکاریوں کے نام تک اُن بیچاریوں کو معلوم نہیں۔ اُن لڑکوں کو جیسے شرم وحیا چھو کر بھی نہیں گئی ہے۔ کسی کی عزت وآبرو کا ذرا بھی خیال نہیں کرتے۔ راہ چلتے ہم لڑکیوں کا پیچھا کرتے ہیں۔ خاموش رہو تو ہمارے پیچھے پیچھے فلموں کے ڈائیلاگ بولنے لگتے ہیں۔ ہائے میری

جان! میں تو مر گیا رے...... چشم بد دُور...... ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں...... اب کچھ کہو تو اُونچی آواز میں فقرے کسنے لگتے ہیں اور ہم تنگ آجاتے ہیں۔ اب تو پولیس اُن شریر لڑکوں کو گرفتار بھی کرنے لگی ہے۔ لیکن اُن کی خصلت کہاں جائے۔ کسی نہ کسی طریقے سے پریشان کر ہی لیتے ہیں۔ پیاری! یہ شہر کی پریشانیاں کچھ نہ پوچھو۔ صبح پریشانی اور شام پریشانی۔ روشنی میں بھی اور اندھیرے میں بھی...... جدھر جاؤ، جہاں دیکھو پریشانیاں ہی پریشانیاں ہیں......!

اور اُس دن تو میں بہت پریشان ہوئی۔ کیا ہوا۔ ہم شالیمار باغ ایکس کرشن کو گئی۔ مصیبت تو یہ آئی اوما میرے ہاتھ میں ہاتھ دے کر مجھے اپنے ساتھ گھسیٹنے لگی کیسے پیچھا چھوڑتی۔ باغ کے اوپر والے سائڈ کو جاتے ہوئے کہنے لگی:۔

''اب دیکھو نرگس مزا! اب ایک فلم کا سین دکھاتی ہوں تمہیں!''

میں تو حیران اور پریشان ہوئی۔ سمجھ گئی کوئی شرارت سوجھی ہے اُسے۔ اُس نے گلاب کے دو پھول توڑ دے اور اس طرف کو اشارا کرنے لگی جہاں دو لڑکے مزے میں بیٹھے پھولوں کی کیاریوں کے ساتھ کھیل رہے تھے...... اوما ساری کو ہوا میں لہراتی، خوشی سے جھومتی چوڑیوں کی کھنک سے ایک بار پھر بول اُٹھی۔

''اب دیکھ تو نرگس مزا!''

میں خاموش رہی۔ وہ زور زور سے باتیں کرتی رہی اور پھر اُن لڑکوں کی طرف مجھے بھی اپنے ساتھ گھسیٹ لے چلی۔ اُوما قہقہے بکھیرنے لگی۔ دونوں لڑکے ہمیں گھورنے لگے...... اوما نے چپکے سے میری کلائی پر چٹکی لی۔ پیاری! میں تو مری جا رہی تھی۔ لیکن اوما...... وہ تو قہقہے بکھیرتی، بالوں کو ساتھ ساتھ سجاتی بل بل پر بل کھاتی ہوئی چل رہی تھی...... پھر اُس نے لڑکوں کی طرف ایک مسکراتی اور شوخی سے بھری نظر پھینک دی اور ہاتھ سے گلاب کے دونوں پھول نیچے سبزے پر گرا دئے۔ دونوں لڑکے آئے اور ایک ایک پھول اٹھا کر سونگھتے رہے۔ پھر بڑے پیار سے ہماری طرف دیکھنے لگے۔ میں تو ڈر اور شرم سے پانی پانی ہو رہی تھی کہ یہ کون سی مصیبت آئی۔ میں نے کیسے گناہ کئے تھے کہ جو یہ دن اور یہ

وقت دیکھنا پڑا۔ وہ دونوں بہت ہی بے باکی سے ہمارے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ جیسے ہم......! اُوما نے ایک باراور زور سے میری کلائی کو دبایا۔ سینہ تان کر دونوں لڑکوں سے مخاطب ہوئی۔

''بڑے بدتمیز ہوتم......شرم نہیں آتی تمہیں!''

''اوہ اتنا غصہ!''

''شٹ آپ''

اُوما چیخی......

پھر تو بہت ساری لڑکیاں اوما کا شور سُن کر جمع ہوگئیں اور پھر نہ پوچھو اُن دونوں کی کیا گت بنی۔ ایک تو مار پڑی۔ دوسری روسیاہی ہوئی۔ اُن کی کون سُنتا۔ سبھی لڑکیوں نے سینڈل اُٹھائے اور تڑاخ تڑاخ......!!

لیکن حقیقت تو میں ہی جانتی تھی۔ اُوما بھی لڑکیوں کے سامنے لگی اپنی معصومیت جتانے اور چپکے سے میرے کان میں کہا۔

''دیکھ لیا نہ فلم کا منظر''

یہ حالت ہے یہاں کی پیاری!...... یہاں سب فراڈ ہے۔ سب دھوکا ہے۔ سب کچھ فریب ہے۔

پھول ہیں مگر خوشبو اُڑ چکی ہے۔

کاغذ کے پھول!!

رنگ ہے۔ لیکن مہک نہیں۔ بناوٹ ہی بناوٹ۔ کھوٹ ہی کھوٹ۔ جھوٹ ہی جھوٹ۔ یہاں کی زندگی کی سچی رنگینیاں ہی مر چکی ہیں۔ ان سے ریشم، غازہ اور پوڈر چھین لو تو یہ کچھ بھی نہیں رہتی۔ کچھ بھی تو نہیں۔

اُس چرواہی لڑکی کی معصومیت ان میں کہاں جو گود میں بھیڑ کا بچہ لئے پانپور میں ہم سے ملا کرتی تھی۔ یہاں وہ سرسبز شاداب کھیتوں کا روپ کہاں؟ جن میں ہم آزادی سے

پھرا کرتی تھیں۔

وہ ندیاں یہاں کہاں، جن کے ٹھنڈے ٹھنڈے پانی میں پاؤں ڈال کے ہم دنیا بھر کی باتیں کیا کرتی تھیں! یہاں کچھ بھی تو نہیں!

شہر شہر ہے۔ اور گاؤں گاؤں!

اندھیرا اور اُجالا!!

تُمہاری اپنی
نرگس

............☆☆☆............

وریندر پٹواری

نام :وریندر پٹواری

تاریخِ پیدائش :۱۱رستمبر۱۹۴۰ء سرینگر

تصانیف :افسانہ۷مجموعے......ڈرامہ۲مجموعے......ناول۱

افسانوی مجموعے :فرشتے روتے ہیں(۱۹۸۱)، دوسری کرن (۱۹۸۶)، بے چین لمحوں کا سفر(۱۹۸۸)،آواز سرگوشیوں کی (۱۹۹۴)، ایک ادھوری کہانی(۲۰۰۲)، افق(۲۰۰۳)، دائرے(۲۰۱۰)، الم (کشمیری افسانوی مجموعہ۲۰۰۹)

ڈرامے :آخری دن (۱۹۹۳)،انسان(۲۰۰۲)

پتہ(حال) :قاہرہ مصر

معرفت:ڈاکٹر اشوک پٹواری

ریڈرس فلیٹ نمبر۴،لیڈی ہارڈنگ میڈیکل کالج کمپس

بنگلہ صاحب روڈ نئی دہلی

❖

☆......وریندر پٹواری

کروٹ

غیر متوقع واقعات سے اُبھرے حالات اُس کی دانش مند منصوبہ بندی سے، ایک کروٹ لے کر، حیرت انگیز نتائج دے سکتے ہیں، یہ اُس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا! یعنی اُس کا اُکھڑ چکا اینٹوں کا بھٹہ، آج موسمِ بہار کی مانند چہکتا مہکتا نظر آئے گا! ایسا اُس نے پہلے کبھی دیکھا نہ تھا!!

دراصل جب سے ایک رات کی غیر متوقع تیز بارش نے اس کی لاکھوں کچی اینٹوں کو کیچڑ میں بدل کر اُس کا بھٹہ بٹھا دیا تھا وہ ایک زبردست اقتصادی بحران کا شکار ہو چکا ہے! بینک سے قرض لے کر وہ بحران پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہے مگر چند ہفتوں کے دوران ہو چکی کارکردگیوں کے نتائج کی آہٹ سن کر آج اُس نے تمام کچی اینٹوں کو زمین پر بچھا کر، ان پر ایک استقبال کے لیے قالین بچھا دیئے ہیں! سائبانوں سے سجا کر، اُس کا بھٹہ سج دھج کر آج ایک ایسے مہمان کا انتظار کر رہا ہے جو اُس کو ایک لاکھ امریکی ڈالر بطور ایک عالمی مقابلہ جیتنے کی رقم کا چیک دینے آرہا ہے! اور یوں اُس کو وہ خوشیاں دے رہا ہے جو اُس نے اپنے تیس برس کے کاروباری دور میں پہلے کبھی نہیں سمیٹ لی ہیں! ظاہر ہے کہ اُس نے اپنے عالیشان مستقبل کے استقبال کے لیے ایک رنگارنگ تقریب کا اہتمام کیا ہے! شہر کے معزز شہریوں اور اعلیٰ سرکاری افسران کے علاوہ میڈیا والوں کو بھی مدعو کیا ہے!!

تقریب میں وہ جوڑا بھی شامل ہے جس نے اُس کے نمائندوں کے طور پر مقابلے میں حصہ لے کر، رقم جیت لی ہے! حالانکہ اُن کی بے وقوفی اور شرائط کی خلاف ورزی

کرنے کی وجہ سے انعام کی رقم کا اسی فیصدی حصّہ کٹ چکا ہے پھر بھی لکشمی نارائن نام کا ایک ٹھیکیدار یعنی جوڑے کا محسن دونوں کو بطورِ دولت کی دیوی لکشمی اور بھگوان نارائن، متعارف کررہا ہے ارخود کو ایک احسان مند ظاہر کرتے ہوئے میاں بیوی کے پیر بار بار چھو رہا ہے اور ہر بار ان کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر پھولے نہیں سما رہا ہے!!

بیس برس کا مادھو اور اس کی ہم عمر بیوی بغیر کسی ہچکچاہٹ کے خود ہی اپنی داستانِ غم حاضرین کو سنا کر یہ قبول کر چکے ہیں کہ اگر ٹھیکیدار نے اُن کو روزگار اور ایک خیمہ نہ دیا ہوتا تو وہ بھوک یا سردی سے ٹھٹھر ٹھٹھر کر مر گئے ہوتے!

وہ خوش ہیں کہ ان کی بدولت ان کا محسن کچھ پار رہا ہے! بلکہ وہ بھی مطمئن ہیں کیونکہ ٹھیکیدار سے کیے گئے معاہدے کی رُو سے وہ کسی گاؤں میں گھر، زمین، بیلوں کی ایک جوڑی، ایک جرسی گائے، یعنی مال مویشی بھی لے رہے ہیں! گویا وہ سب، جو انہوں نے کھویا ہے، بلکہ اُس سے بھی زیادہ!!

یہ سچ ہے کہ میاں بیوی اپنی سہاگ رات کو ہی اُکھڑ کر اُجڑ گئے ہیں! ہُوا یوں تھا کہ وہ شبِ عروس سے پہلے اپنے گاؤں کے مندر میں گئے تھے تب دیکھتے ہی دیکھتے لکڑی کا ایک پُل ندی میں اچانک آئے ہوئے پانی کے تیز بہاؤ سے بہہ کر ان کو مندر میں ہی رات گزارنے کے لیے مجبور کر گیا تھا! پھر چونکہ آناً فاناً نشیبی سطح پر واقع گاؤں، گاؤں والے دُور دُور تک پیلے کھیت بلکہ درخت بھی پانی میں اپنا وجود کھو بیٹھے تھے! صرف وہی زندہ رہنے میں کامیاب ہوئے تھے! اور چھ دن اور سات راتیں دنیا سے کٹ کر نہایت دُشوار اور عذاب دِہ حالات میں گزار چکے تھے!!

دونوں کو تب ہیلی کوپٹر کی مدد سے شہر میں لایا گیا تھا اور دونوں کی دردناک، تنہائی میں رہنے کی حیرت انگیز کہانی، اخباروں میں شائع ہوگئی تھی! ٹیلی ویژن کے تمام چینلوں پر ان کے اِنٹرویو دکھائے گئے تھے! لیکن چند دِنوں کے بعد ہی وہ شہر کی بھیڑ بھاڑ میں بھی ویسے ہی الگ تھلگ ہو گئے تھے جیسے وہ مندر میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر تنہائیوں میں رہ گئے تھے!

اور پھر نہ گاؤں کا کوئی ذکر کرتا تھا نہ کسی کو یہ جاننے کی فکر تھی کہ گاؤں کو ڈبو چ ڈالنے والا مار خور پانی، ڈیم ((باندھ) کے جزوی برباد ہونے کی وجہ سے کیوں اور کیسے آیا تھا؟ بحث مباحثوں میں امکانات کا ذکر اچانک یوں ڈوب گیا تھا، گویا گہرے پانی میں ایک پتھر! جو لوگ برق کی شکل میں باندھ پر گر پڑا قہرِ خدا، یا قہرِ آدم کی شکل میں دہشت گردوں کی کارستانی یا پھر سرکاری ملازموں کی غفلت کے حوالے دیتے رہتے تھے، سب خاموش ہو گئے تھے! گویا میاں بیوی ایک سناٹے میں ناامیدیوں کا بوجھ اٹھا کر کئی دنوں تک ایک عذاب دِہ سفر طے کرنے پر مجبور ہو گئے تھے!

چونکہ شادی کے کپڑے پہن رکھے تھے، اس لیے میاں بیوی کو مندروں میں پرشاد تو کیا بھیک بھی نہیں ملی تھی اور ایسے حالات میں جب لکشمی نارائن ٹھیکیدار نے ان کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا! تب ان کو یوں لگا تھا گویا بھگوان انسان بن کر اُن کے سامنے کھڑا تھا!

دراصل ٹھیکیدار میاں بیوی کے بارے میں، اُن سے حالِ زار سنے بغیر بہت کچھ جانتا تھا! اُس کی ایک خاص وجہ تھی!

چونکہ لکشمی نارائن ٹھیکیدار کی سوچ اور سمجھ پر اُن کا کاروباری عمل حاوی ہوتا رہتا ہے اس لیے وہ ہو کے، ہو رہے یا متوقع واقعات کے پسِ منظر میں فقط اپنے نفع یا پھر نقصان کا اندازہ لگانا ایک مقصد نما عادت بن گئی ہے! یعنی اگر برف باری نہیں ہوئی تو؟ اگر دہشت گردی ختم ہو گئی تو؟؟

اس کے علاوہ انعامی مقابلوں میں شریک ہونا اس کا واحد مشغلہ ہے اس لیے اُس کی نظریں ہمیشہ ایسی خبروں یا اطلاعات کی تلاش کرتی رہتی ہیں جن کا تعلق انعامی مقابلوں سے ہو!

جس دن نہایت کسمپرسی کی حالت میں یہ جوڑا اُس سے مدد مانگنے آیا تھا، اُس دن اُس نے ایک دس لاکھ ڈالر کے عالمی مقابلے کی پوری جان کاری حاصل کی تھی! یہ سوچ کر کہ جو جوڑا نہایت ڈراؤنے ماحول میں زندہ رہنے کی ہر ضرورت سے محروم ہوتے ہوئے بھی، کسی مددگار کے دلاسوں کے بغیر رنج وغم اور مایوسیوں کی تاریکیوں میں ڈبکیاں لگاتے ہوئے، چھ دن حالات سے مقابلہ کر سکتے ہیں، وہ اپنی جسمانی اور جنسی ضروریات ہونے کی

صورت میں، دس دن تک شہر بلکہ آبادی سے بھی دُور ایک برفیلے پہاڑ پر، گنجان جنگل میں، مقابلے کے لیے خاص طور پر بنائے گئے ایک محفوظ گھر میں، تنہا رہ سکتے ہیں۔ اگر وہ مقابلہ جیت جاتے ہیں تو کیوں نہ ایک معاہدے کے تحت اُن کو وہ دیا جائے جو بھی کھو چکے ہیں اور باقی کی رقم سے اپنے تمام خوابوں کو حقیقتوں میں بدلا جاسکتا ہے!

بس یہی سوچ کر ایک ٹھیکیدار نے، میاں بیوی، دونوں کی، انگلیاں پکڑ لی تھیں! چونکہ انعامی مقابلے میں فقط وہ شریک ہوسکتے تھے جو ملتے جلتے حالات میں رہ چکے ہوں اس لیے اُس نے اپنے خرچ پر اخباروں کے حوالوں سے، ٹی وی پر ان کے نشر ہو چکے پروگراموں کو دکھا کر، ان کو مقابلے میں شامل کروالیا تھا! جس روز مقابلے کے لیے، میاں بیوی کو، ایک ہیلی کاپٹر میں لے کر، ایک برفیلے پہاڑ کی اونچی چوٹی پر چھوڑ آگیا تھا، ٹھیکیدار کو بھی، بحیثیت میاں بیوی کے محسن اور قانونی مشیر ساتھ لیا گیا تھا! تاکہ وہ جان پاتا کہ گھر ہر لحاظ سے محفوظ ہے! کیونکہ چھوٹا سا مکان نہ برف کے بوجھ سے دَب سکتا تھا اور نہ کوئی تیز رفتار برف کا تو وہ گھر کو دَبوچ سکتا ہے! گھر میں بیس دن کے کھانے پینے کا سامان تھا! سردی کا مقابلہ کرنے کی خاطر معقول انتظامات رکھے گئے تھے! بلکہ تفریح کے لیے الیکٹرانک سہولیات بھی میسّر تھیں! فلم دیکھی جاسکتی تھی! کوئی بھجن گیت یا قوالی سنی جاسکتی تھی! بلکہ دل بہلانے کی خاطر اور جنسی رجحانات کو تقویت دینے والی نظموں کے کیسٹ بھی رکھے گئے تھے! یعنی اوب کر سوچنے اور سمجھنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی! اس لیے وہ مقابلے میں کود پڑا تھا!! اور یہ سبھی سہولیات اس لیے رکھی گئی تھیں تاکہ یہ تجربہ کیا جاسکے کہ انسان تنہائیوں میں رہ کر نفسیاتی خدشات کو جسمانی خوف سے زیادہ ڈراؤنا سمجھ کر مدد کے لیے صدائیں دے سکتے ہیں یا نہیں؟ اور وہ کب تک تنہائیوں میں الگ تھلگ ہو کر رہ سکتے ہیں!

ایک بہت ہی آرام دِہ چھوٹے مگر بے حد خوبصورت گھر میں موجود سہولیات کے بارے میں منتظمین نے مکمل طور پر جانکاری دی تھی! سہولیات کے استعمال کے لئے وہ تب کچھ بتادیتے جب مالتی، مادھو یا منتظمین کے ساتھ آیا ہوا اور ان کے ہی ساتھ جانے والا

میاں بیوی کا قانون مشیر اُن سے گزارش کرتا! منتظمین سمجھ بیٹھے تھے کہ میاں بیوی سہولیات کے استعمال سے آشنا ہیں جبکہ ٹھیکیدار کو ان کی نا آشنائی کا اندازہ تھا مگر اس کو یقین تھا کہ دونوں کے لیے ایسے آرام دِہ ماحول میں جب وہ موٹے شیشوں سے جھانک کر برف باری کے مناظر دیکھتے دیکھتے، کھاپی کر، ایک دوسرے سے لپٹ جائیں گے تب ساری کائنات سمٹ کر دونوں کی مسکراہٹ بن جائے گی!

یہ سوچ کر ہی اُس نے نہ خود میں بیوی کو ہدایات دی تھیں اور نہ میاں بیوی کو پوچھ کرنے کا موقع دیا تھا! ایک مصلحت کے تحت! کیونکہ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ میاں بیوی کو انعام کی رقم کے بارے میں جانکاری ہو! گھر میں ایک فون بھی تھا جو ناظم کے ساتھ جڑا ہوا تھا! یعنی اگر بات ہو جاتی تو ہر سوال اور ہر جواب یعنی مدد طلب کرنے والے اور مددگار کی آوازیں اور کوئی سن نہیں سکتا تھا! اُس کی بھی ایک خاص وجہ تھی! ہر مدد کی صدا یعنی (Tistress Call) اُس خوف یا ڈر کی شناخت کر سکتی تھی جو مقابلے میں حصہ لینے والوں کے تذبذب سے اُن کے ارادے کو عزم کی بلندی سے گرا کر ہٹا بھی سکتی تھی! یعنی ہر بار ایک سوال پر رقم کی جزوی کمی ہو جانے کے لیے، مدد مانگنے والے کو تیار رہنا تھا! اس شرط کو ناظم اور ٹھیکیدار دونوں نے قانونی طور پر قبول کیا تھا! اگر مدد صحت کے بارے میں ہو، تو اس کو رقم کھانے والی مدد کا نام نہیں دیا جا سکتا تھا! اُس کی ضرورت بھی نہیں پڑ سکتی تھی کیونکہ منتظمین نے گھر میں دوائیاں بھی رکھ لی تھی! میاں بیوی کی ڈاکٹری جانچ ہو چکی تھی اور حادثوں کے امکانات تھے ہی نہیں! یعنی گھر میں فقط ذی ہوش انسانوں کے لیے نفسیانی دباؤ کے اُتار چڑھاؤ کے امکانات تھے! جسمانی تکالیف کا کھنچاؤ نہیں تھا!

منتظمین نے کسی جنگلی جانور بلکہ ڈائن، وَن مانش، یا ایسے تصوراتی وجودوں کے حملوں کو خارج کرنے کے دعوے بھی کیے تھے! انسانی حملوں یا دہشت گردی کے تحفظ کا بھی یقین دلایا تھا! بلکہ یہ بھی قبول کیا تھا کہ اگر ان کی طرف سے اُن کا کوئی دعویٰ غلط ثابت ہوا تو وہ مقابلے کو مکمل قرار دے کر، مقابلے میں شریک جوڑے کو پوری رقم دیں گے!

گویا بقول لکشمی نارائن اگر مالتی یا مادھو مانگتے بھی رہتے تب بھی ایک سمندر کے پانی میں کمی نظر بھی نہیں آسکتی تھی! جبھی تو اُس نے اِس شرط کے بارے میں سوچا ہی نہ تھا! لیکن اسی شرط کی خلاف ورزی کرنے کی وجہ سے پانچویں دن کے اختتام تک انعام کی رقم فقط اسی فیصدی کٹ گئی تھی اور چھٹے دن صبح جب ٹھیکیدار کو یہ اطلاع مل گئی تھی تب اُس پر گویا برق گر پڑی تھی!

ہُوا یوں تھا کہ نئے گھر کے آرام دِہ ماحول میں نہ تو ان کو ایک دوسرے کو چھوٹی چادر سے بچانے کی کوشش کرتے ہوئے سردی سے ٹھٹھر ٹھٹھر کر جاگنا پڑا تھا! ورنہ وہ ایک خیمے کے اندر بوجھل آنکھوں کو آہٹ یا چاپ کی آوازیں سن کر کھلی رکھنے کی ضرورت تھی اس لیے وہ پہلی بار کچھ کھائے پیے بغیر ہی سو گئے تھے! پھر شام کو اچانک چارسُو پھیلے سناٹے میں، تاریکیوں کو چیرتی ہوئی، نظر نہ آنے والے جنگلی جانوروں کی آنکھوں کی چمک دیکھ کر وہ لرز اُٹھے تھے! پھر مدد کے لیے پہلی صدا دے چکے تھے!

جواباً ان کو بار بار اور ہر بار یہ بتایا گیا تھا کہ گھر کے اِردگرد جو خاردار تار کی دیوار بنائی گئی ہے، اُس میں برقی دوڑ رہی ہے اس لیے کوئی بھی جنگلی جانور یا درندہ جان بوجھ کر یا اتفاقاً قریب آنے کی کوشش کرنے والا شکاری بھی برق کے جھٹکوں کی شدّت سے ڈر کر بھاگ جائے گا!

گویا جو اطلاع ایک بار مل کر باقی سوالات کو خارج کر سکتی تھی، میاں بیوی کی معصومیت اور فوری طور پر مدد نہ ملنے کی وجہ سے ایک سے پانچ مختلف خدمتوں کی شکل میں آگئی تھی! جیسے تیار کھانے کے ڈبوں کو کھولنے کے لیے، ڈبوں کو گرم کرنے کے طریقوں کے بارے میں یا ویڈیو دیکھنے کے بارے میں وہ ایک مدد سے جڑے ہوئے کئی سوالات پوچھ پوچھ کر مدد مانگ کر وہ ناظم کو اپنا ہمدرد سمجھ کر اپنے انعام کی رقم کو کم کرتے رہے!

دراصل ناظم کے نہایت نرم رویّے میں دیے گئے جوابات میں دونوں کو مسیحائی تاثرات محسوس ہوتے رہے! بلکہ وہ خود ہی ناظم کو یہ بتا چکے تھے کہ جب وہ مندر میں پھنس گئے تھے تب وہ بھگوان سے مدد مانگتے رہتے تھے! ناظم ان کی کیفیت بھانپ کر بھی، معاہدے کی شرائط کے تحت روک ٹوک نہیں سکتا تھا!

اُس روز ٹھیکیدار کو اپنی غفلت کا احساس تو ہوا تھا مگر کیا کر پاتا!

وہ ٹوٹے دل سے دعائیں کرتا رہا کہ میاں بیوی ناظم سے مدد نہ مانگ لیں! او
کوئی ایسا کرشمہ ہو جو رقم ایک لاکھ ڈالر سے کم نہ ہو جائے! ورنہ معاہدے کے مطابق اُس
نے جو میاں بیوی کو دینا ہے اس کے لیے اس کو اپنے اثاثے بیچنے پڑیں گے! کہیں اُس
لینے کے دینے نہ پڑیں!

لیکن بھگوان نے اس کی فریاد سن لی اور ناظم نے ساتویں دن مقابلے کو ختم کر کے میا
بیوی کو ٹھیکیدار کے سپرد کر دیا ہے اور ایک لاکھ امریکی ڈالر دینے کا یقین دلایا ہے!

آج اُس نے اپنے بینک سے، اپنے بھٹے کے لیے قرضے کی رقم کو، مکمل طور
نکال کر چیک لینے کی تقریب کو رنگین بنانے کے لیے، خرچ کیے ہیں! یہ سوچ کر کہ رقم
قعات سے بہت کم ہے مگر لاگت کے حساب سے بہت زیادہ!

ایک طویل انتظار کے بعد ناظم آچکا ہے! اس کے ساتھ پولیس ہے اور پولیس ک
گرفت میں، آنکھوں پر کالی پٹی باندھے ہوئے ایک نوجوان ہے جو چلا چلا کر یہ کہہ رہا ہے کہ
ایک سڑک چھاپ غنڈہ ہے کوئی دہشت گرد نہیں ہے! اُس نے ایک اجنبی کے کہنے پر دس ہز
روپے لے کر، اُسی کا دیا ہوا ایک بارود کا ایک گولہ، اُسی کی دکھائی گئی جگہ پر، پھینک چکا ہے!

پولیس نوجوان کے دعوے کو اُس صورت میں قبول کرنے کا یقین دلا چکی ہے اگ
وہ اجنبی کو پہچان سکے!

ناظم تذبذب میں ہے کیونکہ اگر نوجوان ایک دہشت گرد نہیں ہے تو ٹھیکدار
ساتھ کیے گئے معاہدے کے تحت وہ ایک لاکھ امیرکی ڈالر دینے کا پابند نہیں ہے! گو
حالات کی کروٹ ایک متاثر کن واقعے کو جنم دے سکتی ہے!

اچانک قریب سے نوجوان کو پہچان کر، اُس کی آنکھوں سے پٹی ہٹانے
پہلے، یعنی اپنی شناخت کرانے سے پہلے ٹھیکیدار اپنے ہی بوجھ سے زمین پر گر پڑا!

............☆☆☆............

گویا بقول لکشمی نارائن اگر مالتی یا مادھو مانگتے بھی رہتے تب بھی ایک سمندر کے پانی میں کمی نظر بھی نہیں آسکتی تھی! جبھی تو اُس نے اِس شرط کے بارے میں سوچا ہی نہ تھا! لیکن اسی شرط کی خلاف ورزی کرنے کی وجہ سے پانچویں دن کے اختتام تک انعام کی رقم فقط اسی فیصدی کٹ گئی تھی اور چھٹے دن صبح جب ٹھیکیدار کو یہ اطلاع مل گئی تھی تب اُس پر گویا برق گر پڑی تھی!

ہُوا یوں تھا کہ نئے گھر کے آرام دِہ ماحول میں نہ تو ان کو ایک دوسرے کو چھوٹی چادر سے بچانے کی کوشش کرتے ہوئے سردی سے ٹھٹھر ٹھٹھر کر جاگنا پڑا تھا! ورنہ وہ ایک خیمے کے اندر بوجھل آنکھوں کو آہٹ یا چاپ کی آوازیں سن کر کھلی رکھنے کی ضرورت تھی اس لیے وہ پہلی بار کچھ کھائے پئے بغیر ہی سو گئے تھے! پھر شام کو اچانک چارسُو پھیلے سناٹے میں، تاریکیوں کو چیرتی ہوئی، نظر نہ آنے والے جنگلی جانوروں کی آنکھوں کی چمک دیکھ کر وہ لرز اُٹھے تھے! پھر مدد کے لیے پہلی صدا دے چکے تھے!

جواباً ان کو بار بار اور ہر بار یہ بتایا گیا تھا کہ گھر کے اِرد گرد جو خاردار تار کی دیوار بنائی گئی ہے، اُس میں برقی دوڑ رہی ہے اس لیے کوئی بھی جنگلی جانور یا درندہ جان بوجھ کر یا اتفاقاً قریب آنے کی کوشش کرنے والا شکاری بھی برق کے جھٹکوں کی شدّت سے ڈر کر بھاگ جائے گا!

گویا جو اطلاع ایک بار مل کر باقی سوالات کو خارج کر سکتی تھی، میاں بیوی کی معصومیت اور فوری طور پر مدد نہ ملنے کی وجہ سے ایک سے پانچ مختلف خدمتوں کی شکل میں آ گئی تھی! جیسے تیار کھانے کے ڈبوں کو کھولنے کے لیے، ڈبوں کو گرم کرنے کے طریقوں کے بارے میں یا وڈیو دیکھنے کے بارے میں وہ ایک مدد سے جڑے ہوئے کئی سوالات پوچھ پوچھ کر مدد مانگ کر وہ ناظم کو اپنا ہمدرد سمجھ کر اپنے انعام کی رقم کو کم کرتے رہے!

دراصل ناظم کے نہایت نرم رویّے میں دیے گئے جوابات میں دونوں کو مسیحائی تاثرات محسوس ہوتے رہے! بلکہ وہ خود ہی ناظم کو یہ بتا چکے تھے کہ جب وہ مندر میں پھنس گئے تھے تب وہ بھگوان سے مدد مانگتے رہتے تھے! ناظم ان کی کیفیت بھانپ کر بھی، معاہدے کی شرائط کے تحت روک ٹوک نہیں سکتا تھا!

اُس روز ٹھیکیدار کو اپنی غفلت کا احساس تو ہوا تھا مگر کیا کر پاتا!

وہ ٹوٹے دل سے دعائیں کرتا رہا کہ میاں بیوی ناظم سے مدد نہ مانگ لیں! اور کوئی ایسا کرشمہ ہو جو رقم ایک لاکھ ڈالر سے کم نہ ہو جائے! ورنہ معاہدے کے مطابق اُس نے جو میاں بیوی کو دینا ہے اس کے لیے اس کو اپنے اثاثے بیچنے پڑیں گے! کہیں اُس کو لینے کے دینے نہ پڑیں!

لیکن بھگوان نے اس کی فریاد سن لی اور ناظم نے ساتویں دن مقابلے کو ختم کر کے میاں بیوی کو ٹھیکیدار کے سپرد کر دیا ہے اور ایک لاکھ امریکی ڈالر دینے کا یقین دلایا ہے!

آج اُس نے اپنے بینک سے، اپنے بھٹے کے لیے قرضے کی رقم کو، مکمل طور پر نکال کر چیک لینے کی تقریب کو رنگین بنانے کے لیے، خرچ کیے ہیں! یہ سوچ کر کہ رقم تو قعات سے بہت کم ہے مگر لاگت کے حساب سے بہت زیادہ!

ایک طویل انتظار کے بعد ناظم آچکا ہے! اس کے ساتھ پولیس ہے اور پولیس کی گرفت میں، آنکھوں پر کالی پٹی باندھے ہوئے ایک نوجوان ہے جو چلا چلا کر یہ کہہ رہا ہے کہ وہ ایک سڑک چھاپ غنڈہ ہے کوئی دہشت گرد نہیں ہے! اُس نے ایک اجنبی کے کہنے پر دس ہزار روپے لے کر، اُسی کا دیا ہوا ایک بارود کا ایک گولہ، اُسی کی دکھائی گئی جگہ پر، پھینک چکا ہے!

پولیس نوجوان کے دعوے کو اُس صورت میں قبول کرنے کا یقین دلا چکی ہے اگر وہ اجنبی کو پہچان سکے!

ناظم تذبذب میں ہے کیونکہ اگر نوجوان ایک دہشت گرد نہیں ہے تو ٹھیکیدار کے ساتھ کیے گئے معاہدے کے تحت وہ ایک لاکھ امیر کی ڈالر دینے کا پابند نہیں ہے! گویا حالات کی کروٹ ایک متاثر کن واقعے کو جنم دے سکتی ہے!

اچانک قریب سے نوجوان کو پہچان کر، اُس کی آنکھوں سے پٹی ہٹانے سے پہلے، یعنی اپنی شناخت کرانے سے پہلے ٹھیکیدار اپنے ہی بوجھ سے زمین پر گر پڑا!!

...........☆☆☆...........

شبنم قیوم

نام	:عبدالقیوم
قلمی نام	:شبنم قیوم
تاریخِ پیدائش	:۱۲؍فروری ۱۹۳۸ء سرینگر
تصانیف	:ناول ۳......افسانے مجموعے ۲......دیگر کتابیں ۸
افسانوی مجموعے	:(۱)ایک زخم اور سہی، (۲)نشانات
اعزازات	:بہترین ڈراما نویس ایوارڈ (۱۹۶۸)، بہترین کہانی کار ایوارڈ (۱۹۷۰)، کلچرل اکیڈیمی ایوارڈ (۱۹۷۶)، اُردو اکیڈیمی ایوارڈ (۲۰۰۷)
پتہ	:مدیر ہفت روزہ "قومی وقار"، پریس انکلیو پرتاپ پارک، سرینگر
فون نمبر	9419708493

☆......شبنم قیوم

کھوٹا سکہ

''میں اب تک کہاں تھا......؟ اور مجھے اس وقت کہاں جانا ہے......؟'' آپ اس کے بارے میں مجھ سے کچھ نہ پوچھئے صرف آپ اخبار ''نشانات'' کی فائل سے وہ اخبار نکلوائے جو لیکن...... تاریخ مجھے یاد نہیں اس میں وہ سنسنی خیز واقعہ درج ہے جب عبداللہ صراف کو دو برقعہ پوش عورتوں نے دن دھاڑے لوٹ لیا تھا۔

''یہ کب کا واقعہ ہے......؟''

اس واقعہ کو ابھی چند مہینے ہی ہو چکے ہیں جب دو برقعہ پوش عورتیں کہیں سے ایک معصوم بچہ چرا کر لائی تھیں۔ اُنہوں نے بچے کو مٹھائیاں اور کھلونے دے کر بہلایا تھا اور پھر اسے ریڈی میڈ قیمتی کپڑے پہنا کر وہ عبداللہ صراف کے پاس زیورات خریدنے آ گئی تھیں۔

''اچھا یاد آ گیا......؟ جنہوں نے تقریباً پچاس ہزار روپے کے زیورات پسند کر کے صراف سے کہا تھا۔ آپ ان کی ایک فہرست بنا دیجئے''۔

صراف نے فہرست بنا کر دی تو ایک عورت نے کہا تھا...... ''میں سامنے والی بلڈنگ میں جا کر والدین کو دکھا کر آتی ہوں۔ تب تک میرا یہ بچہ اور میری یہ بہن یہیں رہے گی۔

''ہاں کچھ دیر بعد اس عورت نے صراف سے کہا تھا۔ نہ جانے میری بہن کو واپس آنے میں دیر کیوں ہو گئی میں بچہ رکھ کر ابھی اُسے لے کر آتی ہوں''۔

''اور اس طرح دونوں عورتیں ایک کے بعد ایک کر کے ایسے چل دی تھیں کہ پھر کبھی واپس نہیں آئیں۔''

''بڑی چار سو بیس عورتیں تھیں وہ......لیکن آج آپ کو اس واقعہ کو دوبارہ دیکھنے کی ضرورت کیوں پڑی......؟''

''اس لئے کہ ایک عورت گرفتار ہوگئی ہے۔ شاید یہ وہی عورت ہو لیکن ابھی آپ اس خبر کی تشہیر نہ کریں جب تک کہ میں اس کی پوری تفصیل دیکھ کر نہیں آؤں۔ اس وقت اُس عورت کی تفقیش ہو رہی ہے۔ میں ابھی پولیس اسٹیشن جا رہا ہوں......''

آج صبح جب میں گھر سے نکلا تو راستے بھر چلتے ہوئے میں سوچ رہا تھا۔ یہ نامہ نگار ہونا بھی کیا مصیبت ہے۔ چند روز سے مجھے ''نشانات'' کے لئے ایک بھی سنسنی خیز واقعہ نہیں ملا ہے۔ نہ جانے ایسے واقعات کیوں عنقا ہو گئے ہیں۔ اب کہیں کوئی ایکسیڈنٹ ہی ہو جاتا، میں اسی کو نمک مرچ لگا کر ایڈیٹر کو دے آتا۔ وہ میرا ہی انتظار کر رہا ہوگا۔ کل اخبار کا سنڈے ایڈیشن نکلے گا اور آج......اتنے میں ایک بھکارن کی آواز سنائی دی۔

''بابا......! خدا کے لئے ایک پیسہ دیدیں۔ اس بچے کو اپنے بچوں کی خیرات دے دے......!''

میں ''معاف کرنا'' جیسا روایتی لفظ استعمال کر کے جا رہا تھا کہ مجھے اس کے بچے نے اپنی طرف متوجہ کیا جو ماں کی گود میں بلک بلک کر رو رہا تھا۔

معصوم بچے کی ٹانگیں نہ جانے کس طرح جل گئی تھیں۔ درد کی ٹیس سے وہ ماں کی گود میں طائر مجروح کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اس کی حالت مجھ سے نہ دیکھی گئی۔ میں جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک سکہ نکال کر ابھی اسے دے ہی رہا تھا کہ دوسری بھکارن حاضر ہوئی۔

''ایک پیسہ اس بچے کو بھی دے دے بھائی! دو دنوں کا بھوکا ہے۔ خدا آپ کے بچوں کو سلامت رکھے!''

''معاف کرنا میرے پاس اب کوئی پیسہ نہیں۔ میں آگے بڑھا وہ میرے پیچھے پیچھے چلی آئی اور ایک چونی کے لئے ایسی ایسی دعائیں دینے لگی گویا ساری خدائی اُسی کے ہاتھ میں تھی۔ میں اس کی یہ دعائیں ایک کان سے سن کر اور دوسرے کان سے اڑا کر جا رہا تھا

اور دیکھ رہا تھا۔ وہ گود میں لئے ہوئے بچے کو چٹکی سے کاٹ رہی تھی تا کہ یہ بھی اُس بھکارن کے بچے کی طرح روئے اور مجھے اسے پیسے دینے کے لئے ترس آئے۔ میں نے اسے کتنی بار کہہ دیا کہ میرے پاس کوئی پیسہ نہیں ہے مگر وہ ہرگز نہیں مانی اور میرے ساتھ کچھ اس طرح پیش آئی گویا میں اس کا مقروض تھا۔ میں اس سے چھٹکارا پا رہا تھا کہ وہ جلدی جلدی تیور بدل کر انکساری سے بولی۔

''ایک روپیہ دیدے بھائی!۔ آپ کا کچھ کم نہیں ہوگا۔ خدا آپ کو سات بیٹے دیگا'' میں ایک دم رک گیا اور بولا...... ''ایسی بد دعائیں نہ دو، تم کو معلوم نہیں آج کیا زمانہ اور کونسا دور ہے......؟ یہ فیملی پلاننگ کا زمانہ ہے۔ تم جیسے لوگوں کو اس زمانے کے ساتھ بدلنا چاہیے۔ اپنی پٹی پٹائی دعائیں بدلنی چاہیں کیونکہ پچھلے زمانے کی نیک دعائیں اس زمانے کی بد دعائیں ہیں۔ آئندہ کبھی تم کسی فیملی کے پاس پیسے مانگنے جاؤ گی تو تم انہیں کہہ دینا خدا کرے تمہارے زیادہ بچے نہ ہوں، پھر دیکھنا تم کو کتنے پیسے ملیں گے...... تم حیران مت ہونا یہ وقت کا تقاضا ہے''۔

''بھئی! ہماری بھکاری دنیا تو اس سے مختلف ہے'' بھکارن نے میری باتوں میں دل چسپی لیتے ہوئے کہا...... ''ہماری بھکاری دُنیا میں وہ مرد یا عورت بڑی خوش نصیب ہے جس کے پاس زیادہ بچے ہوں، چاہے وہ حرامی ہوں یا چوری کے''۔

''چوری کے......! کیا تم لوگوں کے پاس چوری کے بچے بھی ہوتے ہیں......؟''

''آپ میرا مطلب نہیں سمجھے......؟'' وہ میرا سوال گول کر کے بولی ''میرے کہنے کا مطلب ہے، کسی بھکاری یا بھکارن کے پاس بچہ ہونا ایک کاروبار ہونے کے برابر ہے۔ اب اگر بچہ بھوکا ہوگا۔ بیمار یا زخمی ہو تو اس بھکارن یا بھکاری کو ہماری دُنیا بڑی بھاگیہ وان سمجھتی ہے لیکن میری بدقسمتی سے نہ یہ بھوکا ہے نہ ہی بیمار اگر ایسا ہوتا تو اُس بھکارن کی طرح آپ نے مجھے بھی کچھ نہ کچھ دیا ہوتا''۔

''نہیں ایسی بات نہیں دراصل میرے پاس ریزگاری نہیں ہے۔ اس وجہ سے

میں کچھ دے نہ سکا......"

میں صرف آپ کی بات نہیں کرتی ، اُس بھکارن کی نسبت لوگ مجھے نظر انداز کرتے ہیں۔

اس لئے کہ اُس کا بچہ ایک مہینہ ہوا جل گیا ہے۔ اس ایک مہینے میں اگر اس کا علاج کیا گیا ہوتا۔ اس کے زخموں پر دوائی لگائی گئی ہوتی تو وہ اب تک ٹھیک ہو گیا ہوتا۔ لیکن وہ بھکارن ایسا نہیں کر سکتی ہے۔ ایسا کرے گی تو میری طرح اس کا کاروبار ماند پڑ جائے گا...... میں جانتی ہوں کہ وہ بچے کی تکلیف اور اس کی آہ وزاری کو دیکھ کر کلیجہ تھام کر رہ جاتی ہے۔ مگر وہ مجبوری ہے اس لئے کہ یہ وقت کا تقاضا ہے"۔

"بہت خوب......! تم تو فلسفیانہ باتیں کرتی ہو۔ آج پہلی بار میں ایک بھکارن سے ایسی باتیں سُن رہا ہوں"۔

"آپ کی باتوں میں اس زمانے کے لئے طنز دیکھ کر میں دل کی بات اُگلنے کے لئے مجبور ہو گئی اس لئے کہ آپ جیسے لوگ صرف ہمارے ظاہر کو دیکھ کر پیسے دیتے ہیں۔ باطن کو نہیں ...... اس بھکارن کو زخمی بچے کے کارن پیسے ملتے دیکھ کر میں چاہتی ہوں کہ میرے اس بچے کو بھی کچھ ہو جائے مگر جب اسے کچھ ہو جاتا ہے تو اس میں مر مٹتی ہوں۔ یہ جان کر بھی کہ یہ میرا اپنا بچہ نہیں ہے"

"اچھا...... یہ تمہارا بچہ نہیں ہے کیا......؟"

"نہیں، یہ میرا اپنا بچہ نہیں ہے۔ میں اسے کسی سے مانگ کر لائی ہوں اور اپنا جان کر اسے اپنا رہی ہوں......، یہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے" کہتے ہوئے اس نے بچے کے دونوں رخسار چوم لئے اور چلتے چلتے بولی "اب دیکھئے نا کچھ کتنی باتیں کروائیں آپ نے؟"

"پیسے بٹورنے کا تمہارے پاس بہت اچھا آرٹ ہے۔ ایسا آرٹ میں نے سبھی بھکارنوں میں نہیں دیکھا، میں سچ کہہ رہا ہوں تم کو بھکارن نہیں ہونا چاہیئے تھا تم جیسے عورت کو......

"کسی .... کی .... چاہیئے تھا......" بھکارن نے میری بات کو پورا کیا میں نے

اقرار کیا تو وہ بولی:

''اب دیجئے نا ایک روپیہ خدا آپ کو راجہ بنا دے گا''۔

اس کی یہ دعا میرے اندر سرایت کر گئی۔ میں اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اس وقت اس کا روپ میری نگاہوں میں مشکوک ہونے لگا۔ میری نیت متزلزل سی ہونے لگی۔ میں اسے ٹٹولنا چاہتا تھا کہ وہ پھر بولی ''آپ ایک روپیہ دینگے تو آپ کا کچھ کم نہ ہوگا''۔

''میرے پاس کوئی روپیہ نہیں۔ پھر کبھی دوں گا۔ اس وقت مجھے جانے دو!''

''آپ کے پاس روپے ہیں۔ مگر آپ دیتے نہیں۔ شاید آپ کو میرے اس بچے پر ترس نہیں آتا اگر یہ بات ہے تو...... آج میں صراف کے پاس ضرور جاؤں گی اور اسے زخمی کرا کے آؤں گی۔ پھر دیکھتی ہوں کون مجھے پیسے نہیں دیتا''۔

''عجیب انکشاف ہے......'' میں نے حیران ہو کر پوچھا...... ''صراف کے پاس کوئی زیور خریدنے یا فروخت کرنے جاتا ہے، نہ کہ بچے کو زخمی کرانے، اس کام کے لئے صراف کے پاس جانے کا مطلب......؟''

''آپ نہیں جانتے ہیں میں جب بھی اُس کے پاس بھیک مانگنے جاتی ہوں تو اس بچے کو دیکھ کر اس کے غصے کا پارہ ایسا چڑھتا ہے کہ اگر اس کا بس چلے تو وہ اس کی بوٹیاں نوچ ڈالے۔ وہ مجھے ہر بار کہتا ہے تم نے مجھے پھر کبھی اس منحوس کی شکل دکھائی تو اس کو میں جان سے ختم کر دوں گا''۔

وہ ایسا کیوں کہتا ہے......؟

''پاگل ہے بے چارہ! قصور اس کا اپنا ہے اور چھانٹا ہے اس معصوم پر''۔

''تم کس صراف کی بات کر رہی ہو......؟''

''......میں نام نہیں جانتی، امیرا کدل کے پار اس کی دُکان ہے۔ کوئی عورت اس سے ہزاروں روپے کی زیورات لے گئی تھی اور اس کے عوض اُسے یہ بچہ دے گئی تھی...... جب وہ اُس عورت کا پتہ لگانے میں ناکام ہوا تو اس بچہ سے چھٹکارا پانے کے لئے اُس نے اسے

پولیس کے حوالے کیا۔ جہاں سے میں نے اسے گود لے لیا۔

''اچھا تو یہی وہ بچہ ہے......اب میں سمجھ گیا۔

''نہیں......، آپ غلط سمجھ گئے......خیر جانے دیکھئے، اگر کچھ دینا ہے تو دیجئے خدا تمہارے بچوں کو سلامت رکھے''۔

''تم میرا پیچھا کہاں چھوڑو گی، چلو آؤ میرے ساتھ میں کسی دکاندار سے ریز گاری لیتا ہوں'' میں چل دیا اور وہ میرے ساتھ ہولی۔ میں دیکھ رہا تھا۔ وہ میرے ساتھ آنا بھی چاہتی تھی اور نہیں بھی آنا چاہتی......میں نے تھوڑی دور جا کر اسے پوچھا۔

''تم بھیک کیوں مانگتی ہو، اس سے تم کو ملتا کیا ہے۔ تم ایسا کوئی کام کیوں نہیں کرتیں جس سے تمہیں روز روز کے اس جھنجھٹ سے نجات ملے''

''کیا کریں گے ہماری قسمت ہی ایسی ہے، ویسے بھی یہ ہمارا موروثی پیشہ ہے''

''اگر تم چاہو گی تو تم اپنی قسمت بدل سکتی ہو''۔

''کیسے......؟''

''میں تمہیں راستہ دکھاتا ہوں۔ اس پر چل کر تمہیں کبھی بھیک مانگنے کی نوبت نہیں آئے گی!''

''میں سمجھتی ہوں آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ مگر مجھ سے ایسا نہیں ہوگا۔ میں بھوکے مرنا برداشت کروں گی۔ مگر کسی کو نہیں لوٹوں گی''۔

''تم نے یہ کیسے جان لیا کہ یہ تمہیں یہی ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں''۔

''ویسے ہی میری گود میں چوری کا بچہ ہے نا''۔

تم بہت ہوشیار عورت ہو، تم کو ہرگز بھکارن نہیں ہونا چاہئے تھا۔ تم دل کی بات چہرے پر پڑھتی ہو، میں تمہاری وسعتِ نظر کا قائل ہو گیا''۔

''بس اب زیادہ تعریف مت کیجئے۔ میری کوئی حیثیت نہیں''۔

''تمہاری کیا حیثیت ہے، وہ میں اچھی طرح جان گیا ہوں۔ میرے خیال میں تم

روز روز بھیک مانگنے کے بجائے ایک بار ایسا ڈاکہ ڈالو جو تمہارے جنم جنم کے کام آئے .....تم کو شاید معلوم نہیں، آج کل ایسی عورتوں کی بہتات ہے، جو نگر نگر گھومتی ہیں اور بڑے بڑے دکان داروں اور صرافوں کو لوٹتی ہیں۔ایسی عورتوں کی تلاش میں ساری انٹیلی جنس لگی ہے۔مگر وہ انہیں ایسا چکمہ دیتی ہیں کہ سب کے سب ہاتھ مل کے رہ جاتے ہیں۔ایسی عورتوں نے بڑے بڑے مرد ڈاکوؤں کو بھی پچھاڑ دیا ہے''۔

''اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت جو کوئی بھی کام کرتی ہے وہ بڑی ہوشیاری سے کرتی ہے۔عورت کو سمجھنا بہت مشکل ہے''۔

''مگر تم کو سمجھنا زیادہ مشکل نہیں ہے''۔میں متبسم ہونٹوں سے بولا۔

وہ جھیپ سی گئی۔میں آگے بڑھتے ہوئے کہا''تم ایسی عورت ہو جو دوسروں کے چہرے سے ان کے اندر کا حال دیکھنا جانتی ہو۔تم دوسروں کی باتوں میں چھپا ہوا طنز دیکھنا بھی جانتی ہو۔تم عورت ذات کی فطرت سے بھی واقف ہو اور بھکاری زندگی کا فلسفہ بھی جانتی ہو۔تم حاضر جواب بھی ہو اور اپنے دل کا مدعا اشاروں میں بیان کرنے میں بھی مہارت رکھتی ہو......، میں سچ کہہ رہا ہوں۔مجھے تمہاری جوانی پر ترس آتا ہے۔میرا مشورہ مانو تو تم کسی سے شادی کرلو!

''میں نے اب تک کتنی جگہ ایسی قسمت آزمائی کی مگر...... مجھے پھر اسی زندگی میں لوٹ آنا پڑا''

میں چند قدم آگے بڑھ کر بولا

''اگر تم نوکری کرنا چاہتی ہو تو میں تمہیں ایک ایسی جگہ لگا دوں گا۔جہاں تمہیں اچھی تنخواہ ملے گی......اچھا کھانا، پینا ملے گا......وہاں تم بڑے عیش و آرام میں ہوگی۔

''کہاں......؟''

جہاں میں تم کو لے جاؤں گا.....آؤ تم میرے ساتھ!''

ہم دونوں اکٹھے جا رہے تھے۔میں دیکھ رہا تھا وہ بے دلی سے میرے پیچھے پیچھے

چلی آرہی تھی......راستے چلتے ہوئے نہ جانے وہ میرے بارے میں کیا سوچ رہی تھی۔مگر میں اس کے بارے میں یہی سوچ رہا تھا۔اگر اسے ڈپٹی انسپکٹر جنرل آف پولیس کے ہاں نوکری مل گئی تو اس کی زندگی بدل سکتی ہے۔اُنہوں نے ایک آیا کی ضرورت کا اشتہار مجھ سے ہی اخبار میں دلوایا تھا۔نہ جانے وہ جگہ ابھی تک خالی ہوگی یا نہیں......اس وقت وہ دفتر میں ہی ہوگا۔لہٰذا ہمیں وہاں ہی اُس سے ملنا چاہئے''۔

ان ہی خیالات میں چلتے بڑھتے جب میں پولیس اسٹیشن کے اندر جانے لگا۔تو میں نے دیکھا بھکارن کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔اس کے دل کی دھک دھک کی آواز سنائی دے رہی تھی۔اس کے جسم میں تھرتھراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔میں اس کی کمزوری اور بزدلی پر مسکرایا اور بولا......''تم کیوں گھبراتی ہو، میں تم کو پولیس اسٹیشن کے اندر لے جاؤں گا۔آؤ تم میرے ساتھ!''

میں گیٹ سے اندر آ کر آگے بڑھ رہا تھا...... میں نے مڑ کر دیکھا۔بھکارن بچہ سڑک پر رکھ کر بھاگ رہی تھی...... بھکارن کو اس طرح بھاگتے دیکھ کر پہلے میں اس کی بزدلی اور معصومیت پر مسکرا دیا لیکن...... یکا یک میرے دل میں ایک خیال کوند گیا ہو نہ ہو اس کے دل میں ضرور چور ہے......اس کو شاید شک ہوا ہے۔میں اسے چالبازی سے یہاں لایا ہوں، اب یہ مجھے گرفتار کروائے گا......دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ورنہ یہ بچے کو یہاں سڑک پر رکھ کر نہیں بھاگ جاتی۔میرے خیال میں یہ کوئی بھکارن نہیں ہوگی۔ایسی عورتوں پر کوئی بھروسہ نہیں۔اس کی باتیں ویسے بھی مشکوک تھیں۔مجھے اس کو فوراً گرفتار کروانا چاہئے۔

گرفتار کر کے جب اسے تفتیش روم میں لایا گیا تو میں اس کی اطلاع ایڈیٹر ''نشانات' کو دینے گیا تھا......اب جب کہ میں واپس دوبارہ پولیس اسٹیشن آ گیا۔تو ڈی آئی جی نے مجھے مبارکباد دیتے ہوئے کہا:

''آپ نے آج وہ کمال کر کے دکھایا جو بڑے بڑے جاسوس بھی نہیں کر پاتے ہیں......آپ کو شاید یہ جان کر حیرت ہوگی۔اس عورت کی جامہ تلاشی سے تین بٹوے۔

دورسٹ واچ پر آمد ہوئے۔ اس کا کہنا ہے، وہ آپ سے بھیک مانگنے کی آڑ میں آپ کی جیب کاٹنے کے لئے آپ کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ آپ کے ساتھ باتیں کر رہی تھی اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوگئی......"

"یعنی......؟ میں نے بے اختیار ہو کر پوچھا۔

ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس نے اُٹھ کر مجھے میری وہ کٹی ہوئی جیب دکھائی جس میں سے سب کچھ نکالا گیا تھا۔ میں ہکا بکا ہو کر ان کی طرف دیکھ رہا تھا کہ انہوں نے کہا......

"اس نے نہ صرف عبداللہ صراف کو لوٹنے کا اقرار کیا ہے بلکہ اس نے ایسے بہت سے کارنامے کئے ہیں۔ اس کے ساتھ ایک بہت بڑی گینگ کام کر رہی ہے جن کی گرفتاری اس وقت دھڑا دھڑ ہو رہی ہے۔ یہ سارا کارنامہ آپ کا ہے۔ اس کے صلہ میں ہمارے ڈیپارٹمنٹ کی طرف آپ کو ایک اچھی نوکری کی آفر کی جائے گی۔

شکریہ......! نوکری کی بات فی الحال رہنے دیجئے مجھے اس وقت اخبار کا کالم لکھنا ہے۔ کل ہمارے اخبار کا سنڈے ایڈیشن ہے۔

............☆☆☆............

حسن ساہو

نام :حسن ساہو

تاریخِ پیدائش :۷/اکتوبر ۱۹۳۴ء سرینگر

افسانوی مجموعے :پھول کا ماتم (۱۹۷۴)،

بستی بستی صحرا صحرا (۱۹۸۱)

اندھا کنواں (۱۹۹۶)

گردشِ دوراں (۲۰۱۱)

مصروفیت مدیر ہفت روزہ ''گردشِ دوراں'' سرینگر

پتہ :ہمدانیہ کالونی بمنہ، سرینگر

فون نمبر :9906439491

☆......حسن ساہو

گزرگاہ

دسمبر کی آخری رات!

فضا خاموش تھی اور تاریک رات کے سیاہ فام سائے پھیل رہے تھے۔ البتہ گلستان کلب کی وسعتوں میں اِس سکون، تاریکی اور سردی کو کوئی وقعت نہ تھی۔ کلب کی بسیط گود میں شور وغل کے علاوہ ضیا پاشی اور حرارت کی شمعیں اب بھی آب وتاب کے ساتھ روشن تھیں۔

آس پاس کی پھیلی دُنیا ساکت پڑ جانے پر گلستان کلب کی رنگ رنگیلی نگری میں ہر طرح کی رعنائی رس بس جاتی ہے۔

سیاہ اور گھنے بادل گویا چھٹ گئے۔

اندھیرا غائب ہو گیا اور آن کی آن میں ہر سُو چاندنی کے سائے منڈلانے لگے...... کلب ہال کے وسطی گوشے کے ڈائس پر پیانو، بربط، نقارہ اور دیگر جدید طرز کے آلاتِ موسیقی لئے سازندے سریلے اور دھیمے دھیمے راگ الاپ رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے سرور کی مستی و دل آویزی چاروں اطراف بکھر گئی......اور گوہر جان تمام رعنائیوں کے ساتھ رونق افروز ہوئی۔ اس کی پریشان زلفوں کے مقابل شاخِ سنبل اور برسات کی کالی رات ہیچ تھی۔

ہال میں دفعتاً خاموشی چھا گئی۔ ہر ایک کی نظروں کا مرکز شہ نشین بنا تھا جہاں گوہر جان کی حنائی انگلیاں پیانو پر ناچ رہی تھی۔

گوہر جان جوان تھی۔ اُس کی جوانی کی طرح اُس کا رقص بھی جوان تھا۔ اُس کی

ہر تھر کن ہر طرف دِل کشی کے نقوش بکھیر رہی تھی۔

سر بمہر بوتلوں کے کاگ اڑ رہے تھے۔ گلاس اور جام خالی ہوتے گئے، مُرغِ مسلّم کے پکوان بانٹے جا رہے تھے اور گوشۂ راست میں باون پتوں کی اٹھک بیٹھک جاری تھی۔

گلزار حسبِ عادت ہال کے درمیانی گوشے میں تسلط جما گیا۔

پنیر کا ٹکڑا مُنہ میں ڈالے اور کافی کی بھرپور چسکی لئے وہ گوہر جان کے کتابی چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے لگا اور پھر ایک نظر کلب کے مکینوں کی جانب ڈال دی۔ اِس سرے سے اس سرے تک تاکا...... عجیب سا لگا اُسے۔

ہر طرف خوشی...... مسرت اور شادمانی...... ہال کی وسعتوں میں نغمہ گونج رہا تھا۔

جام ٹکرا رہے تھے۔

گلزار نے کافی کا پیالہ ہونٹوں سے لگایا۔

رقص...... نغمہ...... شراب...... کباب اور پھر گرنا سنبھلنا۔

گلزار سوچوں کی دُنیا میں کھو گیا...... اُسے محسوس ہوا جیسے یہ کلب ہال شراب کا ایک جام ہے...... لحظہ بہ لحظہ اِس جام میں آس پاس کی دُنیا سما گئی...... ساری دُنیا پوری کائنات......

اور ہزاروں کروڑوں انسان کیڑے مکوڑوں کی طرح اِس جام میں تیرنے ڈوبنے لگے...... گلزار بغور جائزہ لینے لگا۔

باپ کی شفقت ڈوب رہی تھی۔

شریکِ حیات کا وعدہ اور پیار غرق ہو رہا تھا۔

فرائض کی مورتیاں غوطے کھا رہی تھیں اور

بھروسہ اور اعتبار خس و خاشاک کی صورت اِدھر اُدھر تیر رہے تھے۔

"گلزار کہاں کھو گئے ہیں آپ"

جام نظروں سے اور پھر ہاتھوں سے گر گیا، گر کر چکنا چور ہو گیا۔

اور پھیلی دُنیا سمٹ گئی۔ اب ہال تھا اور گلزار کے مقابل گوہر جان۔

وقفہ ہو چکا تھا اور آج بھی گوہر گلزار کے پاس آ بیٹھی۔ گوہر جان اتنا جان گئی تھی کہ گلزار شہر کے بلند پایۂ کہانی کار ہیں۔ نفرت اگر ہے تو سگریٹ اور شراب سے اور رغبت کافی کے ساتھ۔

''گلزار تم سوچ کیا رہے ہو''۔

گوہر ایک بار پھر قفلِ سکوت توڑتے، پھسلتے پھسلتے آپ کی جگہ تم پر اُتر آئی۔

''سوچ رہا ہوں یہ دُنیا دوسروں کے لئے کتنی دل کش اور حسین ہے اور اپنے لئے کس قدر پھیکی اور بے جان''

''گلزار تم خوبصورت تصورات اپنائے رکھنے کی سعی کرو۔ دُنیا تو دُنیا، تمہیں یہ جگہ بھی دل کش نظر آئے گی۔ سب کچھ حسین لگے گا......میری جانب دھیان دو''

''تمہارا خیال ہے میں تمہیں حسین سمجھوں'' گلزار بے تامل کہہ اٹھا۔

''کیا میں خوبصورت نہیں''، گوہر جان نے اِستفارانہ رویہ اپناتے ہوئے بیئر کا ادھ بھرا گلاس حلق سے انڈیل دیا۔

''تم......تم تو مصنوعیت سے لبریز زندہ مورتی ہو۔ تم اور تمہارے حسن میں حقیقت اور اصلیت کو دخل نہیں''۔ گلزار برس پڑا۔

''گلزار، تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ میں ہزار ہا روشن قمقموں کی چمک دمک کو خاطر میں نہ لا کر تمہارے چھوٹے سے دیئے کی لو کے قریب آ بیٹھتی ہوں۔ اس لئے کہ مجھے تمہارے پاس بیٹھنا اور تم سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے۔

......میں گلزار تمہیں چاہتی ہوں''

''ایک مفلس کہانی کار کو جُل دینے سے تمہیں کیا ملے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ دولت و شہرت والی عورت کا دِل کسی ایک کا نہیں ہو سکتا''۔ گلزار کا احساسِ کمتری جاگ گیا۔

''نہیں گلزار! نہیں، تم نے مجھے غلط سمجھا ہے

گوہر جان کی آواز میں عجز و انکساری تھی..... گلزار بے تامل کہہ اٹھا ''کیا اس میں صداقت نہیں کہ تمہیں ایک عالیشان بنگلہ کی آرزو ہے، ایک موٹر کار کی ضرورت ہے، آسائش و آرام کی چاہ ہے..... یہ سب میرے پاس نہیں..... تمہارے لئے سب کچھ پیسہ اور سونا چاندی ہے''

''تم کتنے پتھر دل ہو''

یہ کہہ کر گوہر جان پھر سے ڈائس پر براجمان ہوئی اور کلب ہال میں پھر سے زندگی لوٹ آئی۔

گوہر جان کے رقص اور نغمہ ہائے دل نواز نے کلب ہال کے ساتھ آس پاس کے ماحول کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا..... ایک مختصر عرصہ میں گوہر نے ہر معزز گھرانے کے چشم و چراغ کو اپنی جانب متوجہ کر دیا۔

کلب ہال معمول سے بڑھ کر کھچا کھچ بھرنے لگا۔ اکثر افراد کی نگاہیں گوہر جان کے جسم پر جم کر رہتی تھیں۔ گویا ایک مطربہ ہال میں بیٹھے تمام حضرات کی توجہ کا مرکز بنی تھی۔ مگر اُن سب سے بے نیاز خود مطربہ کی توجہ کا مرکز گلزار تھا جسے لوگ حقارت بھری نظروں سے تا کا کرتے۔ بعض تو اتنا بھی کہہ گئے کہ ''اِس قلاش کا کلب میں کیا کام''؟

اگلے روز گلزار وقت سے پہلے ہال کی زینت کافی کی گرم گرم بھاپ سے بڑھا گیا اور گوہر جان بجی دھجی گلزار کے روبرو آ بیٹھی۔ گلزار نے ترچھی نگاہوں سے گوہر جان کو دیکھنا شروع کیا جو قیامت سے کم نہ لگ رہی تھی۔

''آج کل کون سی کہانی لکھی جا رہی ہے''۔ گوہر نے قفلِ سکوت توڑا۔

''کہانی! کچھ بھی نہیں..... دراصل آج کل اپنی ہستی ایک کہانی لگ رہی ہے''۔ گلزار نے بات کو کاٹنا چاہا۔

''گلزار! تمہیں ہوا کیا ہے۔ جب دیکھو بہکی بہکی سنائے جاتے ہو۔ خود اعتمادی کی شمع روشن کیئے ہوئے لکھنا شروع کرو، اُن شرفا کی

کہانیاں جو سماج کی چار دیواری پھاندے یہاں سب کچھ حتیٰ کہ اپنی آبرو تک داؤ پر لگانے آجاتے ہیں......وہ یہاں آکر سب کچھ فراموش کر جاتے ہیں......اپنا وقار اور اپنا مرتبہ سب بھول جاتے ہیں......گلزار میری آنکھوں میں جھانکنے اور کھنگالنے سے تمہیں بہت سی کہانیاں ہاتھ آئیں گی......میری زندگی بھی ایک کہانی ہی ہے۔ اِسے لِکھو"

"تمہاری اور کلب ہال کی کہانی......تم چاہتی ہو کہ زوال پذیر داستان کو ضبطِ تحریر میں لاکر اپنے فن کے ساتھ ظلم کروں!

یہ مجھ سے نہ ہوگا۔ میں ملمع سازی اور حقیقت کی بیخ کنی کرنے سے رہ گیا"......گلزار کہتے کہتے چپ سا ہوا۔ "گلزار آخر تم چاہتے کیا ہو۔ کیا مجھ میں کسی چیز کی کمی ہے۔ اتنے کٹھور تو نہ بنو"۔ گوہر کے لہجے میں ترشی جھلک رہی تھی۔ "مجھے غلط نہ سمجھو......دراصل ظاہری لوازمات سے قطع نظر روح کی گہرائیوں میں اُترنا چاہتا ہوں......میں دیکھ رہا ہوں کہ اِن خوبصورت آنکھوں کے عقب میں دھنسے کٹورے اور رسیلے ہونٹوں کے پیچھے سمٹے دائرے ڈیرا جمائے بیٹھے ہیں......گوہر تم پسِ منظر کا نظارہ نہیں کر سکتی"......تمہیں......

"تم واقعی نادان اور پتھر دِل ہو"......گوہر نے بات کاٹ لی اِس سے قبل کہ گلزار جواب میں لب ہلا دیتا۔ کلب کے مالک چودھری گلاب دین اچھی قد و قامت رکھنے والے نوجوان کے ہمراہ نمودار ہوئے۔

"یہ رہی اِس کلب کی روحِ رواں......مشہور سنگر اور ڈانسر گوہر جان......اور یہ ہیں میرے بیٹے گلریز احمد......آج ہی باہر سے اعلیٰ تعلیم مکمل کر کے آئے ہیں"

''بہت خوشی ہوئی آپ سے مِل کر''...... یہ گلریز تھا۔

گوہر جان اندازِ دِگر کے ساتھ گلریز کو گھورنے لگی اور ذرا توقف کے بعد اُس کی حنائی انگلیاں پیانو پر تھر کنے لگیں۔

وقت کا پرندہ پرواز کرتا گیا۔ اب تو وقفہ ہونے پر بھی گلزار اکیلا رہا کرتا تھا...... گوہر جان گلزار چھوڑ کر گلریز کی صحبت اپنانے لگی۔ وہ ایک دوسرے میں دلچسپی لینے لگے...... جوان ہونے کے ساتھ ساتھ دونوں کی اُمنگیں جوان تھیں اور پھر پینے پلانے کا شوق بھی مشترکہ تھا۔ بہت جلد وہ دونوں اِس قدر گھل مِل گئے جیسے دیرینہ جان پہچان ہو......

ایک شام وقفہ کی پہلی گھنٹی بجتے ہی گوہر ہشاش بشاش گلزار کی بغل والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''خوشی سے پھولے نہیں سماتی ہو۔ کوئی خاص بات'' گلزار نے پہل کی

''بات ہی کچھ ایسی ہے گلزار۔ اب زندگی مجھے حسین لگتی ہے''۔

''یہ آسودہ حال کلب اور زندگی حسین نہ لگے۔ ویسے بھی تمہارے لئے زندگی بے کیف کب تھی''۔

''گلزار تمہیں کسی کی دلِ شکنی کا ذرہ بھر لحاظ نہیں رہتا''...... یہ گوہر تھی

''گوہر میں مُنہ پھٹ ہوں لیکن حق کی بات کرتا ہوں۔ اگر واقعی زندگی کا اصلی روپ دیکھنے کی تمنا ہے تو کلب ہال سے باہر نکل جاؤ۔ اِس گندے ماحول میں رہ کر زندگی کو حسین بتانا بے کار ٹھہرا۔ اِس کلب کی رنگ رلیوں کو اپنی کائنات تصور کر کے اپنی زندگی پر ظلم نہ کرو...... گوہر یہ رنگینی و جوانی وقتی ہے۔ اِس کلب کی کسی شئے کو ثبات حاصل نہیں، بقا کا ساتھ نہیں''۔

گلزار اتنا کہہ کر آس پاس کا جائزہ لینے لگا۔ گوہر شہہ نشین کی طرف بڑھ گئی۔

گوہر جان کی مخمور جوانی، مست کر دینے والے رقص اور دل پذیر نغموں نے اُسے

خوب شہرت بخشی...... بیشتر شریف زادے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگے۔ نواب صاحب گوہر جان کی شان میں قصیدے سنانے لگے اور تو اور خود کلب کے مالک چودھری گلاب دین بھی اُسے چاہنے لگے...... وہ چاہتے تھے کہ ایک گھڑی ہی سہی وہ گوہر جان کی آغوشِ محبت میں گزار دے...... دن گزرنے کے ساتھ ساتھ چودھری کی چاہت بھی بڑھتی گئی۔

آخر کار دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس چاہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا بیڑا اُس نے اُٹھالیا۔ سب سے پہلے اپنے لاغر جسم میں تازہ روح پھونک دینے کی خاطر بوتل کا سہارا لیا۔ پیگ پر پیگ چڑھائے اور بھول گئے کہ وہ اِس کلب کے مالک ہیں۔ وہ یہ بھی فراموش کر گئے کہ اُن کی اپنی بیٹی گل جانہ بھی گوہر کی طرح جوان ہے۔

الغرض ِگرتے، سنبھلتے اور لڑکھڑاتے لڑکھڑاتے بڑی رات گئے گوہر کے کمرۂ شب باشی کا رُخ کیا...... دروازہ پر دستک دی اور گوہر جان نے اِس خیال سے کہ ماما ہوگی چٹخنی گرادی۔

"آپ"

"ہاں گوہر میں ہوں۔ آخر تمہارے حسن کی کشش نے مجھے یہاں آنے پر مجبور کیا...... گوہر میں تمہارے رقص کو اکیلے میں دیکھنا چاہتا ہوں...... کب سے چاہا تمہیں اپنے حال سے باخبر کردوں...... تم پاس آؤ گوہر...... یہ دل لگی اچھی نہیں"۔

چودھری کا غیر متوقع رویہ بھانپ گوہر جان حیرت میں تھی۔ وہ کچھ ترکیب عمل میں لانے ہی والی تھی کہ چودھری نے امرجنسی کا بلب کا سوئچ آن کر دیا۔ کمرہ روشن ہوا۔ چودھری کی بے سدھ نگاہیں کمرے کا طوائف کرنے لگیں۔ اُس کی بے ترتیب نظریں بغل میں پڑے پلنگ پر جم کر رہ گئیں...... اُس کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔

ہوش و حواس کی نگری میں تلاطم بپا ہوا اور پاؤں تلے سے مانو زمین کھسکنے لگی۔ اُس نے پھر جھانکا...... پلنگ پر مست خرام اُس کا بیٹا گل ریز پڑا تھا...... چودھری کے قدم لڑکھڑا

گئے۔ سر چکرا گیا اور کچھ کہے بِنا کمرے ۔سے باہر آیا۔

صبح یہ خبر شہر کے ہر چھوٹے بڑے چوراہے پر بحث و تمحیص کا موضوع بن چکی تھی کہ گوہر جان اور گلریز احمد فرار ہو گئے ہیں۔

سب لوگوں کے لئے اِن دونوں کا غائب ہونا ایک معمہ بنا رہا۔ چودھری صاحب کی حالت ابتر......وہ زیادہ وقت بنگلے پر ہی گزارنے لگے۔

کچھ عرصہ بعد گلزار کو اچانک گوہر جان کا خط ملا۔ لکھا تھا

"تم نے کہہ دیا تھا کہ میں گندے جال میں پھنسی ہوں۔ اب میں اِس جال یا کھڈ سے باہر آ گئی ہوں......اور ایک ایسی دُنیا میں آ گئی ہوں جہاں زندگی کو اصلی روپ میں دیکھ رہی ہوں۔ اپنے شوہر گلریز کے ساتھ میری ہنسی خوشی کٹ رہی ہے......اب تو تمہیں میری کہانی تحریر کرنے پر اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔ اٹھایئے قلم اور کیجئے کاغذ داغدار۔ زندگی نے ساتھ دیا تو پھر یاد کروں گی"

گلزار نے خط کو کئی بار پڑھ لیا۔ انگشتِ شہادت دانتوں میں دبائے سوچنے لگا۔

گوہر کو گلریز مل گیا......گلریز کی شریکِ حیات......اور میں اتنا برگشتہ بخت ٹھہرا کہ منزل کو اپنے قرین پا کر بھی حاصل نہ کر سکا......کاش مجھے بھی ایک گوہر مل جائے جسے موٹر کار یا عالیشان بنگلہ کی چاہت نہ ہو...... کاش مل جائے......اور میری غریقِ ظلمت گزرگاہ کو بے لوث محبت کے اُجالے سے روشن کر دے......کاش......

............☆☆☆............
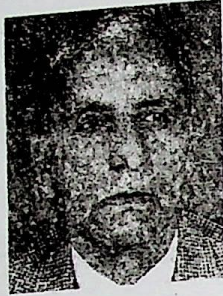
خالد حسین

نام	:خالد حسین
تاریخ پیدائش	:یکم اپریل ۱۹۴۵ء
جائے پیدائش	:اُدھمپور جموں
افسانوی مجموعے	۱) ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں
	۲) اشتہاروں والی حویلی
	۳) ستی سر کا سورج
پتہ	:بھٹنڈی جموں، نزدیک گورنمنٹ اسکول
پن کوڈ نمبر	181152
فون نمبر	9419183485

☆......خالد حسین

پسِ دیوار

ہر شخص دیواروں کا محتاج ہوتا ہے۔ دیواریں......تعلقات کے بیچ کھڑی کرنے کے لیے۔ کمپلیکس کے سرابوں میں حفاظت سے اُڑان بھرنے کے لیے۔ دیواریں، مقصد پورا کرنے کے بعد مکارانہ فطرت کی تسکین کے لیے......اور دیواریں...... بہار رُت کو گونگی اور اندھی خزاں سے بچانے کے لیے...... دیواریں شبنم کے قطروں کے بچاؤ کے لیے، جو ہاتھ لگتے ہی اپنی دوسیز گی گنوا بیٹھتے ہیں......اگر بہار رُت کو دیوار کا سہارا نہ ملے تو اِس کا بھی وہی حشر ہوگا جو آج اُس عورت کا ہے جس کے بے حس جسم کو کوّوں نے بُری طرح نوچ ڈالا ہے۔ اِس نے بڑی مُشکل سے کوّوں کو اپنے جسم سے اُڑایا ہے لیکن کوّے پھر کوّے ہیں۔ وہ لاوارث جسم کو دیکھ کر چیلوں اور گِدھوں کو بھی دعوتِ طعام دے دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عورت بھی ایک دیوار کی محتاج ہے۔ بہت زیادہ محتاج......فطرت یزداں کی طرف سے اِنسان کے لیے بخشش ہے...... اِس لیے فطرت تبدیل نہیں ہوا کرتی۔ گوشت کو نوچنا کوّوں کی فطرت ہے اور دیوار کی خواہش کرنا ہر عورت کی فطرت......امّاں حوّا کے سفر سے لے کر اس عورت کے سفر تک اِس فطرت کی کرم فرمائی کی کئی کڑیاں ہیں......اِن کڑیوں میں اُلجھ کر وہ عورت بھی مُرادوں کی منزل سے کوسوں دور رہی ہے۔ پنج تنتر میں ہے:

''ایک خونخوار شیر بوڑھا ہونے پر گلے میں مالا ڈال کر پرہیزگار بن گیا اور جنگل کے ایک کونے میں بیٹھ کر پرماتما کی عبادت کرنے لگا۔ جب کوئی اکیلا شیر کے پاس نیاز حاصل کرنے کے لیے آتا تو وہ اُسے ایک ہی جھپٹے میں ہلاک کر کے اپنا نوالا بنا ڈالتا۔ ایک دفعہ ایک بلّی نے شیر کے ڈھونگ کا پردہ فاش کر دیا۔ وہ شیر کی ٹوہ میں اُدھر سے گزری کہ

اچانک اُسے ایک کنویں سے ہڈیوں کی بو آئی۔ اِس نے جب کنویں میں جھانکا تو اُسے شیر کی کرتوت کا پتہ چل گیا۔"

یہ قصہ تو بہت پُرانا ہے لیکن الفاظ ترو تازہ ہیں۔ اِن میں صدیوں پُرانے لباس کی باس نہیں ہے۔ پرہیز گاری کی آڑ میں بوڑھے شیر آج بھی شکار کھیلتے ہیں اور وہ عُمر رسید فنکار جس نے اِس عورت کو سب سے پہلے شکار بنانے کے لیے اپنے فنکارانہ ترکش سے مُنقش تیر پھینکا تو وہ سیدھا اُس کے سینے میں پیوست ہو گیا۔

"تم بہت خوبصورت ہو۔ ہونہار ہو۔ قابل ہو۔ ہر موضوع پر کُھل کر بات کر سکتی ہو۔ تمہارا مطالعہ وسیع ہے۔ آج کی نوجوان نسل میں اِس چیز کی بہت کمی ہے، خاص کر لڑکیوں میں۔ بی اے، ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈِگری ہوتے ہوئے بھی موجودہ نسل صحیح ڈھنگ سے گفتگو نہیں کر سکتی۔ کسی بھی موضوع پر بات کریں، آپ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو کورا ہی پائیں گے...... ایسے ماحول میں تم جیسی لڑکی کو دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ یہ تمہاری قابلیت کا نتیجہ ہے کہ آج اعلیٰ سرکاری عہدہ پر براجمان ہو"۔

"جی شکریہ! دراصل اِس میں ماحول کا بھی بہت دخل ہوتا ہے۔ میرے والد مُلک کے مشہور وکیل تھے۔ اُنہیں ادب، فلسفہ اور تاریخ سے خاص لگاؤ تھا...... میں بچپن سے ہی درسی کتابوں کے ساتھ ساتھ وہ کتابیں بھی پڑھ لیا کرتی تھی جو میرے والد پڑھنے کے لیے لاتے تھے۔ اِن کی ذاتی لائبریری میں دو ہزار سے بھی زائد کتابیں ہیں...... میرے بھائی ایک مشہور انجینئر ہیں۔ مُلک کی دشوار گزار سڑکیں اِنہی کی نگرانی میں تعمیر ہوئی ہیں۔ اِس کے علاوہ وہ ایک ماہر آرکیٹیکٹ ہیں۔ ہمارے شہر کی فلک بوس عمارتوں میں کم از کم ایک چوتھائی کے نقشے اُنھوں نے بنائے ہیں...... مجھے تاریخ اور فلسفے سے بے حد دلچسپی ہے"۔

وہ باتیں کر رہی ہے...... بوڑھے فنکار کی ماہر نظریں اِس کے جسم کے ایک ایک زاویے کو ٹٹول رہی ہیں۔ اُس کی آنکھوں کے اندر چھپی ہوئی بھوک، تڑپ، آرزو...... پلکوں پر آ جاتی ہے اور کبھی کبھی پلکوں سے باہر بھی جھانک لیتی ہے۔

''اِس سرکاری عہدے پر میں میرٹ کی وجہ سے آئی ہوں۔ میں نے کمپٹیشن میں حصہ لیا اور ٹاپ کیا...... باقی آپ کی حوصلہ افزائی کا شکریہ۔ ہاں! آپ کے بیٹے کا کیس منظوری کے لیے بھیجا ہے۔ ہم نے سفارش کر دی ہے کہ آپ کا بیٹا آنتوں کا ماہر ڈاکٹر ہے اور مزید تعلیم کے لیے امریکہ جانا چاہتا ہے۔ چنانچہ ہمیں اِس کی خواہش کو دبانا نہیں چاہیے بلکہ اِسے جانے کی اجازت دے دینی چاہیے تاکہ واپس آنے کے بعد وہ اپنے دیش واسیوں کی بہتر سیوا کر سکے''۔

''مِس نازیہ! اِسے ملو، یہ میرا بیٹا ہے۔ ڈاکٹر ہندال حیدر۔ کل اِس کا جنم دِن ہے۔ ہم تمھیں انوائٹ کرنے آئے ہیں۔ کل رات تم ڈِنر ہمارے ہاں ہی لوگی۔ میں نے اپنے گھر کا ایڈریس تو تمھیں بتا ہی دیا ہے''۔

''لیکن......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ میں نے اپنے بیٹے سے تمہارا کئی بار ذکر کیا ہے۔ یہ بھی تم سے ملنا چاہتا تھا...... اِس لیے یہ بھی ساتھ چلا آیا...... اِس طرح تعلقات بڑھتے ہیں...... ہاں تم اپنے بڑے بھائی انجینئر صاحب کو بھی ساتھ لیتی آنا''۔

تعلقات بڑھتے گئے۔ آخر ایک دِن بوڑھے فنکار کا چلایا ہوا تیر ٹھیک نشانے پر جا لگا۔

''مِس نازیہ! ہم چاہتے ہیں کہ تم ہمیشہ کے لیے ہمارے قریب آ جاؤ۔ میرا بیٹا تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ تمھیں بہت پسند کرتا ہے۔ دِل و جان سے چاہتا ہے۔ میری پسند بھی صرف تم ہی ہو...... تم اِس سے کئی بار مل چکی ہو۔ اُس کی خواہش ہے کہ وہ امریکہ جانے سے قبل ہی شادی کرے...... تمہاری کیا مرضی ہے''۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن اس معاملہ میں آپ میرے بھیا سے بات کر لیں''

مِس نازیہ...... مسز ہندال حیدر بن گئی...... بوڑھا فنکار بے حد خوش ہے۔ اُس میں نئی جوانی آ گئی ہے۔ اِس کے اندر جذب ہو چکی شوخیوں کو پَر لگ گئے ہیں اور پَر من پنجرے میں پھڑ پھڑانے لگتے ہیں۔ وہ ہر رات کو نازیہ اور حیدر کے بیڈ روم میں جھانکتا رہتا

ہے۔اُن سوراخوں سے جو دِکھائی نہیں دیتے......نازیہ اور حیدر اُس کے لیے تسکین کا سامان پیدا کرتے رہتے ہیں۔ وہ نازیہ کے جسم کے زاویوں کا افسانہ پڑھتا رہتا ہے اور پھر اپنے بدن کا منوں بوجھ لے کر بیڈروم میں آجاتا ہے اور اپنے بستر کے پھیکے سفر پر گامزن ہو کر کروٹیں بدلتا رہتا ہے......اب ہر روزِ اس کے تن کے صحرا میں بگولے اُٹھتے ہیں جنہیں ہر رات وہ راکھ میں ٹھنڈا کرتا ہے۔

پھر ڈاکٹر ہندال حیدر مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے امریکہ چلا گیا اور نازیہ اپنے دفتر کے بعد گھر میں بوڑھے فنکار کے ساتھ رہنے لگی......اور پھر ایک رات......

نازیہ کے تپتے بیساکھ کو بوڑھا فنکار اپنی واسنا سے بھرے بن باس میں اُٹھا کر لے گیا۔ وہ اپنے ہاتھوں میں، اپنی بانہوں میں چاند کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ پَر چاند اُس کی انگلیوں سے پھسل جاتا۔ بار بار پھسلن سے چاند نیچے گِر گیا اور بوڑھے فن کار کی مُٹھی میں آ گیا۔ وہ بولا:

''وہ مکان جس کی چھت پر برف پڑی ہو اس کے اندر بھی آگ جلتی ہے......''

بستر کے پھیکے سفر کی یاترا سپھل ہوئی......الاؤ روشن ہوا اور پھر اندھے کنویں میں جا کر بکھر گیا......نازیہ کے سُلگتے جسم کو آنکھوں کا ساون رِم جھم سے ٹھنڈا کرنے لگا اور پھر اُس نے بوڑھے فنکار کے مہذب ڈرائنگ روم سے نکل کر باتھ روم تک جانے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ پھر بھی وہ سلگتی رہی، اُبلتی رہی اور بکھرتی رہی...... بوڑھا فنکار کسی اور تصویر کو مکمل کرنے میں مگن ہو گیا اور نازیہ جلتی تنہائی کو آتے جاتے موسموں میں گم کرنے لگی...... لیکن سورج، چاند ستارے پی جانے کے بعد بھی وہ پیاسی رہی...... بوڑھے فنکار نے اُسے بدچلنی کے گھوڑے پر سوار کر کے اپنے گھر سے روانہ کر دیا......نازیہ روایت سے نہیں ٹکرائی۔ اس نے سماج کی فضول رسموں کو بالائے طاق رکھ کر سُلگتی ویرانی کو اپنا نشیمن بنا لیا......اور پھر اس کے نشیمن پر آئے دن بگولے حملے کرتے رہے۔ وہ ہر حملہ سہتی رہی......دُکھ ایک پل کا بھی ہو تو عمروں لمبا ہو جاتا ہے اور جب یہ طویل ہو، تب یگوں میں پھیلنے لگتا ہے......

"یگوں میں پھیلے درد کے دریا کی لہروں کو شانت کرنے کے لیے وہ ایک دیوار کا سہارا ڈھونڈنے لگی تاکہ وہ قلعہ بند ہو جائے اور ہزار ہا سروں والے اور بے شمار ہتھیاروں سے لیس آسیب پل پل اِس کا پیچھا نہ کر سکیں لیکن اُسے ہر بار...... کچی دیواروں سے ہی واسطہ پڑا جو مقصد پورا ہونے کے بعد ہی گر جاتیں......اور......اس کے نشیمن کے صحن میں پھر سے رستے بننے لگتے......ایک پائدار دیوار کی خواہش میں وہ آج بھی بھٹک رہی ہے۔تن کا صحرا لیے......اور اس صحرا کے لیے دکھائی دینے والا ہر نخلستان ایک سراب ہے......"

............☆☆☆............
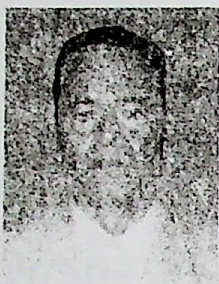
جان محمد آزاد

نام	:جان محمد آزاد
تاریخِ پیدائش	:۴رفروری ۱۹۴۸ء
تعلیم	:ایم۔اے (اُردو)، ڈپلوما اِن جرنل اِزم
تصانیف	:ناول۳......شعری مجموعہ۱......افسانوی مجموعہ۱
	دیگر کتابیں۲
افسانوی مجموعہ	:آشیاں۔سے آسمان تک
شعری مجموعہ	:الوداع موسمی پنچھی
پتہ	صورہ سرینگر
فون نمبر	9622681428

☆......جان محمد آزاد

بہار آنے تک

نرگس نے آنکھیں کھولیں تو گلستان میں تا حدِ نظر ہری ہری زمردیں نوخیز گھاس دم سادھے خاموش کھڑی تھی۔ اونچی اونچی جھاڑیاں ساکت وجامد تھیں جیسے محوِ حیرت ہوں۔ نسیمِ صبح کے جھونکوں سے پیتاں ہلتیں تو ان کی لرزش سے ایسی کھڑ کھڑاہٹ پیدا ہوتی جیسے چھلکے اتارے ہوئے خشک اخروٹ ایک بوری سے دوسرے بوری میں بھرے جا رہے ہوں۔ صدائے بازگشت سے اس کی محویت ٹوٹی اور اسے یاد آیا کہ اس کو جو کام تفویض کیا گیا ہے وہ نہایت عُجلت آمیز اور اہم ہے۔ اُسے بہار نے یہاں اپنا پیامبر بنا کے بھیجا ہے۔ نرگس کو یاد آیا کہ وہ کس قدر برق رفتاری سے منزلوں کو روندتی گلستان تک پہنچ گئی تھی۔

صبا کے کرم فرما جھونکوں نے چمن والوں کو بیدار کیا۔ صبا کو اس لطافت میں کس قدر تضاد، کس قدر بھرم تھا۔ نرگس کو صبا کی یہ اٹھ کھیلیاں ایک آنکھ نہ بھائیں۔ اُدھر شبنم پھولوں کا منہ دھو کر ان کی شگفتگی کو دوبالا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سفید سفید شگوفوں سے ڈھکے ہوئے ناشپاتی کے پیڑ اب زیادہ شاداب نظر آ رہے تھے۔ بنفشہ کے ننھے ننھے پھول اب برف پاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ لیکن نرگس نہ مٹی میں مانوس خوشبو محسوس کر رہی تھی، نہ پھولوں سے شناسائی اس اجنبیت میں اس کی نگاہیں اپنے محبوب......بھونرے...... کو تلاش کر رہی تھی۔ وہ اُس کی آسمانِ محبت پر دمکنے والا پہلا ستارہ تھا لیکن گلستان میں اُس کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ نہ جانے نرگس کے کس ازلی دشمن نے بھونرے کو اس سے علاحدہ کر دیا تھا۔ یہ سوچ کر نرگس بے حد اُداس ہوگئی۔ اُس کے رخسار آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ پھر وہ خود ہی سنبھلی۔ اُسے تو بہار نے یہاں اپنا پیامبر کے بھیجا ہے اس وقت وہ آنسو بہانے کی

متحمل نہیں ہوسکتی۔ یہ پیغام نہایت عُجلت آمیز تھا۔ اسی لئے اُسے طویل مسافتیں تیزی سے طے کرنا پڑیں اور گلستان میں داخل ہوتے ہیں وہ تھکی ہاری بے خبر سوگئی تھی۔

اُسے جو پیغام لے کر بھیجا گیا تھا وہ یہی تھا کہ بہار بس اب آنے ہی والی ہے۔ مگر گلستان میں وارد ہوتے ہی اب نرگس کے لطیف وجود پر یہ احساس تازیانے برسا رہا تھا کہ جس موسم گُلِ کے آنے کی بشارت دینے کے لئے اُسے چمن والوں کے ہاں بھیجا گیا تھا وہ بھلا خود اُسے بہار کو دینے کی کہاں متحمل ہوگی۔ اُس کا پیکرِ نزاکت تب تک اس گلستان کے لئے اجنبی بن چکا ہوگا۔ اُس کے پاس تو بس گنتی کی چند سانسیں ہیں۔ وہ بھلا اتنے سن وسال کہاں سے لائے گی۔ جب موسمِ گُل اپنی تمام تر اُمنگوں اور جولانیوں کے ساتھ اپنے تمام رنگوں اور نکہتوں کے ہمراہ یہاں کی فضا کو مشکبار کر رہا ہوگا تب تک تو نرگس گل سڑ کر خاک ہو چکی ہوگی۔ نرگس کی نرگسی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھیلیں جیسے منجمد ہو کے رہ گئیں۔ پھر اُسے خیال آیا کہ وہ بہار کی رازداں ہے لیکن جس بہار نے اُسے پیامبر بنانے کے بھیجا ہے۔ وہ خود بھی تو جاوداں نہیں ہے۔ ساون کے آنے تک بہار کی پیامبر نرگس فنا کے گھاٹ اُتر چکی ہوگی۔ لیکن خود رنگ ونکہت کی پاسباں بہار بھی چمن والوں کو حیران و پریشان چھوڑ کر عدم کے دھندلکوں میں کھو چکا ہوگا۔ کیا یہ ساری بنجارہ مزاجی ایک تلخ و تُند مذاق سے کسی طرح کم ہے۔!

آفتاب کی ارغوانی شعائیں پیڑوں کے ماتھے پر ندائے صبح کی تحریریں رقم کر رہی تھیں۔ پتے کرنوں کی روشنی میں جیسے نہا رہے تھے۔ گلستان میں ہر طرف ایک چہکار سی مچی ہوئی تھی۔ چمن والوں کی نظریں جونہی نرگس پر پڑیں تو سبھی پھولوں نے آکر نرگس کو گھیر لیا۔ انہیں بھی شاید نرگس کی آمد کے ساتھ ہی اس بات کا عندیہ مل گیا تھا کہ پھولوں کا متوالا بہار کا شہریار گلستان میں وارد ہونے والا ہے۔ گلستان کے ہر گوشے میں زبردست گہما گہمی تھی۔ ہر طرف جشن کا سا سماں تھا۔ بہار کی محفل اب بس سجنے والی تھی۔ اس محفل میں شرکت کرنے والے سبھی نازنین باغ کے میزبان کو گھیر کر اُس سے ایک ہی استفسار کر رہے تھے کہ پھولوں کا متوالا اب کب تک آنے والا ہے؟

میزبان نرگس خاموش اور حیران تھی۔!

وہ اپنی نامُرادی اور لاچاری کی تشہیر نہیں چاہتی تھی لیکن اُس کے منہ سے کوئی راگ کوئی نغمہ پیدا نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بھلا کہتی بھی تو کیا۔ کیا وہ ان انجان چمن والوں سے اس حقیقت کا برملا اظہار کرتی کہ بہار کے آنے تک ہم سبھی یکے بعد دیگرے ابدی نیند سو چکے ہوں گے......!

تب ہی بُلبلِ خوش نوا پرواز کرتی ہوئی آئی اور چمن والوں کی صفوں میں شامل ہو کر نرگس سے پوچھ بیٹھی ''یہ تو بتاؤ جہاں سے تم آئی ہو وہاں کے کیا حال ہیں؟''

پریشان حال نرگس جسے اس کے سوا کچھ بھی علم نہیں کہ وہاں اُسے محض گلستان میں جا کر متعلقین کو مطلع کرنے کے لئے کہا گیا اور اسے ایک ایسے گلستان میں بھیجا گیا جہاں اہلِ چمن موسموں کے ہیر پھیر کے چکرویو میں پھنس کے رہ گئے ہیں۔ ایک لمحہ کے لئے نرگس نے سوچا کہ اس معصوم اور سادہ لوح پرندے کو ٹالنے کے لئے وہ اِدھر اُدھر کی کوئی بات کہہ دے لیکن پھر اُس کے اپنے ضمیر نے اسے جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ سوچنے لگی کہ وہ اس پرندے کو طفل تسلی دے کر خاموش کرائے گی لیکن خود اپنے دل کو کیونکر مطمئن کر پائے گی۔

پریشان حال نرگس گلستان کے مظاہر دیکھتی رہی۔ رات کی تاریکیاں، سحر کی ضیا پاشیاں، صبا کی آمد شبنم کا رقص! یہ سارے معاملات دل کی دنیا میں اک آگ سی لگا دیتے ہیں۔ نسیم سحر نیم روشن فضا میں نقب سی لگاتی اور نہ صرف اس کی ساری مہکار لے اُڑاتی بلکہ جاتے جاتے لذتِ خوابِ سحر میں مستغرق پھولوں کو جگا کر انہیں آہ و بکا کے لئے چھوڑ جاتی۔ یہ کیسا راہزن ہے جو چمن والوں کی ساری متاعِ عزیز اُڑا لے جاتا ہے اور پھر انہیں ماتم اور بین کرنے کے واسطے جگانے کا نیک فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔ پھر جب صبح کی کرنیں روشن ہونے لگتی ہیں تو شبنم پھولوں کے چہرے تروتازہ کرتی رہی۔ ممکن ہے کہ نرگس کی اس بات سے تشفی سی ہوتی ہو کہ گلستان مجموعی طور ہمدردی جتانے والوں سے یکسر خالی نہیں ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر نرگس مزید حیران و پریشان رہ گئی کہ جو شبنم ابھی ابھی اہلِ چمن کی شگفتگی کا سامان کر رہی

تھی اور انہیں زندگی کے ایک نئے دن کی مصروفیات کے لئے گویا تروتازہ بنا رہی تھی، وہ خود اچانک صفحۂ ہستی سے معدوم ہوگئی۔ نرگس یہ سوچ کر الجھ رہی تھی کہ شبنم اتنی عجلت میں چمن والوں کو بیچ راہ میں چھوڑ کر کیوں چلی گئی۔ کیا شبنم کو اتنی شفقت کا مظاہرہ کرنے کا یہی صلہ مِلا کہ اُسے اتنی مختصر حیات کے بعد چمن والوں کو تیاگ دینا پڑا۔

یہ کیسا باغ ہے...... یہ اس کا کیا دستور ہے.........! یہ نا قابلِ فہم واقعات اور یہ پریشان کن سوالات، انجام کار نرگس کو اپنی ذات پر غور وفکر کرنے کے لئے مجبور کر رہے تھے۔ اپنے حال واحوال کا محاسبہ کرنے کی تحریک اور اِس طرح اُسے عجیب صورتِ حال شناخت کرنے اور تقدیر کی آگہی حاصل کرنے کا ادراک......! یہی سب چیزیں اُسے بار بار الجھا رہی تھیں۔ نرگس سوچتی کہ اُس کی زندگی کا نور وسرور بس ایک بھونرے کا عشق تھا۔ اُس کا وصل، اُس کی آرزو اور اُس کی سیاہ ذات کا تصور تھا۔ بس یہی اُس کی متاعِ گم گشتہ تھی۔ لیکن جس بے درد نے پہلے مجھے اُس کے عشق میں مبتلا کیا اُسی نے پھر میری اُس محبوب ذات کو کچھ اُس طرح پنہاں کر دیا کہ میرے لئے اس کی حیثیت بس تلاشِ رنگِ رائیگاں ہو کر رہ گئی ہے۔ یہاں میں اُس کی لامحدود محبت میں گرفتار ہوں اور وہ وہاں خود نہ جانے کس کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ لیکن میں خود کو اُس کی کیفِ آگیں محبت کے سوز سے کیسے آزاد کر سکتی ہوں۔

نرگس اپنی ذات اور اپنے گرد وپیش کی حوصلہ شکن صورت حال سے بڑی بددل ہو گئی۔ وہ سراپا ایک سوالیہ نشان بنی ہوئی تھی۔ ساکت وجامد بُلبل خوش نوا مسکرا رہی تھی۔ اُسے بڑی دیر سے اپنے سوال کا جواب چاہیئے تھا۔ لیکن نرگس سے اُس کے معقول سوال کا بجز اس کے کوئی جواب نہیں بن پا رہا تھا کہ بہار چمن والوں کے درمیان عنقریب ہوگی۔ وہ اتنا نہیں کہہ سکی کہ وہاں کی حقیقت ہے۔ اس سے چمن والوں کے دل ٹوٹ جائیں گے تاہم اہلِ چمن کا تجسّس دیکھ کر وہ اس طرح گویا ہوئی:

"اے خجستہ خیال گُل وبُلبل! تمہاری یہ مُدھر سریلی آوازیں، یہ

روحانی موسیقی، یہ رنگوں کی قوسِ قزح فطرت کا آئینہ ہیں۔ ابھی چند دنوں میں بہار کی خوشبوئیں تمہارے اطراف کو مُستفیض کرنے والی ہیں۔ لیکن وہ بھی دستِ فطرت کی ہی ایک تخلیق ہیں ہم سب کی طرح ......فطرت پہلے ہمیں مالا مال کرتی ہے لیکن پھر ایک دن ہم سے سب کچھ چھین کر ہمیں اپنے پاؤں تلے روند دیتی ہے۔ ہم سب فطرت کے سامنے کس قدر نا مکمل اور مبہم ہیں۔ وہ جسے معدوم کر دیتی ہے وہ ابدی سکون میں چلا جاتا ہے لیکن جسے پروان چڑھاتی ہے وہ ہمیشہ اضطراب میں رہتا ہے"

بہار کے رازداں کی آواز میں سچے آنسوؤں کی تلخی تھی۔ چمن والوں کے حلقوں میں اس انکشاف نے ارتعاش سا پیدا کیا۔ شاخوں سے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دینے لگی۔ جھاڑیوں سے بل کھائی بیلوں اور پتوں کی سرگوشیوں کی آواز آنے لگی۔ گلستان جیسے تجلّی کے ایک دھارے میں نہا گیا۔ درختوں سے، شاخوں سے پتوں سے ہر چیز سے رنگین روشنی نکل رہی تھی۔ لیکن پُر کیف غم کی چادر میں لپٹی نرگس بے بسی اور بے چارگی کی تصویر بنی بے تحاشہ آنسو بہا رہی تھی۔ وہ اتنا روئی کہ اُس کا کلیجہ پھٹ گیا۔ گھاس سر اٹھا کر بولی!

"اسے سفر کی نوید بخشنے والی نرگس! آخر تم اتنا کیوں روتی ہو؟"

دم توڑتی نرگس نے جواب دیا...... "میں روتی ہوں کہ شاید دوسرے ہنس سکیں"۔ یہ کہتے ہوئے نرگس نے آخری ہچکی لی۔ دوسرے دن ٹہنی پر گلابی کلیاں جھوم جھوم کر ہنس رہی تھی۔ گھاس نے شرمندہ ہو کر سر جھکایا تھا۔

............☆☆☆............

دیپک کنولؔ

نام	: دیپک کمار کول
قلمی نام	: ڈی۔ کے۔ کنول اور پھر دیپک کنول
تاریخِ پیدائش	: ۱۹ جنوری ۱۹۴۹ء بڈگام، کشمیر
افسانوی مجموعے	: ہم تیرے ہوگئے (۲۰۰۱)، برف کی آگ (۲۰۰۹)
ناول	کشمکش (۱۹۷۱)، تماشہ (۱۹۸۰)، ترنگ (۱۹۸۴)، نیا سفر (۱۹۸۵)، درانہ (۱۹۸۸)
تصنیف	: دلیپ صاحب (دلیپ کمار کی فلمی زندگی کا سفر) ۲۰۰۹
پتہ	: ۴/۱۶، سی، ایچ، ایس پلاٹ نمبر ۹، سیکٹر۔ بی۔ مالونی، ممبئی..... ۴۰۰۰۹۵
فون نمبر	09322264079

☆......دیپک کنول

لال پُل کا دیوانہ

جمیل خان اوڑی کا باسی تھا۔ اوڑی کے ساتھ جو ندی بہتی ہے اُس پر جو پُل بنا ہے اُسکا نام لال پل ہے۔ یہ پل کشمیر کے دو حصوں کو آپس میں جوڑ دیتا ہے۔ اس پل کے ساتھ جمیل خان کو والہانہ لگاو تھا ۔ کبھی وہ پل کے اُس پار نہارتا رہتا تو کبھی وہ اس پل کے نیچے بہنے والی ندی کے پانی کے ساتھ کھیلنے لگتا تھا۔ یہ شیتل اور خاموش ندی ہمالیہ کے پہاڑوں سے برف چوس کر پھوئیاں پھوئیاں آگے بڑھتی تھی۔ آگے بڑھتے بڑھتے اس میں چھوٹے چھوٹے ندی نالے مل جاتے تھے اور یہ ندی ایک وشال روپ اختیار کر لیتی تھی۔ یہ ندی بڑی سبک رفتاری کے ساتھ کھیت کھلیانوں کی پیاس بجھاتے، لوگوں کا میل دُھلاتے ،سلام آباد کی مٹی کو چومتے ہوئے ایک محبوبہ کی طرح خرام ناز کے ساتھ لہراتے بل کھاتے بہتی رہتی تھی اور پھر آگے جا کر وہ اپنے محبوب دریائے جہلم کے آغوش میں سما جاتی تھی۔

جمیل خان بھی ندی کے اس پار اپنے محبوب کے دیدار کے لئے گھنٹوں کھڑا رہتا تھا۔ اُسکی ایک جھلک پانے کے لئے اُسکی آنکھیں انتظار کرتے کرتے پتھرا جاتی تھیں۔ وہ بھی بڑا ضدی تھا۔ جب تک وہ ندی کے اُس کنارے پر اپنا جلوہ نہیں دکھاتی تھی وہ وہاں سے ہٹتا نہیں تھا۔ جب وہ خرام ناز کے ساتھ ندی کے کنارے پر آجاتی تھی تو جمیل خان کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی تھیں۔ چہرہ مارے خوشی کے شفق کی مانند کھلنے لگتا تھا۔ وہ والہانہ نظروں سے اُسکی جانب دیکھتا تھا۔ اُسکی جھلک دیکھ کر وہ انتظار کی ساری کوفت بھول جاتا تھا۔ جب اُسکے گلابی ہونٹوں پر تبسم کھلتا تھا تو اس کی یہ ایک مسکراہٹ اُس کے دل کو امیدوں اور خوشیوں کے اجالوں سے بھر دیتی تھی۔ وہ خوشی سے لہر بہر ہو کر لوٹ جاتا تھا اور پوری

رات اُسی ایک مسکراہٹ کی گرمی اور لطافت کے ساتھ جی لیتا تھا۔ وہ مسکراہٹ جو اُسکے تخیل کے آکاش پر کہکشاں بن کر دمکتی رہتی تھی۔

جمیل خان ایک کوہستانی گوجر تھا۔ اوڑی کا قصبہ جو کہ چارسُو پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے اُنہی پہاڑوں میں سے ایک پہاڑی پر اُسکا نشیمن تھا۔ مرغے کی کلغی کی طرح کھڑی پہاڑی پر اُسکا ڈھوکا تھا۔ اس پہاڑی کے دامن میں کئی گاؤں تھے جن میں سلام آباد اس لئے اہم تھا کہ اُس پار کے علاقے سے جو بھی سیلانی یہاں آتا تھا اُسے سلام آباد میں اُتر کر اپنی پہچان درج کرانی پڑتی تھی۔ جمیل خان اکثر سودا سلف خریدنے کے لئے سلام آباد آتا جاتا رہتا تھا۔ اب تو آوا جائی کچھ زیادہ ہی ہوگئی تھی۔ وہ پار سے آنے والے سیلانیوں کا اسقدر مونس بن گیا تھا کہ جو بھی وہاں سے آتا تھا وہ اُس سے ہاتھ ضرور ملاتا تھا۔ شاید وہ اُن سے مل کر اُس پار کی اُس سوندھی سوندھی مہک ونکہت سے سرشار ہونا چاہتا تھا جہاں اُسکی محبوبہ رہتی تھی۔

جمیل خان ایک بانکا نوجوان تھا جسکی پتلی سی داڑھی، اُسکے معصوم چہرے پر بڑی بھلی لگتی تھی۔ وہ پچھلے دو سال سے اکیلے ہی ڈھوکے میں رہتا تھا۔ اکیلا ہنستا بھلا نہ روتا۔ باپ برسوں پہلے ایک حادثے میں جان بحق ہو گیا تھا۔ ایک ماں تھی جس نے اُسے پال پوس کے بڑا کیا تھا۔ دو سال قبل وہ بھی پیوند خاک ہوگئی تھی۔ ماں کے انتقال کے بعد وہ ایکدم اکیلا ہو کے رہ گیا تھا۔ کئی گوجر گھرانوں سے اُسکے لئے رشتے آنے لگے مگر جمیل تو شادی کے لئے راضی ہی نہ ہوا۔ رشتے ناتے داروں نے سمجھا کہ جمیل خان شرمیلا ہے۔ ابھی نانا کر رہا ہے۔ کچھ دن بعد خود ہی راضی باضی ہو جائے گا مگر ایسا ہوا نہیں۔ اُنہوں نے اُسے بڑا منایا، بڑا سمجھایا مگر وہ ٹوٹس سے مس نہ ہوا۔ آخر اس انکار کی وجہ کیا ہے یہ کوئی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ جنہیں پرواہ تھی اُنہوں نے بہت کھوجا کھنگالا، پر کچھ ہاتھ نہ لگا۔ یہ بات کوئی نہیں جانتا تھا کہ جمیل کسی کو دل دے چکا ہے اور اُسی کی یاد میں رات دن آہیں بھرتا رہتا ہے۔

ہوا یُوں کہ بکروال یار محمد کے بیٹے شاہ محمد کی شادی طے ہوئی تھی۔ اُس کا چھوٹا بھائی دوست محمد ندی کے اُس پار پاکستان والے کشمیر میں اپنے عیال کے ساتھ کئی دہائیوں

سے رہ رہا تھا۔ دونوں بھائی ایک دوسرے سے ملنے کے لئے کب سے تڑپ رہے تھے۔
اب اللہ نے موقع بخشا تھا ملنے کا کیونکہ ریاستی سرکار نے رشتہ داروں کے ملنے جلنے کے قواعد
بہت حد تک نرم کردئے تھے۔ سویار محمد نے اپنے چھوٹے بھائی کو اس تقریب میں مع اہل و
عیال کے شامل ہونے کے لئے مدعو کیا تھا۔ برسوں سے بچھڑے بھائی ایک دوسرے سے
ملنے کے لئے کس قدر تڑپ رہے تھے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ شاہ محمد
روز سلام آباد کے چیک ناکے پر کھڑا اپنے بھائی کی آمد کا انتظار کرتا رہتا تھا۔

آخر اُس کی یہ بے چینی، انتظار کا کرب اُس دن ختم ہوا جس دن اُسے یہ خبر ملی کہ
اُسکا بھائی اپنے عیال کے ساتھ ایک ہفتے کے بعد آ رہا ہے۔ شاہ محمد کی خوشی نا قابلِ بیان تھی۔
وہ تو جیسے ہوا کے دوش پر اُڑا جا رہا تھا۔ جس دن دوست محمد کی آمد آمد تھی اُس دن بستی کے بچے
، بوڑھے، جوان سب لال پل کے پاس جا کر جمع ہو گئے۔

لال پل پر تو جشن کا سا سماں تھا۔ اُنہوں نے دوست محمد اور اُس کے عیال کا
سواگت کھلے دل سے کیا۔ اُن پر گلباری کی۔ پٹاخے چھوڑے۔ ڈھول پیٹے۔ وہ اس کے اہل
وعیال کو جلوس کی شکل میں شاہ محمد کے ڈھوکے تک لے گئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے شادی شاہ
محمد کی نہ ہو بلکہ دوست محمد کی ہو۔ آخر اُس کی اتنی تکریم ہوتی کیوں نہیں وہ بھی تو اسی دھرتی کا
لال تھا۔ وہ بھی اسی مٹی کی خمیر سے اُٹھا تھا۔ اس بھیڑ میں جمیل خان بھی شامل تھا۔ وہ بھی خوشی
سے ناچ رہا تھا۔

دوست محمد کا عیال زیادہ بڑا نہ تھا۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ سب سے بڑی ایک
بیٹی تھی جس کی عمر سترہ اٹھارہ سال کی تھی۔ ایک دم نوخیز کلی تھی جو عنفوان شباب میں قدم رکھ
چکی تھی۔ باقی کے بچے دس سال سے کم کم ہی تھے۔ بیٹی جس کا نام گل افروز تھا، بڑی نازک
اندام تھی۔ چھریرے بدن اور سانولے رنگ کی گل افروز یہاں کی عام لڑکیوں جیسی ہی
تھی۔ اُس میں ایسی کوئی خاص بات نہ تھی جو اُسے یہاں کی لڑکیوں میں ممتاز بنا دیتی سوائے
اسکے کہ وہ بڑی چلبلی اور غصہ والی تھی اُسکی ناک پر ہر دم غصہ رہتا تھا۔ جمیل خان کی ملاقات

گل افروز سے تب ہوئی جب وہ ایک جنگلی پیڑ پر شہد اُتارنے کے لئے چڑھ گئی تھی کہ مد مکھیوں نے اُس پر حملہ بول دیا۔ جب مَدھو مکھیوں نے اُس پر پے در پے ڈنک مارنے شروع کیئے تو وہ درد کی شدت سے چیخنے چلانے لگی۔ اتفاق کی بات ہے کہ جمیل خان آس پاس ہی اپنا گلہ چرارہا تھا۔ اُس نے جب کسی کی رونے چیخنے کی آواز سنی تو اُس سے رہا نہ گیا۔ وہ لاٹھی لیکر اُس جانب دوڑا۔ کیا دیکھا کہ گل افروز مَدھو مکھیوں میں بری طرح گھر چکی ہے۔ اُس نے گل افروز کو شہد کی مکھیوں کے نرغے سے پہلے باہر نکالا اور پھر اُسے اپنے کاندھے پر اُٹھا کر گلے تک لے آیا۔ وہ ہمیشہ اپنی پگڑی میں ایک سوئی چھپا کے رکھتا تھا کیونکہ آئے دن اُسے ان مکھیوں سے پالا پڑتا تھا۔ اُس نے سوئی لیکر گل افروز کے چہرے سے اُسکے ہاتھوں سے سارے زہریلے کانٹے نکال دیئے۔ اس کام میں اُسے بلا کی مہارت حاصل تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں گل افروز کی پیڑھ کم ہوگئی اور وہ جمیل خان کا شکریہ ادا کر کے اپنے ٹھکانے پر چلی گئی مگر جمیل خان کو ایک انوکھی بے قراری دے گئی۔ گل افروز کے ایک لمس نے اُسے ایک انجانی لذت و مسرت سے آشنا کر دیا تھا۔ وہ اُس پل کو یاد کرنے لگا جب اُس کے ہاتھ گل افروز کے بدن کو چھونے لگے تو اُس کے رگ و پے میں جیسے بجلیاں دوڑ نے لگی تھیں۔ وہ سوچنے لگا کہ ایسا کیوں ہوا۔ اس سے پہلے بھی اُس نے مختہ موسی کے چہرے کو چھوا تھا۔ آمنہ خالہ کے بندن کو ہاتھ لگایا تھا۔ سکینہ آپا کے بدن سے کانٹے نکالے تھے تب اُسے اس لذت کا احساس کیوں نہیں ہوا تھا۔ تب اُسکے تن بدن میں ایسی ہل چل کیوں نہیں مچی؟

پہلی بار وہ ایک عورت کے لمس سے آشنا ہوا تھا۔ پہلی بار اُس کی اُنگلیاں ایک عورت کے بدن کو چھوتے ہوئے جذبات کا رس ٹٹولنے لگی تھیں۔ وہ رات اُس نے گل افروز کے خیالوں میں کھو کر گزار دی۔ اگلے روز وہ صبح سویرے ہی اُسے دیکھنے یار محمد کے کوٹھے پر پہنچ گیا۔ وہ باہر آ گئی۔ اُس کی ایک نگاہ نے جیسے مسیحائی کا کام کر دیا۔ اُس کی ایک نگاہ نے اُسے فرحت و شادابی بخشی۔ جمیل خان کو جیسے جہاں بھر کی خوشیاں مل گئیں۔ گل

افروز جب تک یہاں رہی وہ اپنا کام دام چھوڑ کر اُس کے ارد گرد بھنورے کی طرح منڈلاتا رہتا تھا۔ گل افروز باہر سے جتنی ترش نظر آتی تھی اندر سے وہ اُتنی ہی نرم وملائم تھی۔ وہ جب اکیلی ہوتی تھی تو اُسکا چہرہ تنا ہوا رہتا تھا لیکن جونہی جمیل خان آجاتا تھا اُسکی تندی میں حلاوت گھل جاتی تھی۔ اُسکا چہرہ خوشی سے دمک اُٹھتا تھا۔ وہ جب جمیل خان کو دیکھ کے پہلی بار مسکرائی تھی تو جمیل خان کو ایسا لگتا تھا جیسے گل افروز نے اُس کے دل کی دہلیز پر افشاں چھڑک دی ہو۔ جیسے اُسکی تاریک راہوں میں چراغ روشن کیئے ہوں۔ جیسے اُس کے خوابوں میں رنگ بھر دئے ہوں۔

ہفتے عشرے کے بعد وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ واپس اپنے وطن لوٹ گئی۔ دونوں اُداس اور افسردہ تھے، پر وہ اپنے دل کی کیفیت بیان نہیں کر سکتے تھے۔ وہ بس آنکھوں ہی آنکھوں سے اپنے غم ویاس کو بیان کرتے رہے۔ جانے سے پہلے وہ ایک بار چھپ کے ملے۔ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو نہارتے رہے۔ زبان سے تو کچھ بیان نہ کر سکے البتہ آنکھوں ہی آنکھوں سے اُنہوں نے بہت سارے عہد وپیماں ایک ساتھ کر ڈالے۔ یہ ملن کی گھڑی ایک ہوا کے جھونکے کی طرح گزر گئی۔ پھر وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ وہ تو چلی گئی مگر جاتے جاتے وہ جمیل خان کے دل میں محبت کی قندیل روشن کر کے گئی تھی۔ جاتے وقت جمیل خان نے اُسے تحفے کے طور پر ایک کنگھی، سرمہ دانی، اور عطر کی شیشی کر پیش کی تھی۔ یہ ساری چیزیں نے اُس نے چپکے سے رکھ لی تھیں۔ بدلے میں اُس نے جمیل خان کو ایک دلفریب مسکراہٹ دی تھی۔ ایک ایسی مسکراہٹ جس میں محبت کے اُجالے پنہاں تھے۔ جس میں پیار کا رس بھرا تھا۔ جس میں چاہت کے کتنے ہی ان سنے نغمے پوشیدہ تھے۔

جمیل خان نے اس مسکراہٹ کو اپنے دل کے نہاں خانوں میں چھپالیا۔ اس ایک مسکراہٹ نے اُس کے دل کے اندھیاروں میں محبت کے اُجیارے بھر دئے تھے۔ وہ اس ایک مسکراہٹ کے سہارے جی رہا تھا۔ وہ ہر روز ندی کے کنارے جا کر بیٹھ جاتا تھا اور اپنے محبوب کی ایک جھلک پانے کے لئے گھنٹوں ٹکٹکی باندھے ندی کے اُس اور دیکھتا تھا

جہاں گل افروز رہتی تھی۔ گل افروز جو اُسکی آنکھوں کے راستے سیدھے اُس کے دل میں جاکر بس گئی تھی۔

جمیل خان ان پڑھ آدمی تھا۔ وہ سیاست کے کھیل نہیں سمجھتا تھا۔ وہ آج تک یہ نہیں سمجھ پایا تھا کہ ندی کے دونوں پاٹ ایک جیسے ہیں پھر وہ اُس پاٹ تک کیوں نہیں جا سکتا۔ اُسے وہاں تک جانے کے لئے سرکار سے اجازت لینے کی ضرورت کیوں ہے۔ وہ آج تک اس گورکھ دھندے کو سمجھ نہیں پایا تھا کہ جب یہ زمین کا خطہ ایک ہی ہے تو پھر بیچ میں یہ دیوار کیوں۔؟ اس ندی کے آر پار دو ملکوں کی فوجیں بندوقیں تانیں کیوں کھڑی رہتی ہیں؟ کیوں یہاں پر آنے جانے والوں سے فوجی باز پرس کر لیتے ہیں؟ وہ یہ بھی سمجھ نہیں پایا تھا کہ ایک ہی چہرے کی دو آنکھیں بھلا الگ الگ کیسے ہوتی ہیں۔ دائیں آنکھ اپنی اور بائیں آنکھ پرائی۔ وہ تو بہت ہی سیدھا سادا انسان تھا۔ وہ تو محبت کرنا جانتا تھا۔ وہ سیاست کرنا نہیں جانتا تھا۔ وہ کہاں جانتا تھا کہ دونوں ملکوں نے محبت کے جذبے پر اتنی ساری پرتیں چڑھا رکھی ہیں کہ ان پرتوں کو کھولنے کے لئے کئی صدیاں درکار ہیں۔ وہ ان رقابتوں سے بے خبر تھا۔ اُس کے لئے تو اُس کی دنیا ایک کوہستان سے شروع ہوتی تھی تو دوسرے پر جاکر ختم ہو جاتی تھی۔

اُسے گل افروز شدت سے یاد آرہی تھی۔ جب بھی اُس کی صورت اُس کے تصور کے کینوس پر اُبھر آتی تھی تو اُسکا کلیجہ منہ کو آنے لگتا تھا۔ اُسکا جگر برمانے لگتا تھا۔ وہ درد کی شدت سے تڑپنے اور کلبلانے لگتا تھا۔ جس طرح چاند کے بنا چکور ادھورا ہے اسی طرح وہ بھی گل افروز کے بنا اپنے آپ کو ادھورا اور بے معنی تصور کرنے لگا تھا۔ وہ اُس کے پاس جانا چاہتا تھا۔ اُس سے ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتا تھا۔ پر وہ جا نہیں سکتا تھا کیونکہ اُس کے پاس پار جانے کے کاغذات نہیں تھے۔ جب اُس کا صبر جواب دینے لگا تو ایک روز دیوانگی کے عالم میں اُس نے لال پل پار کرنے کی کوشش کی۔ وہاں پر پہرہ دے رہے فوجی نے اُسے پکڑ کر اپنے افسر کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا۔ اُس افسر کی لمبی لمبی مونچھیں تھیں۔ اُسکی مونچھیں

دیکھ کر جمیل خان ڈر گیا۔ اُس نے اپنی مونچھوں پر تاؤ دیکھ کر اُس سے تحکمانہ انداز میں پوچھا۔

''کیوں بے۔ کتھے جا رہا ہے تو؟''

''صاحب جی ہم اُس پار جانا چاہتے ہیں۔ وہ ماری گل افروز اُت بس دی ہے۔ مَنے اُس دی وڈی یاد آرہی ہے۔ منے جان دو صاحب جی۔ رب تھارو بھلو کرے گو''

''اوئے تو پاگل ہو گیا ہے کیا۔ تینوں پتا نہیں کہ وہ دشمن دا علاقہ ہے۔ تو بنا کاغذ پتر کے اُتھے کیسے جا سکدا اہے۔ تیرے کول پاسپورٹ شاسپورٹ ہے کیا؟''

''وہ کے بھلا ہے صاحب جی؟''

''وہ اگر بھلا ہے تو سب سے وڑی بھلا تو ہے۔ جا اس ویلے اپنے کار جا۔ کل جا کے تحصیل دار کے دفتر میں جا۔ تحصیل دار نال گل کر۔ وہ تینوں اُس پار جان کی اجازت دیں گے۔ تاں ہی تو اُتھے جا سکدا اہے۔ جا ابھی اتھے سے چلا جا''

جمیل خان نے فوجی افسر کو بہترا سمجھایا۔ اُسے اللہ مولا کا واسطہ دیا مگر وہ تو ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ تو اُسے بنا سرکاری اجازت کے بنا پار جانے کی اجازت دینے کے لئے تیار ہی نہیں ہوا۔ وہ بڑا مایوس اور دل برداشتہ ہو کر وہاں سے چلا۔ وہ اپنے ایک رشتہ دار دلنواز خان سے ملا اور اس معاملے میں اُس سے صلاح مانگی۔ دلنواز نے اُسے ڈراتے ہوئے کہا۔ ''کدی ایسی بھول مت کرنا۔ بنا اجازت نامے کے اُس پار جان کی کوشش بھی کرو گے تو یہ فوجی تنے سیدھے گولی مار دیں گے۔ کل عرضی لکھ کے تحصیلدار کے دفتر میں جا اور اُس سے گل بات کر۔ منے پکو یقین ہے تنے اجازت مل ہی جائے گو''

اگلے روز وہ تحصیل کے دفتر میں چلا گیا۔ وہاں اُس سے کسی نے سیدھے منہ بات تک نہ کی۔ اُنہوں نے اُسے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ایک بھوکے کتے کی طرح دوڑایا۔ کسی نے اُس کی باتوں پر کان تک نہیں دھرا۔ پورے دن تحصیل دفتر کی خاک چھاننے کے بعد نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات نکلا۔ کوئی اُسکی بات سمجھ ہی نہیں پایا۔ وہ تو اپنے دل کی آواز اُن کے کانوں تک پہنچانا چاہتا تھا مگر اُنہوں نے تو اپنے کان ہی بند کر رکھے تھے۔

اُنہیں تو دل کی باتوں سے کوئی مطلب ہی نہیں تھا۔ اُنہیں انسانی جذبات سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ تو بس ثبوت مانگ رہے تھے۔ بے جان کاغذوں پر لکھی ہوئی عبارت میں اُنہیں سچائی نظر آتی تھی جب کہ نہ اُنہیں اُسکے جذبات کی صداقت اور پاکیزگی دکھائی دے رہی تھی اور نہ اُسکے دل کی نداسنائی دے رہی تھی۔

جب مایوسی شکست میں تبدیل ہو جاتی ہے تو انسان یا تو اپنی شکست تسلیم کرتا ہے یا بغاوت پر اُتر آتا ہے۔ جمیل خان بھی بغاوت پر اُتر آیا۔ اُس نے طے کرلیا کہ چاہے اُس کی جان رہے یا جائے وہ رات کے وقت چوری چھپے ندی پار کرلے گا اور کسی بھی قیمت پر گل افروز تک پہنچ جائے گا۔ یہی فیصلہ کر کے وہ ایک روز شب کی تاریکی میں فوجیوں سے نظر بچا کر ندی میں اُتر گیا اور پھر تیرتے ہوئے دوسرے کنارے تک پہنچ گیا۔ جب وہ اُس پار پہنچا تو اُس نے خوشی واطمینان کا سانس لیا اور تیز تیز قدموں کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ اچانک اُس پر کسی نے بندوق کے بٹ سے حملہ کر دیا۔ حملہ اتنا زبردست تھا کہ وہ چکرا کے دور جا کے گرا اور پھر وہ بے ہوش ہو گیا۔ اُسے جب ہوش آیا تو اُس نے اپنے آپ کو ایک فوجی غار میں پایا۔ اُسکے گرد کئی سپاہی بندوقیں تانے کھڑے تھے اور اُسکی طرف خونخوار نگاہوں سے اُسے گھور رہے تھے۔ اتنے سارے فوجیوں کو اپنے سر کے اوپر کھڑے پا کر اُسکا دل بیٹھا جانے لگا۔ اُسے دلنواز خان کی بات یاد آنے لگی کہ اگر وہ پکڑا گیا تو وہ اُسے سیدھے گولی مار دیں گے۔ وہ اس خیال سے ہی بدحواس ہونے لگا۔ ایک فوجی نے اُسے ایک زور کی ٹھوکر مار کر پوچھا۔

''بول کس ارادے سے تو یہاں آیا ہے؟''

''جناب منے کیوں مار رہے ہو۔ میں کوئی چوری کرن واسطے ات نہیں آیا ہوں۔ میں تو گل افروز کو ملن واسطے آیا ہوں۔''

''گل افروز تمہاری اماں لگتی ہے کیا؟ کس بات کی جاسوسی کرنے بھیجا ہے؟''

''جناب میں کوئی جسوس نہیں۔ میں تو جمیل خان ہوں۔ وہ پار میر وکوٹھو ہے۔ وہ میں دوست محمد کی چھوکری سے ملن واسطے آگئیو تھو کہ تھارے فوجیا منے پکڑ کے ات لے کے

آ گئیو۔ مارو یقین کرلو جناب۔ میں کدی جھوٹ نہیں بولتو۔ مارو یقین نہیں تو گل افروز سے ہی جا کے پوچھ لونا۔ ماری بات جھوٹ نکلے تو منے گولی ماردو۔"

فوج کے جاسوسوں نے گل افروز کو کھوج نکالا۔ اُس سے تحقیقات کی تو پتہ چلا کہ جمیل خان جو کچھ بھی کہہ رہا تھا سچ تھا۔ اُنہوں نے سچ جاننے کے بعد بھی اُسے رہا نہیں کیا بلکہ اُس کو لے کے ایک سازش تیار کی گئی۔ وہ جان گئے تھے کہ اس کی جان گل افروز کی سانسوں کے ساتھ جڑی ہے۔ اُنہوں نے گل افروز سے اُسکی ملاقات کروائی۔ گل افروز نے جب اُسے فوجی بیرک میں دیکھا تو خوشی کے ساتھ ساتھ اُسے حیرت بھی ہوئی۔ وہ اُسے دیکھ کر خوشی سے رو پڑا۔ بولا۔ "تھارے واسطے سر پہ کفن باندھ کے میں ات آ گیا ہوں۔ منے دس مارے ساتھ چلن واسطے تیار ہو کہ نہیں"

وہ پس و پیش میں پڑ گئی۔ وہ ابھی اتنی خودمختار نہ تھی کہ اپنے اور سے کوئی فیصلہ لیتی۔ اُس نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

'مارے ہتھ وچ کچھ بھی نہیں ہے۔ میرے نال نکاح کرن واسطے تنے مارے باپ نال گل بات کرن پئے گی"۔

جمیل خان گل افروز کے لئے کچھ بھی کرنے کے لئے تیار تھا مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اُسکی رہائی شرطیہ ہے۔ اُسے سب سے پہلے فوجیوں کا کچھ سامان لے کر واپس اپنے علاقے میں جانا تھا۔ اُس کے بعد اُسے گل افروز کے باپ سے ملنے کی اجازت کا وعدہ تھا۔ محبت کا یہ دیوانہ کچھ بھی کرنے کے لئے تیار تھا۔ اُس پار کے فوجیوں نے اُسے کچھ سامان باندھ کے دے دیا اور اُس سے کہا کہ اُس پار ایک آدمی اُس کے گھر سے یہ سامان لے کے جائے گا۔ ایک رات اُنہوں نے اُسے اس پار دھکیل دیا۔ شومئی قسمت وہ اس بار یہاں کے پہریداروں ہتھے چڑھ گیا۔ جب اُنہوں نے سامان کھول کے دیکھا تو جمیل خان کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ وہ اپنے ساتھ موت کا سامان لے کر آ گیا تھا۔ اُسکے سامان میں بندوقیں اور گولیاں بھری پڑی تھیں۔ اُسکے ساتھ بہت بڑا دھوکہ ہوا تھا پر اُس کی بات کا کون

یقین کرتا۔ اس بار یہاں کے پہریدار نے اُسے اتواتو کر کے مارا۔ چار چوٹ کی مار کھانے کے بعد وہ بے ہوش ہو گیا۔ اُسے جب ہوش آیا تو وہ ایک کال کوٹھری میں بند تھا اور اُسکے گرد بہت سارے فوجی کھڑے تھے۔ وہ کھود کھود کر اُس سے پوچھنے لگے کہ وہ یہ گولی بارود کسے پہنچانا چاہتا تھا۔ اُسے تو کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ اُسے پار والوں نے جو کچھ کہا تھا وہ تو یہی سب کچھ اُنہیں بتا رہا تھا مگر وہ اُس کی بات سننے کی بجائے اُسے مارتے چلے جا رہے تھے۔

وہ کئی دن فوجیوں کی مار کھاتا رہا۔ ایک ہفتے کے بعد اُسے پولیس کے حوالے کیا گیا۔ اُس پر دہشت گردی کا الزام تھا۔ وہ اپنی قسمت پر روتا رہا۔ اُسکے رشتہ دار دلنواز خان نے اُسے چھڑانے کے لئے کافی دوڑ دھوپ کی مگر اُسکی کوشش بار آور ثابت نہ ہوئی۔ جمیل خان پر ہشت گردی کا سنگین الزام لگا تھا جسمیں چھوٹنے کے چانس بہت کم تھے۔ ایک رات وہ حوالات کی کوٹھری میں دہاڑیں مار مار کر روتا رہا۔ اُسکی چیخوں میں اتنا درد تھا کہ حوالات کی مضبوط دیواریں بھی لرز گئیں۔

اُس رات اوڑی میں بڑا زبردست طوفان آیا۔ ایسا جھال اُٹھا کہ گھروں کی چھتیں تنکوں کی طرح اُڑ گئیں۔ تناور درخت جڑ سے اُکھڑ کر گر گئے۔ بجلی کے کھمبے بے جان لاشوں کی طرح سڑکوں پر بکھرے پڑے تھے۔ سڑکیں کٹ کے رہ گئی تھیں۔ ندی میں ایسا اُپھان آیا تھا کہ وہ سرکش ہو کر اپنے ہی کنارے کاٹنے لگی۔ ایک طرف موسم کی مار اور دوسری طرف قانون کی پکار۔ جمیل خان ان دونوں کے بیچ پھنس کر رہ گیا تھا کیونکہ اگلی صبح اُسے عدالت میں پیش کیا جانا تھا۔

اُدھر گل افروز کو اُسکی بربادی کی کہانی معلوم ہو گئی تھی۔ وہ روز ندی کنارے صبح سے شام تک بیٹھی اُسکی راہ تک رہی تھی۔ ادھر اُسے پولیس بند گاڑی میں بٹھا کر عدالت میں لیجانے لگی۔ گاڑی راستے میں گاڑی کیچڑ میں پھنس گئی۔ اس سے پہلے کہ پولیس والے گاڑی کو نکال پاتے وہ پیچھے سے فرار ہو گیا۔ وہ وہاں سے سیدھے ندی کی طرف بھاگا اور اُس نے بغیر کچھ سوچ سمجھے ندی میں چھلانگ ماری۔ دیکھ کر اُسکی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا جب اُس

نے گل افروز کو کنارے پر اُسکا انتظار کرتے پایا۔ وہ طوفانی لہروں سے لڑتا ہوا آگے بڑھنے لگا مگر اس بار ندی ایسی بپھری ہوئی تھی کہ وہ جمیل خان کو اپنے ساتھ بہا کر لے جانے لگی۔ وہ گل افروز تک پہنچ نہیں پایا۔ گل افروز نے جب اُسے بہتے دیکھا تو وہ بھی ندی میں کود گئی۔ دو دن بعد پولیس کو ان دونوں کی لاشیں مل گئیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے میں جیسے پیوست ہو کر رہ گئے تھے۔ جیسے وہ ایک دوسرے میں سما گئے تھے۔ اُنکی لاشیں دیکھنے کے لئے ساری مخلوق پولیس تھانے پر ٹوٹ پڑی تھی۔ وہ لال پل کے اس دیوانے کا ایک بار دیدار کرنا چاہتے تھے جس نے سیاست کو ایک بار پھر شرمسار کر دیا تھا۔

............☆☆☆............

طالب حسین رندؔ

نام :طالب حسین رندؔ

تاریخ پیدائش :۱۶/اپریل ۱۹۴۷ء

تعلیم :ادیب کامل

تصانیف :(۱) سرابوں کا سفر (افسانوی مجموعہ)

(۲) کہکشاں (اردو تذکرہ)

(۳) داغ داغ دل (کشمیری شعری مجموعہ)

پتہ :نوآباد (چکہ) بھدرواہ، جموں 182222

فون نمبر 9697197292

☆......طالب حسین رند

دردآشنا

میں ایک کہانی کار ہوں......

انسانی زندگی کے پیچیدہ مسائل، سماجی نابرابری، اقتصادی زبوں حالی، معاشی ناہمواری، سیاسی بدحالی، اقربا پروری، رشوت ستانی، معاشرے کی گرتی ہوئی اقدار، ذاتی مفادات کا تحفظ، میرے خاص موضوعات ہیں اور انہی موضوعات کو لے کر میری کہانی بنتی ہے۔

میں غریبوں، مفلسوں، ناداروں، مزدوروں اور محنت کشوں کا دوست ہوں جب کہ سرمایہ داروں، اونچی اونچی کوٹھی، لمبی چھوٹی کاروں والوں، سرمایہ دارانہ اور استحصالی نظام کا زبردست مخالف ہوں......اسی لیے میری تحریروں اور (کبھی کبھی) تقریروں میں یہ لوگ میرے ہدفِ ملامت ہوتے ہیں۔

یہاں چاروں طرف غربت وافلاس ہے، فاقہ کشی ہے، ظلم وستم ہے، چور بازی، رشوت خوری ہے، بدچلنی اور بدکاری کا دور دورہ ہے...... یہاں آنسوں ہیں، آہیں ہیں، چیخیں ہیں......لیکن سننے والا کوئی نہیں، دیکھنے والا کوئی نہیں، یہاں احساس نہیں، مظلوم کا کوئی طرف دار نہیں...... یہ سارا سماج اندھا ہے۔ بہرہ ہے، گونگا ہے۔ ازل سے نہیں...... بلکہ ازخود بنا ہوا ہے......

یہاں اگر ایک انسان دوسرے کی ہمدردی میں کھڑا ہو جائے، دوسرے کا دُکھ درد دیکھنے یا سننے کی کوشش کرے، دوسرے کے حق میں بولنے لگے......تو اس کے اپنے مفادات

کا کباڑا ہو جائے گا.....کون اپنے مفادات کی قربانی دے گا؟.....ہمارے پاس قربانیوں کی (ہمارے اسلاف کی) مثالیں ہیں.....خوش خلقی کی مثالیں.....دکھ درد بانٹنے کی مثالیں، دوسروں کے لیے خود کو خطرے میں ڈالنے کی مثالیں، دوسروں کو کھانا کھلا کر خود بھوکے سونے کی مثالیں.....ہم اپنی تحریروں اور تقریروں میں اکثر و بیشتر اُن مثالوں کے حوالے دیتے آئے ہیں.....لیکن میں.....میں ان سب باتوں کا زبردست مخالف ہوں کیوں کہ.....

میں ایک کہانی کار ہوں.....

ایک احساس دل و دماغ کا کہانی کار.....میں سوچتا رہتا ہوں.....وہی باتیں جو بیان کر چکا ہوں.....یہی سب سوچ سوچ کر میرا ذہن چکرانے لگتا ہے۔ پھر مجھے وحشت ہونے لگتی ہے.....دم گھٹنے لگتا ہے.....اسی وحشت کے عالم میں.....میں قلم اٹھاتا ہوں..... میری نوک قلم نشتر کا کام کرنے لگتی ہے۔ سماج کے اس بدبودار پھوڑے کو میں چیرنے لگتا ہوں لیکن اس میں موجود ناسور بڑھتا ہی چلا جاتا ہے..... جتنا گہرا گھاؤ اس نشتر سے لگایا جائے اتنے ہی بدبو کے زبردست بھبکے اٹھنے لگتے ہیں.....ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ سارا سماج ایک جمع شدہ گندگی کے وسیع و عریض اور گہرے تالاب میں اُبل رہا ہے۔ سورج کی تپش اس کے اُبال میں اضافہ کر دیتی ہے اور ہوائیں..... چاہے سرد ہوں یا گرم اس بدبو کو چاروں طرف پھیلائے جا رہی ہیں.....

.....جب فضا ہی متعفن ہو تو بدبو کوئی محسوس کرے بھی تو کیسے.....؟ میں کہانیاں لکھتا ہوں.....لیکن کہانی کار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھی سماجی حیثیت کا مالک بھی ہوں.....میرا حلقۂ احباب وسیع ہے.....میں اس سڑے بسے سماج کی رگ رگ سے واقف ہوں.....میں جب بھی سماج کی دکھتی رگوں پر انگلی رکھتا ہوں تو فوراً مرض کی تہہ تک پہنچ جاتا ہوں۔

یہ سماج بھی ایک عجیب و غریب گورکھ دھندا ہے.....اس میں زندہ رہنے کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے.....آئے دن نت نئے مسائل سامنے آ کر راستہ روک لیتے ہیں ان کا بروقت سدباب نہ کیا جائے تو مسائل کی دیوار کے ساتھ سر ٹکرا ٹکرا کر پیوندِ خاک ہو جانا پڑتا

ہے۔ میں خود بھی بے شمار ایسے ہی مسائل کا شکار رہا ہوں...... مسائل امیر، غریب، لیڈر، حاکم محکوم، سرمایہ دار، کہانی کار، شاعر، ہر انسان کے یکساں نہ سہی لیکن ہوتے ضرور ہیں اور ہر ایک کو اُن سے نمٹنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا اور جو کچھ نہیں کرتا...... وہ...... اب کیا کہوں۔؟ میرے بھی بہت سارے مسائل تھے...... آپ سوچ رہے ہوں گے...... کون سے ......اور یہ اچانک غریب پروری کی باتیں چھوڑ کر بے کار باتیں کیوں لے بیٹھا...... نہیں یہ بے کار کی باتیں نہیں بلکہ ان کا تعلق میری پہلے کہی باتوں سے بہت گہرا ہے۔ میرا پہلا مسئلہ مکان کا تھا...... ایک خوب صورت بنگلہ ...... سجا سجایا ...... بنگلہ...... خواہش...... مسئلہ بن گئی...... دوسرا مسئلہ بیگم کے زیورات کا اچھے اچھے زیوارت...... تقابلی زیورات ملبوسات کا مسئلہ...... زمانہ کمپٹیشن کا ہے۔ بے چاری بیگمات کو کمپٹیشن کے اس عذاب سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ اور شوہروں کو......؟ ...... تیسرا مسئلہ بچّوں کی بہتر اور اعلا تعلیم کا اُن کے روشن مستقبل کا مسئلہ...... اور جوان ہونے پر اُن کی شادی کا مسئلہ...... مسئلے ہی مسئلے اور پھر زندگی کے چھوٹے بڑے کئی مسئلے......

میں بہت عرصے تک ان مسائل پر سوچتا رہا...... بیگم کے طعنے اور بچوں کی فرمائش بڑھتی ہی چلی جا رہی تھیں...... دوست مجھ پر ہنستے کہ میں نے خود کو بدلنے کی کوشش نہیں کی...... میں بھی اگر چاہتا تو اپنے دوسرے دوستوں کی طرح لوٹ کھسوٹ اور شوت کی رقوم سے اپنی جیب گرم کر کے ان مسائل کو حل کر سکتا تھا مگر نہیں ...... میں تو کہانی کار ہوں...... غریبوں، افلاس زدہ لوگوں، بھوک ونگ کے ستائے انسانوں اور بلاکشانِ تقدیر کی ترجمانی کرنے والا "کہانی کار" رشوت اور چور بازاری کا مخالف، کالے دھندوں، کالے بازار اور کالے کاروبار کا دُشمن، سرمایہ داروں، خون چوسنے والے بنیوں، ٹیکس چوروں، سرکاری خزانے کی لوٹ مچانے والوں کا نبّاض...... میں ایسا کیسے کر سکتا تھا...... میرا ضمیر مجھے ملامت نہ کرتا؟ میرے اندر کا کہانی کار بغاوت کر دیتا......؟ اور میرے اندر کا کہانی کار شاید خودکشی کر دیتا...... نہیں نہیں مجھے اس کو زندہ رکھنا تھا...... تا کہ میرا قلم چلتا رہے...... نشتر چبھتا رہے

پھوڑے پھوٹتے رہیں......گندہ مواد باہر آتا رہے......سماج کی بہتری کا کچھ تو کام مجھ سے ہو سکے۔اس لیے میں نے اپنے مسائل کے حل کے لیے ایک منفرد طریقہ ڈھونڈ نکالا......

میں اکثر اپنے محکمے کے چھوٹے بڑے کنٹریکٹ غریب محنت کشوں ہی کو دیتا ہوں......ان کی محنت کی کمائی کا پیسہ پیسہ میں چکا دیتا ہوں......اس میں انفرادیت بس اتنی سی ہے کہ لاکھ دو لاکھ کے کام پر بل اٹک کر دس لاکھ کا بن ہی جاتا ہے......باقی کی رقم کسی کو نقصان پہنچائے بغیر میرے اور میرے حکام بالا کے مسائل کو سلجھانے میری جیب میں پہنچ جاتی ہے۔ میں کسی غریب، مزدور، محنت کش، مفلس و نادار کو نقصان پہنچانے کا روادار نہیں ہوں......کیوں کہ میرا ضمیر زندہ ہے......میں ایک حساس دل کہانی کار کا ہوں......اب آپ ہی بتایئے کیسی لگی آپ کو میری تصویر......؟

............☆☆☆............

ڈاکٹر اشوک پٹواری

نام	:ڈاکٹر اشوک پٹواری
تاریخ پیدائش	:۲؍اکتوبر ۱۹۴۵ء
جائے پیدائش	:سوپور کشمیر
تعلیم	:ایم۔بی۔بی۔ایس، ایم۔ڈی
پیشہ	:پروفیسر (شعبۂ امراضِ اطفال)
تصنیف	: کچھ لمحے کچھ سائے
پتہ	: ریڈ ریس فلیٹ نمبر ۴،
	لیڈی ہارڈنگ میڈیکل کالج کمپس
	بنگلہ صاحب روڈ نئی دہلی
فون نمبر	09811220861
ای۔میل	akpatwari@hotmail.com

☆......اشوک پٹواری

فاصلہ ایک سانس کا!

شام لال نے جب تیسری مرتبہ اپنی گھڑی پر نظر ڈالی تو اُس کا شک یقین میں بدل گیا۔ گھڑی واقعی رُک گئی تھی۔ اُس کے سامنے سیکنڈ (second) والی سوئی رُکی پڑی اُس کا منہ چڑا رہی تھی۔

''ایسے کیسے گھڑی بند ہوسکتی ہے''؟ شام لال حیران تھا کیونکہ آج تک اُسے کبھی بھی ایسا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ جس کثرت سے وہ گھڑیاں بدلنے کا شوق رکھتا تھا، اُسے کبھی ایسا موقع ملنے کی امید بھی نہیں تھی۔ بہر حال ذاتی تجربہ نہ ہوتے ہوئے بھی......سب کو معلوم ہے کہ گھڑی رُکنے سے پہلے کوئی سگنل تو ضرور دیتی ہے۔ چاہے بیڑی (Battery) ختم ہوگئی ہو، کوئی اشارہ تو ضرور ملتا ہے کہ گھڑی میں کچھ خرابی ہے۔ بغیر کسی سگنل کے گھڑی کا رُک جانا شام لال کے لیے غیر معمولی بات تھی۔

شام لال کو اچھی طرح یاد تھا۔ صبح جب رامو نے حسبِ معمول ناشتہ لگایا تو گھڑی 9 بجا رہی تھی، جو صحیح وقت تھا کیونکہ ٹی، وی پر اُس وقت 9 بجے کی خبریں شروع ہوگئی تھیں۔ مگر جب رامو نے اُسے دوپہر کے کھانے کا وقت یاد دلایا تو شام لال یہ دیکھ کر حیران ہوگیا کہ اس کی گھڑی ڈیڑھ بجے کے بجائے 12 بجا رہی تھی۔ اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تو اُس نے ٹی وی آن کر دیا۔ ٹی وی پر روز کی طرح وہی ڈیڑھ بجے کا سیریل (Serial) چل رہا تھا جسے شام کو وہ پسند کرتا تھا۔ اور پھر جب اُس کی نظر رُکی ہوئی سیکنڈ (Second) کی سوئی پر پڑی تو شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی۔

اس سے پہلے کہ شام لال کچھ اور سوچتا، اچانک اُس کی نظر 12 بجے کے نشان پر

رُک گئی۔ایک شریری مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ جس طرح ایک قابل ڈاکٹر کے چہرے پر اُس وقت ایک فاتحانہ مسکراہٹ رقص کرنے لگتی ہے جب وہ مریض کی شکل دیکھتے ہی سپاٹ ڈائگنوسز (spot diagnosis) کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ دراصل منٹ اور گھنٹے کی سوئیاں ایک دوسرے سے لپٹ کر 12 بجے کے نشان پر اٹک گئی تھی۔ شام لال نے جھٹ سے سوئی کا بٹن اوپر کھینچا، دونوں سوئیوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا اور منٹ کی سوئی کو آگے پیچھے گھمانے لگا۔ کئی بار سوئیوں کو گھمانے کے بعد شام لال نے گھڑی کا بٹن دبا دیا تو اُسے پورا یقین تھا کہ اب جو ہوگا وہ اُس کے اندازے کے مطابق ہی ہوگا۔ مگر سیکنڈ والی سوئی اپنی جگہ سے بالکل نہیں ہلی۔ شام لال کو اس نتیجے کی قطعی امید نہ تھی۔ اُس نے گھڑی کے دندانوں کو صاف کیا اور پھر ایک بار سوئیاں گھمائی، مگر یہ سارے نسخے اور ٹوٹکے بیکار ثابت ہوئے۔

شام لال کی مایوسی کا تب کوئی ٹھکانہ نہیں رہا جب گھڑی ساز نے گھڑی کی اچھی طرح جانچ کر کے اندر سے صفائی کرنے کے بعد اُس کی بیٹری بھی بدل ڈالی، مگر گھڑی پھر بھی نہ چلی۔

اس سے پہلے شام لال گھڑی ساز سے کوئی سوال پوچھتا اُس نے اپنے چہرے پر سنجیدہ تاثرات لاتے ہوئے ایک جج کی طرح فیصلہ سنا دیا" انکل اب آپ نئی گھڑی خرید لیجیے، یہ والی تو اب گئی۔ کافی پرانی لگتی ہے"۔

کیا ایک بار پھر سروس کرنے اور کچھ مرمت کرنے سے ٹھیک نہیں ہوسکتی؟" شام لال کے لہجے میں ایک التجا تھی جیسے جج صاحب سے سزائے موت کو عمر قید کی سزا میں تبدیل کرنے کی گزارش کر رہا ہو۔

"نہیں انکل! اندر کی ساری گراریاں گھِس چکی ہیں۔ مرمت سے بھی ٹھیک نہیں ہوسکتی"۔ گھڑی ساز شام لال کی گھڑی اس طرح حقارت سے دیکھنے لگا جیسے وہ گھڑی نہیں کسی لاوارث کی لاش تھی۔

''اگر ساری گرایاں گھس گئی ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ۹ بجے تک گھڑی صحیح وقت دکھائے اور ۳ گھنٹے بعد ایک دم رُک جائے''۔ شام لال گھڑی ساز کے ڈائیگنوسز (diagnosis) اور دلیل سے متفق نہیں تھا۔

''تین گھنٹے تو کافی لمبا عرصہ ہے انکل! پُرانی گھڑیاں کئی مرتبہ پلک جھپکتے ہی دم توڑ دیتی ہے''۔

''مگر مکمل طور پر رُکنے سے پہلے کوئی علامت، کوئی سگنل تو ملتا ہے کہ گھڑی خراب ہے''۔ شام لال ابھی بھی اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ اُس کی گھڑی بالکل بے کار ہوگئی ہے۔

''اب میں کیا بتاؤں انکل! چاہے لوکل ہو یا امپورٹڈ (imported) پرانی گھڑیاں برسوں صحیح طریقے سے کام کرتے کرتے اچانک ہی رُک جاتی ہیں''۔

''پھر تمھارا کیا مشورہ ہے؟'' شام لال کو ابھی بھی امید تھی کہ دوبارہ سروس کروانے اور ایک آدھ گراری بدلوانے سے گھڑی پھر سے کام کرسکتی ہے۔

''میرے خیال میں آپ کو اب نئی گھڑی خریدنی چاہیے''۔ گھڑی ساز نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا اور کچھ اس طرح سے شام لال کی گھڑی سے منہ پھیر لیا جیسے کہہ رہا ہو ''مہربانی کرکے اس لاش کو یہاں سے ہٹا دیجیے''۔

دراصل بات صرف گھڑی کی نہیں تھی!

شام لال کو یوں بھی گھڑیاں بدلنے کا جنون تھا اور وہ ہر سال دو سال میں نئی گھڑی خریدنے کے لیے مشہور تھا۔ مگر یہ گھڑی اُس کے لیے خاص اہمیت رکھتی تھی۔ اُس کی بیوی شیلا دیوی نے شام لال کو اُس کی ۷۵ویں سالگرہ پر یہ گھڑی تحفے میں دی تھی۔ اس تحفے کی ایک خاصیت یہ بھی تھی کہ صبح ۶ بجے اس میں ''اُٹھ جاگ مسافر بھور بھئی......'' کی دُھن پر ایک خاص طرز بج اُٹھتی تھی جو شام لال کے لیے مارننگ الارم (morning alarm) کا کام دیتی تھی۔ اب شام لال کے لیے یہ تحفہ شیلا دیوی کی آخری یادگار بھی تھی کیونکہ چند ماہ قبل شیلا

دیوی کا دیہانت ہو گیا تھا۔

گھڑی کے ساتھ اس جذباتی رشتے کے علاوہ ایک اور بات تھی جو بار بار شام لال کے ذہن میں آ کر اُسے پریشان کر رہی تھی۔ گھڑی ساز نے بات گھڑی کی تھی مگر نہ جانے کیوں شام لال کو ایسا لگا جیسے کسی نے اس کی ڈکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ پرانی گھڑی اور بڑھاپے کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کر پا رہا تھا۔

گھر آتے ہی شام لال سیدھا اپنے کمرے میں جا کر آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''پرانی گھڑیاں کبھی بھی بند ہو جاتی ہیں انکل'' پگھلتے شیشے کی طرح اُس کے کانوں میں اُترنے لگا۔ ذہن میں اٹھتے ہوئے جوار بھاٹا پر قابو نہ پا کر شام لال نے زور سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ مگر یہ سوال اُس کے ذہن کے دریچوں سے داخل ہو کر جھنجھوڑتا رہا ''کیا ہر پرانی شے اس طرح اچانک کام کرنا بند کر دیتی ہے؟''

شام لال کے والدین جب فوت ہوئے تو کافی عمر رسیدہ تھے۔ دونوں موت سے پہلے شدید طور پر علیل رہے۔ کئی بار اسپتال میں بھرتی ہوئے اور کافی عرصے کی علالت کے بعد اُن کا سُرگباش ہوا۔ شیلا دیوی یوں ۷۰ سال کی ہی تھی مگر گردوں کی بیماری کی وجہ سے کافی تکلیف میں رہی۔ ڈائلسس (dialysis) اور وینٹی لیٹر (ventilater) کے سہارے اُس کی سانسیں چلتی رہیں اور آخر ایک دن اس کی سانس مکمل طور پر رُک گئی۔ ڈاکٹروں نے اُسے برین ڈیڈ (brain dead) قرار دیا۔ اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر شام لال کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ ''موت سے پہلے کئی علامتیں نظر آتی ہیں۔ حادثوں کی بات اور ہے۔ مگر ایک تندرست انسان چاہے وہ بوڑھا ہی کیوں نہ ہو، ایسے کیسے اچانک دم توڑ سکتا ہے......'' یہی ایک سوال تھا جو بار بار اُس کے دل و دماغ پر ایک عجیب سی کیفیت برپا کر رہا تھا۔

اسّی سال کی عمر میں بھی شام لال کافی چُست اور تندرست تھا۔ اُسے ہمیشہ سے ہی اس بات پر فخر تھا کہ برسوں کی کسرت اور یوگا (yoga) کی پریکٹس (practice) سے اُس نے اپنے آپ کو صحیح معنوں میں maintain کر رکھا تھا۔ مگر گھڑی ساز کے ساتھ ہوئی بات

چیت کے دوران نہ جانے کیوں اُسے آپ پر سے بھروسہ ہی ختم ہونے لگا۔ وہ آخر اس بات کو کیسے نظر انداز کرتا کہ وہ واقعی وہ بوڑھا تھا...... پرانا......اُس کی گھڑی کی طرح!

شام لال کے ذہن میں عجیب عجیب سے خیال آنے لگے۔ آرام کرسی آگے پیچھے جھول رہی تھی۔ ایک پنڈولم (pendulum) کی طرح......اور کُرسی سے آتی ہوئی ٹک ٹک کی آواز...... گھڑی کے ٹک ٹک کی طرح ......وقت کے دبے پاؤں چلنے کی آواز کی طرح...... اُس کی آنکھوں کے سامنے سنیما کی متحرک تصاویر کی مانند کئی منظر آتے گئے، جاتے گئے...... چہرے نمودار ہوئے......اور پھر غائب ہو گئے۔ خیالات کی پرواز نہ جانے اُسے کہاں کہاں اڑاتی چلی گئی۔

شام لال کی آنکھوں کے سامنے اُس کے دادا جی کا رعب دار چہرہ آ گیا۔ دادا جی مرتے دم تک چُست اور تندرست تھے۔ دراصل شام لال کو یوگا (yoga) اور کسرت کی عادت اُن سے ہی ورثے میں ملی تھی۔ دادا جی کو شام لال کے ساتھ بے حد لگاؤ تھا۔ تبھی تو اُس روز دادا جی نے اُسے کہا تھا''شام! مجھے معلوم ہے تمھیں آج رپورٹ کارڈ ملنے والا ہے۔ تم وہ رپورٹ سب سے پہلے مجھے دکھانا، میں نے تمھارے لیے ایک بڑھیا انعام لے کر رکھا ہے"......شام لال نے اُچھل کر دادا جی کو ہاں کہا اور بائے بائے کرتے ہوئے اسکول چلا گیا۔

اُس روز جب شام لال دوپہر کے وقت اسکول سے واپس آیا اور دوڑ کر دادا جی کے کمرے کی طرف بھاگنے لگا تو ڈرائنگ روم میں بیٹھے لوگوں کا ہجوم دیکھ کر اُس کا ماتھا ٹھنکا۔ کمرے سے سارا فرنیچر باہر نکالا گیا تھا اور لوگوں کی بھیڑ کے درمیان دادا جی آنکھیں موندے فرش پر لیٹے ہوئے تھے۔

''شام بیٹے! دادا جی کے منہ میں گنگا جل ڈال دو......'' شام لال کے والد نے اُسے اپنے پاس بلاتے ہوئے کہا۔

شام لال کم سن ہوتے ہوئے بھی حالات کی سنجیدگی بھانپ گیا۔ دادا جی کے منہ میں گنگا جل ڈالتے ہوئے اُس کے ذہن کے کسی گوشے میں اب بھی یہ امید باقی تھی کہ ابھی

داداجی آنکھیں کھول کر پوچھیں گے'' شام! تمھارا رپورٹ کارڈ کہاں ہے......'' شام لال یقین نہیں کر پا رہا تھا کہ اب داداجی نہیں رہے۔ کچھ گھنٹے پہلے ہی تو شام لال اپنے داداجی کو بائے بائے کر کے اسکول گیا تھا۔

''تین گھنٹے کا عرصہ کافی لمبا ہے انکل، پرانی گھڑیاں تو کئی مرتبہ پلک جھپکتے ہی رُک جاتی ہیں''۔

گھڑی ساز کا فقرہ ایک تیز نشتر کی طرح شام لال کے دل میں پیوست ہو گیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی اُس کو اس بات کا احساس ہونے لگا کہ گھڑی ہو یا انسانی جسم، آخر ایک مشین ہی تو ہے۔ جس طرح پرانی گھڑی بنا کسی سگنل کے اچانک رُک سکتی ہے، اُسی طرح ایک تندرست جسم بھی بنا کسی بیماری کے یکدم کام کرنا بند کر سکتا ہے۔ اُسے اس بات پر یقین ہونے لگا کہ زندگی اور موت کے درمیان صرف ایک سانس کا فاصلہ ہے۔ اور کون جانے کب کس کی سانس رُک جائے۔ خاص طور پر شام لال جیسے بوڑھے لوگوں کی، جن کا جسم پرانا ہو چکا ہو، جن کے اندر کی ساری گراریاں گھِس گئی ہوں۔

شام لال خود اپنے ہی خیالات سے خوفزدہ ہو کر گھبرا گیا۔ ہڑبڑا کر اُس نے آنکھیں کھولیں اور گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ آرام کرسی سے ابھی بھی ٹِک ٹِک کی آواز آ رہی تھی۔ شام لال ایک دم کُرسی سے اُٹھا اور اپنے وکیل کو فون لگایا۔ مگر بدقسمتی سے بار بار کوشش کرنے کے باوجود نمبر نہیں ملا۔ ایک عجیب سی کیفیت اُس پر غلبہ پانے لگی۔ اُسے افسوس ہونے لگا کہ اب تک اُس نے اپنی وصیت کیوں تیار نہیں کروائی۔ زمین و جائیداد کے کاغذات، بینک اکاؤنٹ (bank account) اور شیئر سرٹیفکٹ (share certificate) کچھ بھی تو نہیں کیا اُس نے۔ کارِ جہاں میں اُلجھ کر اس بات کا احساس ہی نہ ہوا کہ موت کبھی بھی دبے پاؤں آ کر دستک دے سکتی ہے۔ ایسے حالات میں ضروری دستاویز مکمل کرنا اور بچوں کے نام ٹرانسفر (transfer) کروانا بے حد ضروری تھا مگر بدقسمتی سے وکیل کا نمبر ہی نہیں مل رہا تھا۔

ٹیلی فون ڈائرکٹری (telephone directory) کے ورق الٹتے ہوئے اُس کی نظروں کے سامنے ایک اور نام گزرا جسے دیکھتے ہی شام لال کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ اور اُس کے بچپن کے دوست اور بزنس پارٹنر (business partner) سلیم خان کا مسکراتا ہوا چہرہ اُس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ کاروبار میں کچھ کہا سنی کی وجہ سے برسوں پہلے شام لال نے سلیم خان سے قطعِ تعلق کر رکھا تھا۔ برسوں بعد جب سلیم خان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وہ خود چل کر شام لال سے معافی مانگنے آیا تھا۔ مگر شام لال کے اندر برسوں کی رنجش کا زہر اتنا زیادہ پھیلا ہوا تھا کہ اُس نے سلیم سے بات تک نہ کی مگر اس وقت جب اُس کے ذہن میں زندگی اور موت کا فاصلہ صرف ایک سانس سے جڑا ہوا تھا، اُس کے ضمیر نے اُسے جھنجھوڑا۔ ''دوست آخر دوست ہے اور معاف کرنا ایک صفت ہے''۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی جیسے اُس کے ذہن سے سلیم کی ساری غلطیوں کی فہرست ہی غائب ہوگئی۔ اُس کے سامنے پھر وہی اسکول یونیفارم (uniform) پہنے اُس کا پیارا دوست سلیم کھڑا تھا۔ اُن دونوں کے درمیان بے لوث شفقت اور معصوم شرارتوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ سلیم سے بات کرنے دل چاہا۔ شام لال بے قرار ہوا اُٹھا اور جھٹ سے اُس نے سلیم کا فون ملایا۔

مگر سلیم خان کا نمبر ہی غلط یعنی not in service نکلا۔ اتنے عرصے میں سلیم نے نہ جانے کتنے فون بدل دیے ہوں گے۔ شام لال کو شاید اس بات کا اندازہ نہیں تھا۔

شام لال کے ذہن پر مایوسی کا سایہ کچھ اس طرح چھا گیا کہ اُسے اپنے نامکمل کام کے سوا کچھ اور یاد ہی نہیں آ رہا تھا۔ فہرست لمبی ہوتی جا رہی تھی اور نہ جانے کیوں اُسے لگ رہا تھا کہ ہر لمحے کے ساتھ اُس کے ہاتھ سے وقت نکلتا جا رہا تھا۔ اُسے اپنے آپ پر غصہ بھی آ رہا تھا اور ترس بھی۔ بے بسی کا عالم اُس کے وجود پر غالب ہوا اور وہ ایک کٹے درخت کی طرح گرتے آرام کرسی میں دھنس گیا۔ شام لال کو لگا جیسے گھڑی کی سیکنڈ کی سوئی کی طرح اُس کے دل کی دھڑکن بھی رُک گئی۔ جیسے وقت تھم گیا ہو۔ اُس کی سانس بند ہوگئی ہو......اور کوئی غیبی طاقت اُسے کرسی سے کھینچ کر اٹھا لے گئی ہو۔

شام لال کافی دیر تک نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑا رہا، مگر اُس کا ذہن ایک تنکے کی طرح تیز ہوا میں اُڑتا رہا۔ بنا منزل کے بھاگتا رہا۔

تبھی اُس کی جیب سے آتی ہوئی آواز نے اُس کے خیالات کا سلسلہ منتشر کر دیا۔ وہی جانی پہچانی دُھن ''اُٹھ جاگ مسافر بھور بھئی'' اُسے سنائی دی۔ اُس نے آنکھیں کھول کر جب گھڑی کو دیکھا تو وہ صبح کے 6 بجے رہی تھی۔ سکینڈ (second) کی سوئی پہلے کی طرح ٹکِ ٹکِ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ وقت تھما نہیں بلکہ گزر رہا تھا۔

اچانک شام لال کو گھڑی ساز کی ایک اور بات یاد آئی جو خیالات کے اُمنڈتے ہوئے طوفان میں کہیں گُم ہوگئی تھی۔

''ان پرانی گھڑیوں کا کوئی بھروسہ نہیں انکل، کبھی کبھی اپنے آپ ہی دوبارہ سے چلنے لگتی ہے''۔

............☆☆☆............

آنند لہر

نام :شام سندر آنند
قلمی نام :آنند لہر
تاریخِ پیدائش :۲رجولائی ۱۹۵۱ء پونچھ
تعلیم :بی۔ایس۔سی،ایل،ایل،بی
افسانوی مجموعے :سرحد کے اُس پار(۲۰۰۱)،انحراف،بٹوارہ(۲۰۱۱)
ناول :پہلا ناول اگلی عید سے پہلے(۱۹۹۲)،سرحدوں کے بیچ،مجھ سے کہا ہوتا(۲۰۰۴)
اعزازات :راجستھان اردو اکیڈیمی ایوارڈ، اترپردیش اردو اکیڈیمی ایوارڈ، میر اکیڈیمی ایوارڈ لکھنو، امریکن بایوگرافیکل انسٹی ٹیوٹ ایوارڈ،جموں یونیورسٹی اردو ایوارڈ
پتہ :۱۹ر بخشی نگر جموں
فون نمبر :0191-2546992,0191-2582651

❖

☆......آنند لہر

دادی اماں

راجہ اور گوپی ایک عجیب اُلجھن میں تھے۔ اُنہیں لگ رہا تھا کہ زندگی کا سفر دھاگے کی طرح ہے، جس میں قدم قدم پر گانٹھیں لگی ہیں۔ پہلی گانٹھ اُس وقت لگی جب اُن کی ماں مری۔ اُن کے باپ نے دوسری شادی کی تو یہ دوسری گانٹھ تھی اور جب وہ چلا گیا تو تیسری گانٹھ لگی۔ یہ گانٹھ بھی کیا چیز ہوتی ہے کہ چیز کا وجود تو پورا رہتا ہے مگر اُس کی لمبائی کم ہو جاتی ہے۔ گویا کہ عمر کے دھاگے پر لگے تو یوں لگتا ہے کہ زندگی تو پوری ہے مگر جینے کے دن کم ہو جاتے ہیں۔ مگر اب کی بار جو گانٹھ لگی تھی اُس سے تو پورے دھاگے کے وجود کو ہی خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔

ہوا یہ تھا کہ راجہ نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے دیش سے باہر جانا تھا، مگر روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے دونوں بھائی کافی پریشان تھے۔ اُن کے پاس دادا کی لکھی ہوئی وصیت تھی جس کے مطابق وہ لاکھوں روپوں کی جائیداد کے مالک ضرور تھے، مگر یہ سب اُنہیں دادی کی موت کے بعد ملنا تھا۔ اُن کے دادا گلاب نے بڑی زوردار آواز میں لکھا تھا۔

''میں جب تک زندہ ہوں خود مالک رہوں گا۔ میرے مرنے کے بعد میری زوجہ اور اُس کے بعد میرے پوتے راجہ اور گوپی برابر کے مالک ہوں گے''۔

اُن دونوں کو دادی نے بڑی چاہ کے ساتھ پالا تھا کیونکہ اُن کا والد جب دوسری بیوی کے ساتھ چلا گیا تو ایک وہی اُن کا سہارا تھی۔ وہ اُن کے کپڑے دھوتی، نہلاتی، کھانا پکاتی اور اسکول بھیجتی۔ دادی اُنہیں دُنیا کی سب سے مضبوط ترین چیز لگی اور حقیقت میں وہ

مضبوط ثابت ہوئی تھی۔ رات کو انہیں بستر پر سلا دینا اور خود فرش پر سونا، انہیں گرم کپڑے پہنانا اور خود سردی میں ٹھٹھرنا، انہیں تازہ کھانا دینا اور خود بچا کھچا کھانا، یہ سب اس عورت کی مضبوطی کی علامتیں تھیں۔

اُن کی جماعت کا استاد بھی اس عورت سے ڈرتا تھا۔ کہیں اگر دادی کو معلوم ہو جائے کہ اس کے پوتے کو کسی نے مارا ہے تو وہ اسکول جاتی اور ماسٹر کو ڈر سے اسکول سے ہی بھاگنا پڑتا۔ ایک بار ایک دوست نے راجہ کو کچھ بُرا بھلا کہا تو راجہ نے صرف اتنا کہا۔ ''میں آج دادی سے شکایت کروں گا''۔ بس ایک ہنگامہ سا مچ گیا۔ سب نے مل کر راجہ کو ٹافیاں کھلائیں اور اس سے وعدہ لیا کہ وہ اپنی دادی سے کچھ نہ کہے گا۔

اور سچائی یہ بھی تھی کہ اُسے کوئی کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ وہ اتنے زور سے چیختی کہ اس کی آواز سے کان پھٹنے لگتے۔ وہ دونوں پوتے اسے حد سے زیادہ پیارے تھے۔ خود کب کھانا کھاتی کسی کو معلوم نہ تھا۔ کھاتی بھی ہے کہ نہیں محلے کے لوگ اِس بات پر بحث کرتے، مگر ان دونوں کے لئے کھانا مزے دار ہو اور تازہ۔ رات کو باہر سوتی تا کہ کوئی اندر نہ جا سکے۔

ہر شادی بیاہ کا چرچہ یہی تھا۔ جب بھی جاتی سب سے پہلے پوتوں کے لئے کھانا ڈلواتی۔ پوریاں، آلو اور پھر مٹروں اور پنیر سے بھرے ہوئے برتن سے خوب طریقے سے پنیر چراتی، شور کرتی، کہتی ''میں نے لیا ہی کہاں ہے؟'' اُن دونوں کی زندگی بھی دادی ہی تھی۔ وہ اُس کے لئے جیتے اور اُس کے لئے مرتے۔ وہ ماں باپ کو دی جانے والی گالی برداشت کرتے مگر دادی کو کوئی اگر کچھ کہہ دیتا، آخری لڑائی لڑنے کو تیار ہو جاتے۔

دادی کی دُعا رنگ لائی اور راجہ کو بدیش میں سیٹ مل گئی، مگر روپوں کا انتظام کہاں سے ہوگا۔ راجہ اور گوپی کو اس کی فکر ستانے لگی۔

دادی نے کہا ''گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے'' وہ اندر گئی اور ایک ٹرنک اُٹھا کر لائی اور روپوں کے سکّے زمین پر گرادئے اور بڑے فخر سے کہنے لگی ''اُٹھا لو جتنے اُٹھانے ہیں''۔ مگر اُس غریب کو معلوم نہ تھا کہ یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اُس نے

ایک ایک روپیہ بڑی مشکل سے اِکٹھا کیا تھا۔

اُس ایک ایک روپے کے اندر کئی کہانیاں بسی تھی۔ کئی بار دیوالی کی مٹھائی کم لائی گئی تھی۔ کئی بار رات کو دیا بجھا دیا گیا تھا تا کہ ایک روپیہ بچ جائے۔ ایک بار اُس نے کپڑے سلوائے تو درزی نے بٹن کم لگائے۔ وہ کم بٹنوں والے کپڑے کم مزدوری دے کر لائی اور ایک روپیہ بچاتے ہوئے کہنے لگی اسی میں گزارا کرلیں گے۔ ایک بار اس نے نائی سے جھگڑا کیا کہ اٹھنی کم دی تھی۔ کچھ روپے تو چائے میں دودھ کم ڈال کر بچائے گئے تھے۔ یہ تمام باتیں ظاہر کرتی تھیں کہ ایک غریب کیسے روپے جمع کرتا ہے۔ اُس کے چہرے سے ایک اطمینان ظاہر ہو رہا تھا۔ لگتا کہ زندگی کے ہر لمحے کو وہ بوڑھی عورت جیت رہی ہے۔ اُس نے یہ سارے سکے اس طرح بھی جمع کیے کہ کئی بار صابن کم استعمال کیا اور کپڑے دھونے میں جسم زیادہ استعمال کیا۔ اس نے کئی راتوں کو کم چپاتیاں کھائیں۔

مگر اُس غریب عورت کو یہ کہاں معلوم تھا کہ یہ روپے تو کچھ بھی نہ تھے۔ راجہ اور گوپی اس بات پر ہنسے اور چپ ہو گئے۔ زمین کے کاغذ لے کر وہ تمام بینکوں میں گئے، سب آفیسروں کے پاس بھی گئے، مگر ہر ایک نے کہا کہ دادی کے مرنے کے بعد ہی وہ اس زمین کے مالک بن سکتے ہیں۔ اُنہیں اپنے سپنے ٹوٹتے ہوئے نظر آئے اور دادی ایک فضول سی چیز۔ جب اُنہیں ہر طرف سے نا اُمیدی ہوئی تو آپس میں مشورہ کرنے لگے۔ ''بوڑھی اگر مرجائے تو اُس کا کیا بگڑ جائے گا؟'' راجہ نے کہا۔ اب جی کر بھی کیا کرے گی؟'' گوپی نے سرگوشی کی۔ اُنہوں نے سوچا تھا کہ راجہ بدیش جائے گا، کروڑوں روپے کما کر لائے گا۔ پھر وہ دونوں ایک بہت بڑا مکان بنائیں گے، موٹر سائیکل پر بیٹھ کر لڑکیاں چھیڑیں گے، مرضی کے کپڑے پہنیں گے اور دادی کی خوب سیوا کریں گے۔ گوپی نے تو اپنا حصّہ گروی رکھنے کا منصوبہ بھی بنا لیا، مگر دادی کی زندگی اُن کے راستے میں رُکاوٹ تھی۔

''مجھے لگتا ہے کہ اس بوڑھی سے تنگ آ کر ہی ہمارے باپ نے دُوسری شادی کی تھی......'' راجہ نے کہا۔

''ہماری ماں کے مرنے کی وجہ بھی یہی بوڑھی رہی ہوگی''۔

اُنہوں نے اُس سے نفرت کرنے کی کوشش کی مگر پھر اُنہیں وہ تمام باتیں یاد آ گئیں جو بچپن میں اُن کے ساتھ پیش آئیں تھیں۔ اُنہیں نہ چاہتے ہوئے بھی یاد آیا کہ کس طرح وہ اُنہیں دودھ پلاتی تھی، نہلاتی تھی، کھانا کھلاتی تھی اور سب سے بڑی بات کہ پیار کرتی تھی۔

''اگر دادی نہ ہوتی تو کسی بھی صورت میں ہم زندہ نہ ہوتے''۔

''مگر اب کیا کیا جائے، ہماری ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہی یہی ہے''۔

''کیوں نہ اُسے آرام سے مارا جائے''۔ راجہ نے کہا۔

''وہ کیسے......؟'' گوپی نے سوال پوچھتے ہوئے کہا۔

''چاقو سے ماریں اُسے؟''

''نہیں۔ اِس سے اُسے بڑی تکلیف ہوگی اور پھر تمہیں یاد ہوگا کہ ایک بار میری اُنگلی کو ذرا سا چاقو لگ گیا تھا تو دادی اُنگلی کو اپنے منہ میں ڈال کر گھنٹوں چوستی رہی تھی......''

''پھر گرا دیں چھت سے؟''

''نہیں نہیں۔ یاد ہے ایک بار میں گرا تھا اور میرا پاؤں مڑ گیا تھا۔ رات بھر اُس عورت نے میرے پاؤں کو اپنی چھاتی پر رکھا تھا''۔

''کسی طریقے سے روٹی میں زہر ملا کر دے دیں اسے؟''

''نہیں۔ ایک بار میری بوا نے مجھے باسی روٹی دی تھی اور دادی دوبارہ کئی مہینوں تک اُس کے گھر نہ گئی تھی۔ اُسے وہم تھا کہ یہ باسی روٹی زہر ہوتی ہے''۔ راجہ نے گوپی کو جواب دیتے ہوئے کہا۔

''لیکن اب کیا کریں......؟'' وہ دونوں یہ سوچتے ہوئے گہری نیند سو گئے۔ رات بھر کروٹیں بدلتے ہوئے کئی خواب دیکھے اُنہوں نے۔

صبح ہوئی۔ وہ اچانک جاگ گئے۔ دادی کو اُنہوں نے وہاں نہ دیکھا۔ گھبرائے

ہوئے چار پائی کے نزدیک گئے۔ اُنہوں نے دکھا کہ وہ مری پڑی ہے، جیسے صدیوں سے سو رہی ہو۔ پھر نیچے ایک کاغذ کا ٹکڑا پڑا ہوا تھا، جس پر ٹوٹے ہوئے لفظوں میں لکھا تھا۔ ''پیارے بچو، کپڑے کچھ دِنوں کے لئے دھو چکی ہوں، سویٹر دُوسرے بڑے ٹرنک میں ہیں۔ راجہ تمہیں کہہ دُوں کہ بدیش جا کر اپنی صحت کا خیال رکھنا اور کھانا بنا پڑا ہے۔ جب مجھے جلا کر آنا تو فوراً کھالینا، بھوکے نہ رہنا''۔

............☆☆☆............

دیپک بدکی

نام :دیپک کمار بدکی

قلمی نام :دیپک بدکی

تاریخ پیدائش ۱۵فروری ۱۹۵۰ءسرینگر کشمیر

تعلیم :ایم۔ایس۔سی،بی۔ایڈ

تصانیف :تنقید......۲،عصری تحریریں(۲۰۰۶)،عصری شعور(۲۰۰۹)

افسانوی مجموعے :ادھورے چہرے

چنار کے پنجے

زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی

اعزازات :راشٹریہ گورو ایوارڈ (۲۰۰۹)، آندھرا اردو اکادمی ایوارڈ،

سد بھاونا منچ سرونج ایوارڈ

پتہ ۱۰۲۔اے۔ایس۔جی امپریشنز،سیکٹر۴۔بی۔

وسُندھرا، غازی آباد......۲۰۱۰۱۲

فون نمبر 09868271199

☆......دیپک بدکی

دس انچ زمین

زر، زمین وزن دنیا کی سبھی لڑائیوں کی جڑ اور پھر زمیں تھی بھی کتنی، صرف دس انچ۔ آپ سوچتے ہوں گے کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ گھبرائیے نہیں آگے قصہ سنیئے۔

یہ کہانی دو چچیرے بھائیوں کی ہے۔ گردھاری لال اور جواہر لال۔ دونوں کے مکان، جو انہیں وارثت میں ملے تھے، ملحق تھے۔ سوڈیڑھ سو سال پرانے لکھوری اینٹوں کے مکان، بوسیدہ ٹپکتی چھتیں اور جھرجھر دیواریں۔ سنا ہے وقت کے ساتھ ساتھ ان پر بھی دھول اور مٹی جم گئی تھی۔ پرانے زمانے میں جواہر لال کے مکان کا دروازہ براہِ راست عقبی گلی کی طرف کھل جاتا تھا لیکن اب اس کا کہیں نام ونشاں بھی نہیں ملتا۔ حالانکہ اس کے مکان کے سامنے کافی بڑا صحن تھا مگر وہ چاروں جانب گھرا ہوا تھا۔ اس کے برعکس گردھاری لال کے مکان کا دروازہ صحن کی جانب کھلتا تھا اور سیدھا سامنے والی گلی سے جا ملتا تھا جس کے باعث پڑوسیوں کو آگے سے نکلنے کا کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ وقت کی گرد ایسی جم گئی کہ عقبی دروازہ زمین میں دھنس گیا اور گردھاری لال کی زمین عام راستہ بن گئی۔ البتہ اسے یہ احساس ہمیشہ کچوکتا رہا کہ یہ زمیں اس کی ملکیت ہے۔ کبھی کبھی وہ فخریہ انداز میں اعلان کر دیتا کہ اس کی زمین آگے گلی سے جا ملتی ہے اور اگر وہ چاہے تو اپنے چچیرے بھائی کی ناکہ بندی کر سکتا ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ اس کا یہ خواب کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ ہوتا بھی کیسے؟ جو زمین برسوں سے راہِ عام بن چکی تھی اس پر پھر سے نجی حق جتانا قانوناً ممکن نہ تھا۔ خیر، دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا تھا۔ لوگ تو اس بات کو بھول چکے تھے مگر گردھاری لال

کے لیے بھول پانا مشکل تھا۔

بہر حال اب مسئلہ کچھ اور ہی تھا۔ پڑوسیوں کے بیچ مسئلے پیدا ہونے میں کون سی دیر لگتی ہے۔ وہ چاہے انسان ہوں یا ممالک۔ چنانچہ گردھاری لال کی قسمت نے یاوری کی تھی اور اس کے گھر میں دولت کی ریل پیل نظر آ رہی تھی، اس لیے پڑوسیوں کے دلوں میں جلن پیدا ہونا فطری تھا۔ کسی مغربی ملک کا باشندہ ہوتا تو اپنے کنبے کو لے کر دنیا کی سیر کرنے چلا جاتا مگر شوق کی روایات ان چیزوں کی اجازت کہاں دیتی ہیں۔ عمریں گزر جاتی ہیں تلاشِ تحفظ میں۔ پہلے گھر چاہیئے، پھر چلنے پھرنے کے لیے موٹر چاہیئے، اس کے بعد بیٹے بیٹیوں کی شادی کی فکر ستانے لگتی ہے۔ فرصت ملی تو پوتے پوتیوں کی بہار دیکھنے کو بھی جی کرتا ہے۔ اس پسِ منظر میں سیر سپاٹے فضول لگتے ہیں۔ گردھاری لال بھی لکیر کا فقیر نکلا۔ بنکوں کی آنکوں میں دھول جھونک کر اونچی دَروں پر تجارتی قرضہ اٹھالیا اور لگا اپنے مکان کی از سرِ نو تعمیر کرنے یا یوں کہیئے اپنے چچیرے بھائی کی چھاتی پر مونگ دھلنے۔

اس شہر کے میونسپل قانون بھی عجیب وغریب ہیں۔ اگر سارا مکان گرا دیا جاتا تو ایک چوتھائی زمیں سے ہاتھ دھونا پڑتا۔ دونوں طرف گلیوں کی چوڑائی کی خاطر دس دس فٹ کی زمیں چھوڑنی پڑتی۔ اس کا واحد علاج بس یہی تھا کہ ابتدا میں بالائی دو منزلوں کو عارضی طور پر شہتیروں کے سہارے کھڑا کیا جاتا اور پھر مکان کی صرف پہلی منزل گرا کر اس کی از سرِ نو تعمیر کی جاتی جو بقولِ قانون سازوں کے مرمت کے زمرے میں آتا ہے۔ پہلی منزل بن جانے کے بعد ایک ایک سال کے وقفے پر دوسری اور تیسری منزل کی مرمت بھی اسی ڈھنگ سے ممکن تھی۔

گردھاری لال نے جونہی پہلی منزل کی تعمیر کا کام شروع کروایا سارے محلے میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کے اور جواہر لال کے مکان کے درمیان تقریباً دس انچ کا گیپ پیدا ہو گیا تھا۔ راج مستری نے شقاوُل لگا کر اس دراڑ کو کم کرنے کی کوشش کی مگر اس کی کارروائی کو دیکھ کر جواہر لال کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس سے رہا

نہ گیا اس لیے فوراً اپنا ردِ عمل ظاہر کیا۔

''آپ ایسا نہیں کر سکتے، یہ شگاف آپ کے مکان کے سبب نہیں بلکہ ہمارے مکان میں خم پیدا ہونے کے باعث پیدا ہو چکا ہے۔ اس لیے آپ اپنی دیوار دس انچ دور رکھیں تو بہتر ہوگا''۔

''یہ شگاف میرے مکان کے جھکاؤ کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اس لیئے مجھے اس کو بھرنے سے کوئی نہیں روک سکتا''۔ گردھاری لال نے ٹکا سا جواب دیا اور مستری کو کام چالو رکھنے کا اشارہ کیا۔

سچ تو یہ تھا کہ اتنے برس بیت جانے کے بعد کوئی وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ دراڑ کس طرح پیدا ہو چکی تھی۔ گردھاری کا کہنا تھا کہ دس انچ کا یہ فاصلہ اس کی ملکیت ہے اور وہ کسی حال میں بھی اسے چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے عورتوں نے اس مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسی بہانے ایک دوسرے کی کئی پیڑھیوں کی بیخ کنی کی۔ اس کے بعد مردِ میدان میں اترے اور راست مغلظات پر اتر آئے ننگی ننگی ناخوشگوار گالیاں۔ جن لڑکیوں کو چند روز پہلے بیٹی کہہ کر پکارتے تھے اب انہیں اپنے بستر میں لٹانے لگے۔ جواہر لال نے سارا محلّہ اکٹھا کر لیا مگر بات پھر بھی نہیں بنی۔ گردھاری لال کو اپنی قوتِ بازو کا علم تھا سو اس کا راج مستری بے خوف اپنا کام کرتا چلا گیا اور ایک ہی دن میں اس طرف کی دیوار کھڑی کر دی تا کہ جواہر لال کورٹ سے حکمِ التوانہ لا سکے۔

جواہر لال نے جیسے تیسے یہ صدمہ برداشت کر لیا مگر اس کی راتوں کی نینداور دن کا چین جاتا رہا۔ دو دن بعد اس کے ذہن میں یکایک بجلی سی کوندی اور اس نے بازار سے کدال اور دیگر اوزار خرید لیے۔ اسی رات وہ دوسری منزل کی دیوار میں، جو گردھاری لال کی دیوار سے ملی ہوئی تھی اور جہاں اس کی رسوئی تھی، چمنی کے لیے بڑا سا چھید کرنے میں مصروف ہو گیا۔ کہاوت مشہور ہے کہ ایک آدمی کے ہاں بیٹا نہیں تھا مگر پڑوسی کے حسد میں اس نے بیٹی

کا ختنہ کروایا۔

رات بھر ہتھوڑوں کی چوٹیں اور کدالوں کی ضربیں پڑوسیوں کے کانوں کو چھیدتی رہیں اور وہ لاچار یہ آوازیں سنتے رہے لیکن کچھ بھی نہ کر پائے۔ گردھاری لال نے کئی بار اٹھ کر کھڑکی کے باہر جھانکنے کی کوشش کی پھر بھی کوئی سراغ نہ پاسکا۔ دوسرے روز راج مستری کی مدد سے کچن کی چمنی کا رخ اسی جانب پھیر لیا گیا تاکہ سارا دھواں دو مکانوں کے بیچ والی دراڑ سے نکلتا رہے۔ اگلے روز جب گردھاری لال کی نظر شگاف میں سے نکلتے ہوئے دھوئیں پر پڑی تو وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے حسبِ دستور احتجاج کیا مگر جواہر لال کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ ایک بار پھر قانون ہاتھ ملتا رہ گیا۔

اب مشکل یہ تھی کہ گردھاری لال کو دوسری اور تیسری منزل کی دیوار بنانے کے لیے قانوناً اس طرف دو فٹ کی جگہ چھوڑنا لازمی تھا اور اس میں اب کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

اس دوران جواہر لال نے کورٹ سے حکمِ التوا لایا جس کی رو سے گردھاری لال آگے مکان کا کوئی بھی کام جاری نہ رکھ سکا۔ اس حادثے کو دس سال سے زیادہ گزر چکے ہیں مگر کورٹ نے آج تک کوئی فیصلہ نہیں دیا۔ گردھاری لال کے مکان کی بالائی منزل ایسے لگ رہی ہیں جیسے کسی قالین پر پیوند لگا ہوا ہو۔

اس روز کے بعد دونوں پڑوسی ایک دوسرے سے کترا کر چلتے ہیں۔ ان کے افرادِ خانہ جو کل تک ایک دوسرے کو بھائی بہن کہتے تھے اب من ہی من گالیاں دے کر گزر جاتے ہیں۔ کئی بچوں کی شادیاں ہوئیں لیکن کیا مجال کہ پڑوسی اس میں شرکت کرتے۔ کئی بزرگوں نے راہِ عدم اختیار کیا پھر بھی پڑوسیوں نے شرکت کرنا مناسب نہ سمجھا۔

دو مکانوں کے درمیان دس انچ کی یہ گیپ آج تک اپنی جگہ پر قائم و دائم ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ شگاف دونوں پڑوسیوں پر خندہ زن ہے۔

......☆☆☆☆............

راجہ نذر بونیاری

نام	:عبدالقیوم خان
قلمی نام	:راجہ نذر بونیاری
تاریخ پیدائش	:۲؍جنوری ۱۹۴۹ء ترکانجن، بارہمولہ
پیشہ	:رٹائیرڈ سرکاری ملازم
افسانوی مجموعے	:دوسرا آدمی (۱۹۷۱)
	یہ کس کی لاش ہے میرے کفن میں (۲۰۰۸)
پتہ	:ترکانجن، اوڑی، بارہمولہ، کشمیر
فون نمبر	9697428024

☆......راجا نذر بونیاری

سی فار......کیوٹ

خواجہ صاحب کے خوبصورت لان میں بچوں کی دل بہلائی اور کھیل کود کیلئے ہر وہ چیز موجود تھی جو ۲ سال سے ۱۷/۱۸ سال کے بچوں کی دلچسپی کا باعث بن سکتی تھی۔ مثلاً ''اپ اینڈ ڈاؤن'' ''بیڈمنٹن کوٹ'' ''کیرم بورڈ'' ''شوٹنگ بٹ'' وغیرہ۔ خواجہ صاحب کے تو اپنے چھ چاند اور لعل تھے اور دو منیاں۔ ان کی عمریں ۵ سال سے ۲۰ سال کے درمیان تھیں۔ ۵ سال کا ہارون اور ۲۰ سال کی صائقہ اور بیچ کی کہکشاں اور ''دُب اکبر'' کے ستارے سب بچوں میں گنے جاتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہی ''بچے'' اگر کسی غریب کی کٹیا میں پیدا ہوئے ہوتے تو انہیں سب ''مرد اور عورتیں'' کہتے اور سچی بات بھی یہی ہے کہ پتہ نہیں غریب ماں باپ کی اولادیں کیوں اتنی تیزی سے بالغ ہو جاتی ہے اور پھر اپنے ناموں کی نسبت سے وہ بچپن ہی میں مختلف کاموں سے وابستہ ہو جاتے ہیں مثلاً ''گلو کے بڑے بیٹے'' ''سلطان'' کو ایک پیر صاحب اس وقت کام کرنے کے لئے لے گئے جب ''سلطان'' صرف ۷ سال کا تھا اور آج سلطان ۲۰ سال کا ایک وجیہہ اور خوبرو نوجوان ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ پیر صاحب کے ''گھوڑے'' کی خدمت میں شب و روز مگن ہے اور ادھر خواجہ صاحب کی سب سے بڑی اولاد ''صایقہ'' دومن کالج میں سکینڈ ائیر کی طالبہ ہے اور دن رات مطالعے اور سخت محنت سے وہ مچھر دانی کی ''چھڑ'' جیسی لگتی ہے اور جب وہ لان میں ''چہل قدمی'' کرنے نکلتی ہے تو لگتا ہے کہ ہوا کے جھونکے سے گرنے والی ہے۔ دوسری منی، صبا ہے......جس کی آنکھیں نیلی ہیں۔ اس کی عمر شال صاحب کے بوڑھے کتے کے برابر ہے......وہ چلتی ہے تو ایسا لگتا ہے کہ بطخ تالاب کے گرد چکر لگا رہی ہے اور پرواز کرنے کے لئے پر تول رہی ہے۔

''گلو'' کا اصلی نام غلام قادر ہے۔ کچھ لوگ اسے قادر شیخ بھی کہتے ہیں۔ قادر عرف گلو خواجہ صاحب کا سب سے نزدیک ہمسایہ ہے۔ اس کا گھر خواجہ صاحب کے بنگلے کے عقب میں نزول کی زمین پر بنا ہے اور گلو نے متعلقہ حکام کو اپنی دس سال کی جمع پونجی دے کر ساڑھے تین مرلے اپنے نام کروالئے۔ محلے والوں میں سے کسی نے گلو کے مکان پر اعتراض نہ کیا بلکہ اسے ہر ممکن مدد دی۔ دراصل یہ گلو کی نیک خصلت شرافت' دیانت داری' محنت اور اعلیٰ صفات کا نتیجہ تھا۔ اسے محلے کا ہر شخص پسند کرتا تھا۔ غلام قادر شیخ عرف گلو گاؤں کا رہنے والا تھا۔ وہ چالیس سال پہلے شہر میں آیا کرتا تھا اور لوگوں کو لکڑیاں پھاڑ کر دیتا تھا۔ اس لئے اسے ابتداء میں قادر تبدار کہتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ خواجہ صاحب کے گھر میں ملازم ہو گیا۔ اس کی محنت اور دیانت داری سے متاثر ہو کر خواجہ صاحب نے اسے پھر کہیں نہ جانے دیا۔ وہ خواجہ صاحب کے گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے وہاں رہنے لگا۔ ابتداء میں خواجہ صاحب نے اسے اپنے مکان کے ایک کمرے میں ٹھہرایا۔ اس کی بیوی اور بچے بھی شہر آ گئے تھے۔ وہ بھی خواجہ صاحب کے گھر ہی میں کام کرتے تھے لیکن اس کا بڑا لڑکا سلطان عام طور پر گاؤں ہی میں رہتا تھا اور ماموں کے کاموں میں اُن کا ہاتھ بٹاتا تھا اور پھر پیر صاحب نے اسے گلو سے مانگ لیا۔

خواجہ صاحب اور گلو افزائشِ اولاد میں برابر برابر چل رہے تھے۔ ایک دن خواجہ صاحب نے اسے ''ڈرتے ڈرتے'' کہا ''گلو'' تم ''فیملی پلاننگ'' کروالو۔ دیکھو ناراض نہ ہونا میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ تمہاری آمدنی قلیل ہے اور تمہاری بیوی بیمار رہتی ہے۔ میری بات اور ہے۔ میں موجودہ اولادوں سے ڈبل بچوں کی پرورش بھی احسن طریقے سے کرسکتا ہوں۔ گلو نے سر جھکا کر کہا ''امام صاحب کہتے تھے کہ جو شخص محض رزق کی وجہ سے اپنی اولاد......''

گلو کا دوسرا بڑا لڑکا ''بادشاہ'' خواجہ صاحب کے حقہ پر مامور تھا وہ حقے کیلئے انگارے تیار کرتا' بازار سے تمباکو لاتا حقے میں پانی بھرتا، پھر دو چار کش خود کھینچ کر حقہ جمالیتا اور پھر نیچے خواجہ صاحب کی طرف موڑ کر کہتا ''پی لیجئے جناب'' خواجہ صاحب نیچہ بادشاہ سے

لے کر ہونٹ سکوڑتے اور بڑی نزاکت سے ہلکے ہلکے کش لگاتے اور دھویں کے مرغولوں کے بیچ سے وہ ''بادشاہ'' کو دیکھتے۔ ''ایک معصوم لڑکا'' ''بادشاہ'' کیا نام رکھا ہے۔ باپ نے اچھا نام! گلو کی نظروں میں تو وہ واقعی بادشاہ ہے لیکن حقیقت میں وہ ''بادشاہ'' نہیں۔

خواجہ صاحب بڑبڑاتے۔ خود اپنے آپ سے باتیں کرتے اور بادشاہ معصوم نگاہوں سے اپنے مالک کو...... دیکھتا...... ایک دن گلو نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ جوڑ کر خواجہ صاحب سے عرض کی ''گستاخیِ معاف'' ''چھوٹی بی بی صبا' بادشاہ کو قاعدہ پڑھالیتی تو ہمارا سارا خاندان قیامت تک آپ کا احسان مند رہتا''۔

''ایں......؟؟ ارے واہ...... یہ خیال تمہارے اس موٹے سر میں پہلے کیوں نہیں آیا؟ بھئی یہ تو بہت اچھی تجویز ہے آخر بادشاہ بھی تو ہمارا ہی بچہ ہے!''

''جی یہ آپ کا بڑا پن ہے۔ دراصل ہماری سات پیڑیوں نے کبھی لکھنے پڑھنے کی طرف توجہ نہیں دی ہے لیکن اب تو زمانہ ہی ایسا آگیا ہے کہ......''

''ارے ٹھیک ہے قادر! تم ذرا حقے کیلئے دو تین انگارے تیار کرلو۔ یہ لو کانگڑی......''۔

اگلے دن جب خواجہ صاحب گھر آئے تو ان کے ہاتھ میں اردو کا قاعدہ اور ایک انگریزی پرائمر تھے۔ انہوں نے بادشاہ کو بلا کر کتابیں اسے دیں اور پھر صبا کو ہدایت کی کہ وہ آج ہی سے بادشاہ کی پڑھائی کی بسم اللہ کرے۔

بادشاہ نے چلم میں تمبا کو بھرا پھر دہکتے ہوئے کوئلے اس کے اوپر رکھے اور دو کش کھینچ کر حقہ خواجہ صاحب کے سامنے رکھ دیا اور پھر ملحقہ کمرے میں جہاں بچے لکھتے پڑھتے ہیں، میں جا کر صبا کے آگے دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔

''صبا نے بادشاہ کی طرف دیکھ کر پہلے ناک مروڑی پھر قاعدہ کھول کر اس کی طرف کردیا ''پڑھو''...... اس نے انگلی ''الف'' کے اوپر رکھ دی 'الف'' ''انار'' بادشاہ بولا۔ آگے پڑھ ''ب'' ''بلی'' اس نے صبا کی طرف دیکھا دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ صبا نے پلکیں

جھکائیں...... ''کیا کہا......؟'' ''بلی!'' ''نہیں...... بلی نہیں بے ''بطخ''۔ اسے نہ جانے کیوں کھانسی آگئی پھر دہرایا ب ب.......... ''بطخ'' یعنی کہ......!''

''پہلے بولو......تم نے مجھے بلی کیوں کہا؟'' صبا نے اکڑ کر پوچھا......'' ''میں نے......؟ بس یونہی نکل گیا زبان سے......!''

''میں خوب سمجھتی ہوں......تم نے پہلے بھی علی سے کہا تھا کہ ''میری آنکھیں بلی جیسی ہیں نیلی......تم آخر مجھے کیا سمجھتے ہو؟''

''بی بی ......'' اس کے علاوہ کچھ نہیں ...... ''اچھا آگے پڑھو!'' ''پ'' پنکھا...... ''ت'' تتلی ''ٹ'' ٹماٹر......!'' ''بس بس یہ ٹھیک ہے......تم تو یہ خود پڑھ لیتے ہو......میں کیا پڑھاؤں'' وہ کیا ہے بی بی جی کہ جب ہاشم' عامر' علی' مینا اور نیلو قاعدہ پڑھتے تھے تو مجھے بھی یاد ہو جاتا تھا......'' ''اچھا صبا نے چہک کر کہا اب ذرا انگریزی کتاب نکالو......پھر اس نے ''A'' اے کے اوپر انگلی رکھ کر پوچھا......''یہ کیا ہے؟'' ''اے فار ایپل'' بی فار بلی' بلی نہیں بطخ...... جی یہ بطخ نہیں 'بکٹ' بولو بی فار بکٹ'' ...... ''جج جج جی......!'' '' اور بولو تم نے پھر ''بلی'' کیوں کہا؟ ''غلطی ہوگئی......اب پھر کبھی نہیں بولوں گا......!'' '' اچھا یہ پڑھو...... ''سی فار کیٹ'' '' کیا کہا...... ''کیٹ؟''

''نہیں بی بی جی......کیٹ نہیں......پھر غلطی ہوگئی......!'' سی فار کیوٹ......'' صبا یو آر سو کیوٹ کننگ......''۔

............☆☆☆............

ترنّم ریاض

نام :ترنم

قلمی نام :ترنم ریاض

تاریخِ پیدائش :۹/اگست ۱۹۶۳ء

تعلیم :ایم۔اے،ایم۔ایڈ

افسانوی مجموعے :(۱)میرا رختِ سفر،(۲)یمبرزل،
(۳)ابابلیں لوٹ آئینگی،(۴)یہ تنگ زمین،(۵)مورتی

ناول :برف آشنا پرندے،فریبِ خطۂ گل

دیگر تصانیف :بیسویں صدی میں خواتین کا اردو ادب،چشمِ نقشِ قدم
پرانی کتابوں کی خوشبو(شعری مجموعہ)

اعزازات :یوپی اُردو اکادمی ایوارڈ،دہلی اُردو اکادمی ایوارڈ،
کلچرل اکیڈیمی ایوارڈ،ادیب انٹرنیشنل ایوارڈ

پتہ :۱۱،جنگ پورہ ایکس ٹینشن،نئی دہلی۔

فون نمبر 09810541179

☆......ترنّم ریاض

ساحلوں کے اُس طرف

شیری نے اخبار سامنے سے سرکا دیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ کھڑکی کی چوکھٹ کے قریب اس کے والدین کی اچھے دنوں میں اُتاری گئی۔ ایک تصویر میں اس کے والد اپنے سے کوئی پندرہ برس بڑی بیوی کے کمر میں ہاتھ ڈالے مسکرا رہے ہیں۔ گھنگھریالے کھچڑی بالوں اور بھرے بھرے چہرے والے اس کے چالیس سالہ والد بھورے رنگے بالوں والی اس کی پچپن سالہ چاق وچوبند والدہ سے عمر میں کسی طرح کم نہیں لگ رہے تھے۔

''تمہیں پانے کے لئے شادی کی تھی میں نے......ورنہ......ورنہ......''

پاپا سے ڈیوورس لینے کے بعد ہمیشہ ماما نے اس کے سوالوں کا یہی جواب دیا تھا اور گردن کچھ ایسے خم کی تھی جیسے سارا قصور شیری کا ہی ہو۔

''یو کڈ ہیو ایڈاپٹڈ اے چائلڈ ماما۔نو۔۔؟'' وہ بھی ماما کے ہی انداز میں گردن کو ہلکا سا جھٹکتی۔

''نو......'' ماما سختی سی کہتیں۔

''یا......یو کڈ ہیو اے......اے ٹیسٹ ٹیوب بے بی۔''

ٹین ایج سے تازہ تازہ باہر آئی شیری دھیرے سے کہتی۔

''یو مائنڈ یور اون بزنیس اوکے......؟''

ماما سر اٹھا کر اسے سکنڈ بھر کو حیرت سے دیکھتیں پھر ہونٹ ایسے بھینچ لیتیں جس

سے شیری سمجھ جاتی کہ اب ماما کچھ دیر بات نہیں کریں گی۔

مگر یہ سب کسی تناؤ بھرے ماحول میں نہیں ہوتا تھا۔نہ ہی اس سے کوئی تناؤ پیدا ہوا کرتا۔بس ایسی ہی گویا معلوماتی قسم کی بحث ہورہی ہو۔

......پوئر پاپا......

شیری کی نظریں چوکھٹ کے پاس سے اٹھ کر باہر چلی جاتیں۔

......اے وِکٹم اوف فیمینزم......اور اگر ان دنوں یہ دریافت......یا ایجاد......وٹ ایور......ہوئی ہوتی تو......دِس......دِس مائی ہاڈ کور فیمینِسٹ مام۔۔

شیری نے سر جھکا کر دوبارہ اخبار کے اس صفحے پر نظریں مرکوز کرلیں جو کچھ دیر پہلے خاصی دیر تک اس کی نظروں کے سامنے رہا تھا۔

کیا معلوم ایسا ہوا ہو کبھی......آخر کروڑوں برس بوڑھی یہ دنیا کون جانے کس کس خطے میں کتنی کتنی بار اجڑی اور بسی ہے۔ایسا ہو تو سکتا تھا نا......یا......میں کچھ صدی بعد دنیا میں آئی ہوتی......یا آنے والے وقتوں میں کبھی ایسا ہونا ہوتا۔۔میں بہت بعد میں جنم لیتی اور......پھر......کبھی اپنے پاپا کی بیٹی میں۔۔اُس وقت صرف ماما کی رہ گئی ہوتی......اور پھر دوبارہ ایک نئی طرح کی یعنی اصل میں پرانی طرح کی دنیا بساتی......اور مجھے اس کے صلے میں......اتنی بڑی کامیابی کے بدلے۔۔میری ان باہوں کو ٹیٹو کیا جاتا اور میرا اچیومینٹ ان پر درج ہوتا اور......اور......پھر......اور میرے فوسلز کسی گلیشئر میں جیوں کے تیوں حالت میں صدیوں بعد پائے جاتے۔۔یعنی ماما کی بیٹی اور نانی کی نواسی......اور پر نانی کی......(اب جو بھی تھا) کسی مہم کے دوران اگر کسی گلیشئر میں دب جاتی......پھر پتہ چلتا......کہ میں نے اتنا بڑا کارنامہ کیا تھا۔

کوئی غلط تو نہ ہوتا یہ......ایسا ہونا ممکن بھی تو ہے......

شیری اٹھ کر کھڑکی کے قریب آگئی۔اور تصویر میں اپنے والد کے چہرے کو ہاتھ سے چھوا ایسے کہ والد کے چہرے سے انگلی تک جھوند سکے۔

مگر کیا معلوم مجھے ایسا کرنے دیا جاتا...... یا کرنے دیا جائے ......یا......یا......
یا پھر ایسا کرنے کو ایک گناہ یا جرم یا بغاوت گردان کر...... مجھے مجھے......نہیں...... پاپا پچھلے مہینے ہاسٹل آئے تھے تو سمجھایا تھا کہ منفی خیالات دل میں نہیں لانے چاہئیں۔

......ہے نا پاپا...... اِٹ ازنٹ رونگ......نو......؟ اگر مجھے یہ موقعہ ملتا تو آپ تو جانتے ہیں نا اپنی ایڈوینچرس بیٹی کو......

شیری کہیں دور دیکھنے لگی۔

مگر پھر سچ مچ وہی ہوا جو شیری نے تصور کیا تھا۔ کہ برسہا برس بیت گئے اور کسی کو وقت کی اس تیزی کا اندازہ ہی نہ ہوا۔

بنی نوع انسان وقت کے تعین کو عشروں، صدیوں اور ہزاروں سے تعبیر کر کے لاکھوں کروڑوں برس کا حساب لگا کر خوش ہو جاتا ہے۔ اور وہاں کائنات میں ایسی باتیں پلک جھپکنے سے زیادہ کی اہمیت نہیں رکھتیں۔

اور پلک جھپکنے میں سینکڑوں برس بیت جاتے ہیں۔

اور پلک جھپکنے میں سینکڑوں برس بیت گئے تھے۔

شیری کا تصور سچ کے اس درجہ قریب ہو جائے گا، اس نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔

شیری کے کانوں میں کسی پرندے کی چہچہاہٹ پڑی تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ایک ریت کا ذرہ اس کی آنکھ میں گھس آیا۔

وہ دونوں ہاتھوں سے آنکھوں کو مسلنے لگی اور کافی دیر اس عمل میں مصروف رہنے کے بعد اس نے آنکھیں پوری طرح وا کیں۔ نیلاہٹ مائل سرمئی سے آسمان پر بطخ کے رنگ اور ساخت کا ایک پرندہ اُڑ رہا تھا مگر اس کی چونچ بطخ سے کچھ کم چپٹی تھی اور سرے تک پہنچتے نوکیلی اور خمدار ہو جاتی تھی۔ آسمان بھی الگ سا لگ رہا تھا، جیسے ہر چیز پر ہلکے ہلکے بادلوں کا سایہ ہو مگر پھر بھی ہر شے حسین اور روشن ہو۔ اور اس پرندے کی آواز بھی بطخ ایسی نہیں تھی کہ

جیسے آرے سے کوئی لکڑی چیر رہا ہو، بلکہ بڑی سُریلی تھی۔ جیسے بچوں کے لئے بنائی گئی پلاسٹک کی سیٹیاں ہوتی ہیں۔ شیری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی گئی۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ اس نے اتنا بڑا پرندہ پہلے کبھی اتنی لمبی اڑان بھرتے نہیں دیکھا تھا۔ پرندہ اڑتے اڑتے اُس کی داہنی جانب اونچے اونچے بیشمار درختوں کی طرف چلا گیا تو وہ چونک کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ سامنے دور دور تک ریت ہی ریت تھی۔ اور بائیں جانب نیلا نیلا وسیع سمندر سکون سے کہیں جا رہا تھا۔ اس نے سر جھکا کر خود کو دیکھا۔ اس کا لباس تار تار تھا اور بدن ریت اور کیچڑ سے لت پت تھا۔ یہ سب اس نے ایک سیکنڈ کے کسی حصے میں دیکھا۔ اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اسے یاد آیا کہ وہ سمندر کے اوپر اُڑ رہی تھی جب اس کے چھوٹے سے جہاز میں تکنیکی خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ اسے جہاز کو کریش لینڈ کرنا پڑ رہا تھا۔ کنارا بہت دور تھا مگر وہ اچھی پیراک تھی۔ اس نے بڑی خود اعتمادی سے ایک ہی سیکنڈ میں یہ فیصلہ لیا تھا کہ وہ جہاز کا رخ کنارے کی طرف موڑ کر پانی میں کود جائے گی اور اس نے ایک سیکنڈ سے کم وقت میں ایسا ہی کیا تھا۔ مگر نہ یہ وہ ساحل تھا اور نہ یہ جگہ اس کی پہچان کی۔ ملبے کا بھی کوئی نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔

اس نے جلدی سے اپنی کلائی کی طرف دیکھا۔ کلائی پر ایک گہرا زخم تھا اور سنہری کلائی کی نازک جلد کے اندر لگا رابطے والا آلہ چوٹ لگنے سے خراب ہو کر بند پڑا تھا۔ لباس اور جسم میں کوئی ٹرانسمیٹر سلامت نہیں تھا۔ مگر سر کے اندر کچھ شور سا سنائی دے رہا تھا۔ شاید دماغ کے اطراف نسب آلات کام کر رہے ہوں اور اس کی ماما کو اس کے کریش اور ڈائریکشن کا پتہ چل جائے اور اسے وہ ڈھونڈ نکالیں۔

یہ سب سوچنے میں شیری کو مزید ایک سیکنڈ لگا تھا اور تیسرے سیکنڈ اس نے اپنے سامنے ایک ایسی شے دیکھی جسے دیکھ کر اس کی چیخ تک اس کے حلق میں اٹک گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے ہونٹ داب رکھے تھے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے سامنے دیکھ رہی تھی۔ اپنی بیس سالہ زندگی میں ایک سے ممالک کا دورہ کرنے کے باوجود شیری کی

نظروں سے ایسی شے کبھی نہیں گزری تھی۔اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور مارے خوف کے آنسو بہہ نکلے تھے۔وہ منہ پر ہاتھ دھرے دھیرے سسکنے لگی۔اسے گھر کی بے تحاشا یاد آنے لگی۔

......ماما......میں کہاں ہوں......آپ کہاں ہیں ماما......یہ کیا چیز ہے......ماما......

اس نے آنکھیں بھینچ لیں۔اور دماغ میں خیال اٹھتے ہی شور ختم ہوا اور سب صاف سنائی دینے لگا۔

''ہم تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں بیٹا۔۔جلدی تمہارے پاس ہونگے۔۔

دماغ میں ماما کی آواز گونجی۔

.....مگر میں کہاں ہوں۔۔ساری ڈائریکشن لُوز کر چکی ہوں......آپ لوگ نظر نہیں آرہے......برین کے اندر لگا کوئی ویڈیو کام نہیں کر رہا......اور یہ......یہ میرے سامنے کیا ہے......

شیری نے پھر آنکھیں بھینچ کر کھولیں تو دماغ نے واپس سگنل دیا۔اس نے سامنے کھڑی مخلوق کو ایک بار پھر بغور دیکھا۔

.....تھوڑی دیر پہلے تک تمہارے آئی لڈس کے اوپر لگے مائکرو کیمراز ،ڈیمیج ہونے کے باوجود سامنے کا منظر کچھ دھندلا سا دکھائی دے تو رہے تھے۔مگر تم نے دونوں آنکھوں کو بچیوں کی طرح مسل ڈالا اور پہلے سے ہی ٹینڈر ہو چکے اور پانی سے بھرے کیمراز میں سے ایک بھی نہ بچا۔تم کہیں نارتھ کی طرف گری تھیں۔۔پلین اور تم دونوں سمندر کے اندر گرے تھے۔بٹ تھینک فلی یو آر سیف۔ہم آچکے ہوتے مگر تمہاری ڈائریکشن کا کچھ پتہ نہیں چل رہا۔تمہارے سامنے ایک ساحل تھا۔ہم تمہیں ڈھونڈتے جہاں تک آئے ہیں یہ وہی ڈائریکشن ہے مگر ادھر کوئی ساحل نہیں ہے۔بٹ یو ڈونا ٹ وری۔ہم ڈھونڈ لیں گے۔مجھے حیرت ہے کہ دنیا کا چپہ چپہ ہمارے سب کاغذی اور برقی نقشوں میں ہے۔مگر یہ کون سی جگہ ہے۔خیر تم فکر نہ کرو اور زیادہ مت سوچو۔تمہارے مائنڈ کے رے ڈاراوور لوڈ ہونے سے ہم کونٹیکٹ لُوز کر سکتے ہے کیونکہ جہاں تم ہو وہاں کوئی آرٹیفیشل میگنٹک فیلڈ نہیں

مل رہا۔کوئی ریڈیو ویوز ڈیٹیکٹ نہیں ہورہیں اوران کا چارج ہونا ناممکن ہوسکتا ہے۔ڈونوٹ اوور برڈن یوئرسیلف ۔ہم ڈھونڈ رہے ہیں......ہیوسم فِش ٹو ایٹ......یوہیوٹو سروایئو......اینڈ ریمیمبر یو آر اے بریو پرسن......مچھلی پکڑتی رہواور زندہ رہو......ہم تمہیں جلد ہی......

ماما کی آواز کچھ رک رک کر آنے لگی۔

......ماما......

شیری کی آواز میں آنسو گھل گئے۔

دماغ میں لگے آلے نے اداسی کی لہروں سے چھوتے ہی اپنی ریزروا ینرجی استعمال کرڈالی اور ماما کی آواز پھر ابھری۔

......نو بے بی......نو......یو ہیو۔۔

ماما کی اداس بھاری آواز ڈوبی ابھری اور بات ادھوری رہ گئی اور شیری کے دماغ میں اٹھنے والی آوازیں اچانک بند ہوگئیں۔

ایسا کیوں ہوا۔۔میں نے تو سوچا کچھ نہیں تھا جو چارج ختم ہوگیا۔۔

وہ سامنے ایستادہ شے پر نظریں گاڑے سوچتی رہی۔

اوہ......مگر میں تو مسلسل سوچ ہی رہی ہوں......کیا کروں......اب میں کیا کروں......

ماما سے رابطہ ٹوٹتے ہی وہ اور خوف زدہ ہوگئی اور اس کا جی چاہا کہ چیخ چیخ کر روئے مگر خوف کے حملے نے اسے چیخنے بھی نہ دیا کہ یہ انجان مخلوق جانے کیا کرے گی۔

مگر انجان مخلوق نے کچھ نہ کیا۔بس کھڑی اسے دیکھتی رہی۔یہ مخلوق حیرت انگیز طور پر شیری سے مشابہ تھی۔مگر حیرت انگیز طریقے سے اس سے جدا بھی تھی۔

یہ کیا ہے۔۔

شاید کہیں دیکھی ہے اس نے پہلے ایسی کوئی شے......مگر کہاں......ہاں......شاید کسی عجائب گھر میں......تین سو سال سے قائم ایک عجائب گھر میں......جہاں اس زمانے کی اوراس سے اور پہلے کی ناپید ہوچکی مخلوقات موجود ہیں۔۔ہاں وہیں......وہیں دیکھا ہے اس

نے اس مخلوق کو......اس کی حنوط شدہ شکل کو......حنوط شدہ مخلوق کے برابر اسی کا ایک بڑا مرمری مجسمہ بھی رکھا گیا ہے۔۔سفید پتھر کے دو زینوں والے سٹینڈ پر ایستادہ......مجسمے کا قد اس سے ملتی جلتی سامنے موجود مخلوق کی طرح لمبا ہے اور اس کی دو آنکھیں اور دو دو ہاتھ پیر ہیں جن کے پٹھے خاصے نمایاں ہیں۔۔اس کے سر پر گھنے اور کچھ لمبے بال ہیں اور چہرے پر ناک کے نیچے چھوٹے چھوٹے گھنے بال ہیں اسکی ٹھوڑی پر بھی گھنے اور کچھ زیادہ لمبے بال ہیں۔جسم پر بھی چھوٹے چھوٹے بال ہیں۔اس نے ایک پیر پہلے زینے پر رکھا ہے اور دوسرا گھٹنا موڑ کر وہ پاؤں دوسرے زینے پر رکھا ہے۔مجسمے کے نیچے کی عبارت شیری کا دِل دہلا دیتی تھی۔

''یہ ذی روح اب نہیں پایا جاتا۔تقریباً ڈیڑھ سو سال سے بالکل ہی ناپید ہو چکی یہ پتھر سی مخلوق آج کی موجودہ قوم انسان کی جانی دشمن تھی جس کے تئیں اُس میں حسد کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔یہ جاندار اس قوم کی ترقی میں طرح طرح سے رکاوٹیں ڈالتا اور اس کو اذیتیں دیا کرتا تھا۔یہ جاندار جنگ و جدل میں یقین رکھتا تھا اور اس پر فخر کرتا تھا۔اپنی خوشی کے لئے کسی بھی حد تک جا سکتا تھا۔''

یہ اس زمانے کی بات ہے جب سائنس کی ایک حیرت انگیز دریافت نے دنیا کو چونکا دیا تھا۔

شیری نے اس کی تفصیل کہیں پڑھی تھی۔گو کہ یہ اس کا موضوع نہ تھا مگر چونکہ نصاب میں اس کی ایک خاص اہمیت تھی اس لئے سکول کے آخری درجے تک کم از کم اس کی تعلیم ضروری تھی۔اس کے علاوہ اس موضوع میں تحقیق و تنقید، اقتصادیات اور سائنس کے مضمون کی طرح اہمیت کی حامل مانی جاتی تھی۔

حیران کن دریافت یہ تھی عورت اب مرد کے تعاون کے بغیر اولاد پیدا کر سکتی تھی۔اپنے ہی جسم کے ایک خلئے کے ذریعے۔مگر اولادِ نرینہ کے لئے پھر مرد کا تعاون ہی ضروری تھا۔اس خبر سے عورت ذات کی تانیثی تنظیموں کی کچھ اہم ارکان نے ایک خفیہ منصوبہ بنایا اور ایک ایسی تنظیم تشکیل دی جس کی ہر رکن کے پاس ایک ایسا تجربہ ہونا لازمی تھا جسے وہ وقتِ

ضرورت عام کر کے اپنے مشن میں کامیابی حاصل کر سکے۔ اس تنظیم میں بڑے اہم نام تھے۔ جو بعد کو صدیوں تک زبانِ زد رہے تھے۔

پہلا نام قارا تاز کا تھا۔ اس نے ساری عمر مردوں سے نفرت کی تھی اور ان کے خلاف لکھی اپنی کتابوں میں انہیں بیوقوف ثابت کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی مگر پچپن سال کی عمر میں اپنے سے بیس سال کم عمر کے مرد سے شادی کر لی۔ پھر اُسے ایک نوعمر لڑکی سے عشق میں مبتلا دیکھ کر گوشہ نشین ہو گئی۔ شرمندہ سی قارہ تاز نے تنظیم میں شامل ہونے کے لئے فوراً ہاں کر لی تھی۔

دوسری رکن کا نام کمہ ساطی تھا۔ وہ کسی زمانے میں ایک فعال تانیثہ بن کر ابھرنے ہی والی تھی کہ اسے محبت ہو گئی اور شادی کر بیٹھی۔ اس کے شوہر کا ایک پاؤں نقلی نکلا جو اس نے شادی سے پہلے کمہ ساطی سے چھپائے رکھا تھا۔ اور کمہ ساطی اسے چھوڑ کر پھر سے فیمنسٹ گروپ میں جا ملی۔ وہ بھی نئے آئڈیا کو اپنے گناہوں کا کفارہ سمجھ کر تنظیم میں شامل ہو گئی۔ تنظیم میں شامل ہونے والی ایک اور اہم رکن ڈاکٹر بدنی تھی جو غیر شادی شدہ تھی اور جانے کس سبب سے خواتین کی کچھ ایسی حامی تھی کہ مردذات کی دشمن جانی جاتی تھی اور یہ ثابت کرنے پر تیار رہتی کہ مرد آپس میں ہی ہر طرح کی محبت کرنے میں خوش ہیں اور آئے دن یہ معاملے سامنے آتے ہیں بلکہ اب یہ معاملے اتنے عام ہیں کہ سامنے ہی رہتے ہیں۔ اور یہ عورت کو اپنا دشمن خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ دیکھنے میں ڈاکٹر بدنی کسی مرد سے کم نہیں نظر آتی تھی۔ اس کے میٹرنٹی اینڈ فرٹیلیٹی ہوسپٹل میں ایک بھی مرد ملازم نہیں تھا۔ اپنی ہم مزاج خواتین کا عملہ اسے آسانی سے مل گیا تھا۔

چوتھی رکن ایڈووکیٹ زازی رِڈ نے اپنے بچپن کے ہم جماعت اور ہم پیشہ سے شادی کی تھی جو اسے بہت چاہتا تھا مگر اس کی ذہانت سے عدم تحفظ کا شکار ہو کر اسے بہانے بہانے سے بہت مارتا بھی تھا۔ زازی رِڈ نے اس سے رشتہ توڑ لیا۔ اور میڈیا کے ذریعے عورتوں پر بالواسطہ یا بلاواسطہ تشدد کے خلاف مہم چلائی تھی۔

اور پانچویں رکن سوشل سائنٹسٹ ریزا بیَر نے میڈیا کے ذریعے کئی ٹھوس تجربے عام کر کے یہ ثابت کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی کہ جنگ اور خونریزی کا واحد ذمہ دار مرد ہے جو لالچ یا انا کی تسکین کے لئے کسی ملک پر بم برسا سکتا ہے۔اور یہ کہ لڑکے ہی بڑے ہو کر تشدد کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔اور بچپن سے ہی پر تشدد کھیلوں کو اپنا کر خوش ہوتے ہیں۔اگر ان میں کوئی اتفاق سے عورت جیسا دل لے کر پیدا ہوتا بھی ہے تو وہ بھی اکثر حالات میں باقی برے مردوں کا اثر لے لیتا ہے اور ان جیسا ہی بن جاتا ہے۔اس لئے اس صنف کی موجودگی کو غیر ضروری سمجھا جانا دُنیا کے منظرنامے کی موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر نہایت ضروری ہو گیا ہے۔کہ اسی سے انسانیت کا مستقبل محفوظ رہ سکتا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ اب اور بھی کئی طریقوں سے دنیا کو نیست و نابود کرنے پر تلے ہیں۔کہیں پورے کے پورے برِاعظم کو ایک ہی بم سے اڑانے کے تجربوں کے کوشش میں ہیں۔اور کہیں بگ بینگ تھیوری کو ایک کھیل کی طرح مصنوعی طریقے سے کھیلنے کا منصوبہ بنا کر، جس میں دنیا کے عالمِ وجود میں آنے کی اصل صورت حال سے آشنا ہونے کے ان کے دیوانے شوق کی تکمیل کا کم اور کُل عالم کے نیست و نابود ہونے کا کئی درجے زیادہ خطرہ ہے کہ اب یہ سائنس کے نام پر انسانوں اور حیوانوں کو ملانے لگے ہیں۔نئے ذی روحوں کے ڈھانچے تشکیل کرنے لگے ہیں۔

یہ لوگ دوسروں کو اپنا شکار سمجھتے ہیں۔انہیں اپنی تفریح کا سامان سمجھتے ہیں۔سائنس کے نام پر ان سے جیسے چاہے کھیلتے ہیں اور جیسے چاہیں گے کھیلا کریں گے۔اب یہ کسی کے بھی جذبات اُن کی فطرت سے زیادہ کر دیں گے۔اور کہیں ان کی اصلیت سے ان کے جسم کم بنا دیں گے۔اب یہ تماشہ گر دنیا کو تماشاہ گاہ بنانے پر تُل گئے ہیں۔جس میں بہت سے سرمایہ دار نما سیاستدان اور بہت سے سائنسدان رہ جائیں گے اور باقی ذی روح ان کے تجربے کا خام مال، کہ ان کے جینے کی طرز اور مرنے کے اسباب کے وہی دمختار ہوں گے۔

یہ ساری تقریر براہِ راست برقی رابطوں کے ذریعے بیک وقت تمام ممالک میں عام کی گئی۔

ایسی باتیں عقل کو لگتی تھیں۔اور عام اذہان کے جذبہء بغاوت کی تسکین کا سامان کرتی تھیں۔اور اس طرح شدت پسند تانیثاؤں کا کام آسان بھی۔

ان سب محترماؤں نے فرداً فرداً منظم طریقے سے مسلسل دو دہائیوں تک عالم بھر میں مردوں کے خلاف مہم چلالی اور پھر سب نے ایک جگہ جمع ہوکر ایک لائیو پریس کانفرنس میں دنیا بھر کی خواتین سے اپیل کی کہ وہ مردوں کا مکمل بائی کاٹ کر دیں کہ اس صنف کی اب دنیا میں قطعی کوئی ضرورت نہیں رہی۔اگر یہ ناپید نہ ہوئے تو پوری دنیا کو ختم کرنے سے پہلے یہ عورت ذات کو ضرور ختم کر دیں گے۔کہ عورت کے قدرتی تخلیق کار ہونے کے سبب اور اولاد پر مالکانہ حقوق جتاتے وقت یہ ویسے ہی عدم تحفظ کا شکار رہتے ہیں۔ہوسکتا ہے کل کو کوئی ایسی ایجاد کر دیں کہ نسل بڑھانے کے لئے انہیں ہی عورت کی ضرورت نہ پڑے۔اس لئے بہتر یہ ہے کہ ان کی ہی نسل روک دی جائے۔

ایسی باتوں کا اثر عورتوں کی نفسیات پر ہوتا دکھائی دے رہا تھا جس کا ثبوت میڈیا کے ذریعے سوال جواب یا لائیو مباحثے تھے۔اور اگلے دن اخباروں میں اس پریس کانفرنس کے خوب چرچے تھے کہ ہر شعبے میں خواتین کی ایک خاصی تعداد موجود تھی جن میں اُن کی ہم خیال خواتین بھی اچھی خاصی تھیں جنہوں نے اس معاملے کی ہر طرح تشہیر کی۔

وقت تیزی سے بدل رہا تھا اور خیالات بھی مگر اس کے باوجود تنظیم کی ان پانچ اراکین کی حیات میں مردم شماری میں مردوں اور عورتوں کے تناسب میں کچھ نمایاں تبدیلی محسوس نہ ہوئی۔لیکن دنیا کے ہر کونے میں ان کی ہزاروں پیروکار ضرور پیدا ہوگئی تھیں جو اُس صدی کے اختتام تک لاکھوں میں بدلتی گئیں اور پھر مردوں کی گنتی میں حیرت انگیز طور پر کمی واقع ہونے لگی کہ جس رفتار سے عورتوں کی تعداد بڑھی تھی، اسی رفتار سے مردوں کی تعداد گھٹ گئی تھی۔گو کہ کہیں کہیں کچھ فکر مند سائنسدانوں نے کچھ ''وائی'' کروموزومز، محفوظ کر لئے تھے اور وہ اپنی زندگی جی کر اور مستقبل کے لئے بھی کچھ حفاظتی اقدامات کر کے ہی دنیا سے گئے تھے۔مگر مخالفین کا غلبہ ایسا تھا کہ تعداد گھٹتی ہی گئی اور اُس سے اگلی صدی کے

اختتام تک دنیا ایسی بدلی کہ اطفال میں سب بچیاں ہی تھیں اور مردذات کا کہیں نام ونشان تک پایا نہیں جاتا تھا۔ آرکائیوز میں سے ایسی فلمیں تک ضائع کردی گئیں جن میں محبتوں کا ذکر تھا۔ اور وہ بھی جن میں جنگ وجدل کے قصے تھے۔ کہ گھروں سے ویسے ہی تصاویر اور نشانیاں مٹ گئی تھیں کہ تیسری چوتھی نسل کے بعد آنکھ سے اوجھل لوگوں کے تئیں جذباتی لگاؤ کے فقدان کے سبب کوئی محفوظ نہیں رکھ پاتا ہے یادوں کو۔ اور اس کے ساتھ ہی مثبت سائنسی رجحان اور نئی تیکنالوجی سے ممالک خود کفیل تھے اور جنگیں نہیں ہوتی تھیں۔ زمانہ اپنی رفتار سے ہمیشہ کی طرح انجان منزلوں کی جانب گامزن تھا۔

اب عجائب خانوں میں مردوں کے مجسمے اور تصاویر نظر آتیں۔ بڑی بوڑھیاں مردوں کی کہانی سنایا کرتیں جو انہوں نے اپنی بوڑھیوں سے سنی تھیں کہ ان میں سے کسی نے مردذات کو نہیں دیکھا تھا۔

شیری کی نانی نے بھی اپنی نانی سے سنی تھی کہ اُس نانی نے اس کی اپنی نانی کے حوالے سے سنی تھی۔ اور سینہ بہ سینہ چل رہی داستانیں بڑی خوفناک اور دلچسپ ہوا کرتی۔ اونگھ رہی بچیاں ڈر کر دبکنے لگتیں مگر تجسس کے مارے پھر سر نکال کر پوچھتیں کہ نانی پھر کیا ہوتا تھا۔

شیری بھی پوچھا کرتی تھی۔ اور نانی پھر اپنی نانی کی نانی کی اطلاعات کے مطابق کہتیں کہ اس کی نانی نے کیا سنا تھا۔

''وہ بالکل ہمارے جیسے نظر آتے تھے۔ مگر ہم سے کچھ بڑے ہوتے تھے اور ہم جیسی سب کی سوچ کو کچلنے پر تیار اور جسم کو نگلنے پر آمادہ۔۔ ہم لوگوں کو پریشان کرنا اپنا حق سمجھتے تھے۔۔''

نئی ایجادات اور مصنوعات سے صحت مند نظر آنے والی نانی کہیں سے روائتی نانی ایسی نہ تھیں۔ ماسوائے اس کے کہ ممتا کی فطری روائت سائنس کی ترقی کے باوجود بدلی نہیں جاسکی تھی۔ نانی ٹیلی وژن کے سکرین جیسی کسی شے پر نظریں جماتیں ہوئی جمائی لیتیں۔

''پھر۔۔؟'' شیری ان کے چہرے پر اپنی ملائم انگلیاں رکھ کر ان کا منہ اپنی طرف

موڑتی۔

''اور کیا کرتے تھے نانی۔۔؟''

''ہم لوگوں کو تکلیف دیتے تھے۔عجیب عجیب طرح سے......ذہنی اور جسمانی ......اور ہاں ان کی ناک کے نیچے بال اگتے تھے۔جنہیں ان میں سے بڑھا کر اکثر بڑے سٹائل سے تراشا کرتے تھے اور یہ بال کھاتے پیتے ان کے منہ میں گھس جاتے تھے۔

''اوہ......چھی......گندے......''

شیری اپنی ناک پر انگلی رکھ کر سر ہلاتی۔

''ان کی آواز بالکل الگ تھی۔۔شیر کی دھاڑ جیسی۔۔اور ہنسی ایسی کہ جیسے سمندر طوفان کے وقت چنگھاڑتا ہے۔بس یہ سمجھو کہ وہ کہیں سے انسان نہیں تھے، بھلے ہی انسان سے نظر آتے ہوں......''

اس دن نانی ماں بات کرتے، گاہے گاہے ٹیلیوژن جیسی چیز پر نظر ڈالتے اونگھ گئیں تھیں۔اور شیری سوچوں میں کھوئی جاگتی رہی تھی۔

اِس وقت انجان ساحل پر کھڑی پھٹی آنکھوں سے سامنے ایستادہ مخلوق کو ہونٹوں پر ہاتھ دھرے دیکھتی شیری نے جُھرجُھری سی لی۔

اب تک وہ خاموش اسے دیکھتا رہا تھا۔پھر اس کے ہونٹوں پر بائیں جانب ایک خم سا نمودار ہوا جسے دیکھتے ہی شیریں ایک قدم پیچھے ہٹی۔

اس شے کے ہونٹوں کے نیچے بھی گھنے گھنے سیاہ بال ہیں اور اس کا قد شیری سے لمبا ہے اور شانے چوڑے ہیں۔اس کی ٹھوڑی پر بھی گھنے گھنے بال ہیں۔اس کی آنکھیں کیسی کالی کالی ہیں۔چمکیلی سی (نانی نے یہ کبھی نہیں بتایا تھا)۔اور اس کے ہونٹ کا خم ۔۔مسکراہٹ پر مائل سا نظر آنے والا خم۔۔کیسا جاذب سا ہے (جب کہ قاعدے سے ایسا ہونا نہیں چاہئے)۔اس کی کسی ساتھی کی مسکراہٹ ایسی نہیں تھی۔اور نہ گھر میں کسی کی۔

تو یہ ہی ہے مرد۔۔مگر کیوں جانے بلا سبب پرکشش نظر آنے والا یہ خم غصے میں آنے اور حملہ

کرنے کا پہلا قدم ہو۔

جانے اب وہ اس پر کس طرح حملہ آور ہونے والا ہوگا۔

اس خیال کے آتے ہی شیری اپنا توازن کھو کر پھر ریت اور کیچڑ میں گر گئی۔ مرد پر اسکی نظریں جمی رہیں۔

اب......اب یہ شیر کی طرح دھاڑے گا اور اسے اذیت دے گا......اسے وہاں سے بھاگ جانا چاہئے......کہیں بھی......بھلے ہی واپس پانی کے اندر......

شیری حملے کا اندازہ لگانے کے لئے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ مرد اسے دیکھتا رہا اور مسکرا دیا۔ پھر اس نے جھک کر اپنا ہاتھ شیری کی طرف بڑھایا کہ وہ اس کے ہاتھ کے سہارے اٹھ سکے۔ شیری نے اس کا ہاتھ نہیں تھاما اور سر اوپر کیئے اسے دیکھتی رہی۔ کئی لمحے جب وہ اس کے اٹھنے کے انتظار میں جھکا رہا اور وہ نہیں اٹھی تو یکلخت اس نے اس کا بازو پکڑ کر اوپر اٹھا لیا۔ شیری کے ہونٹوں سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی تو مرد مسکراتے ہوئے کچھ بولا بھی تھا۔ شیری کی گھبرائی نظروں میں حیرت شامل ہوگئی۔ اس کی آواز شیر کی دہاڑ جیسی نہیں تھی۔ برستی ہوئی بارش جیسی لگی تھی۔ اور جب اس نے اس کا بازو پکڑ کر اٹھایا تھا تو اس کی گرفت بھی کسی پنجے یا شکنجے سی نہیں تھی بلکہ ایسی ہی دوستانہ تھی جیسی نانی اور اس کی ماما دونوں نے اسے تھام رکھا ہو۔ یا جیسے انسٹیٹیوٹ میں ساتھیوں کی تھی۔ مگر اکثر اس کے ساتھ رہنے والی کچھ بھاری جثّہ کی ساتا جیسی کہیں سے نہ تھی۔ ساتا کی دبلی انگلیاں اس کے بازو میں پیوست سی ہو جاتیں تھی۔ مگر مرد کے ہاتھوں کی انگلیوں کی مضبوطی کے سہارے اٹھتے وقت شیری کی ذرا بھی طاقت نہیں لگی تھی۔

مرد حیرتوں میں ڈوبی شیری کا شانہ تھامے کچھ دور تک اسے اپنے ساتھ چلاتا رہا پھر آگے بڑھ گیا۔ شیری دو ایک پل رک کر سنسان، اجنبی اور کچھ عجب سی روشنی میں ڈوبے ریگزاروں کو دیکھا کی۔ یہ روشنی ہلکی تھی نہ تیز۔ مگر خاصی واضح تھی۔ اور آسمان بھی بہت اونچا نہ تھا۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آسمان کے بعد بھی کوئی چیز ہلکے رنگوں کے شامیانے کی طرح

تنی ہے۔شیری نے سر ہلکے سے جھٹکا اور اس کے پیچھے پیچھے زمین کی طرف دیکھتی چلنے لگی کہ وہ خطرناک معلوم نہیں ہوتا تھا اور شیری کے پاس دوسرا کوئی راستہ بھی نہ تھا۔اُن کا رُخ جنگل کی طرف تھا۔ کچھ دیر تک آہستہ چلنے کے بعد مرد کی رفتار تیز ہوگئی ۔وہ دوڑتا تو شیری بھی دوڑنے لگتی تھی۔دور دور تک اور کوئی نہیں تھا۔

یہ جنگل ایک دیوقامت چٹان پر تھا اور بہت سا چلنے کے بعد اچانک ایسے راستے کی اور مڑتا تھا جہاں صرف داہنی اور بائیں جانب سے سورج کی روشنی آتی تھی گویا پہاڑ کی قوی ہیکل چھت تلے ایک اور دنیا آباد تھی جو مکمل روشن تھی مگر جنگلوں کی بہتات اور کئی میلوں تک اٹھی آڑھی چٹان کے سبب اوجھل بھی تھی۔ آڑھی چٹان پر دیوہیکل درختوں کا ایک لامنتہا سلسلہ تھا اور یہ چٹان جیسے دونوں جانب سے چھجے والی ٹوپیاں پہنے ایستادہ تھی اور ساحل ایسے ڈھکا تھا کہ چٹان کے نیچے سے گزرے بغیر ساحل کا نظر آنا ممکن نہ تھا۔مگر سارے منظر میں روشنی بھی تھی اور سورج کی کرنیں بھی ادھر اُدھر رقص کرتی پھرتی تھیں۔

جس راستے سے وہ گزر رہے تھے وہ راستہ کچا تھا۔اطراف اونچے اونچے درختوں پر پرندے اِدھر اُدھر شور مچاتے پھرتے تھے۔ کچھ پرندوں کو وہ پہچانتی تھی۔ کچھ اس نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو اس نے عجائب گھر میں عنقا ہو چکے پرندوں کی حنوط شدہ شکل میں دیکھے تھے۔مگر سب کی بولیاں بڑی سریلی تھیں۔ کچے راستے سے نکلنے والے اور راستے پھولوں اور پھلوں سے بھرے نظر آرہے تھے۔اب وہ کسی وادی میں آگئے تھے ۔دور دور تک پکے اناج والے سنہرے کھیت تھے۔لکڑی اور گھاس کی گول، چکور، آڑی اور سیدھی چھتوں اور بڑے بڑے باغیچوں والے گھر تھے۔سواری کے جانور تھے مگر گاڑی قسم کی کوئی چیز نہیں تھی۔

آگے چلتا ہوا مرد اسے پلٹ کر دیکھ لیتا تھا اور جہاں راستہ تنگ یا پانی سے بھرا ہو تو اس کے لئے جگہ چھوڑ کر رک جاتا اور اس کے گزرنے کے بعد خود گزرتا۔

کچھ دیر بعد وہ ایک بڑے سے باغ میں پہنچ گئے تھے جہاں شیری نے اپنے جیسی

بہت سی لڑکیاں اور اس مرد جیسے بہت سے مردوں کے علاوہ ہر عمر کے مرد عورت دیکھے۔
یہاں عورتوں کے چہرے اس کی دنیا کی نسبت پرسکون معلوم ہوتے تھے۔ مرد نے شیری کی
طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے ایک اور ہم عمر مرد سے دھیرے سے کچھ کہا۔ دھیمے لہجے میں اس
کی آواز گٹار کے نیچے سروں سی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی بات پر اس کا ساتھی قہقہہ لگا کر ہنس
پڑا۔ اس آواز پر شیری نے پھر حیرت سے دیکھا۔ قہقہہ پہاڑی جھرنے کی طرح اسکے ساتھی
کی مضبوط گردن کے حلقوم سے ابھرا تھا۔ کسی جانور کے کھال سے ڈھکے اس کے چست
پیٹ کے اوپر چھاتی کچھ اور پھیل گئی تھی۔ قہقہہ سن کر سوکھی گھاس کو گٹھوں میں لپیٹتی ایک لڑکی
نے پلٹ کر دیکھا اور قہقہہ لگانے والے مرد کے پاس آگئی۔ مرد نے اسے بھی اپنی زبان
میں کچھ کہا تو دونوں ہنس پڑے۔ اس ہنسی پر شیری مزید ایک بار چونکی کہ اس کے کان عورت
اور مرد کی ملی جلی ہنسی سے نا آشنا تھے۔ اس مشترکہ ہنسی میں بانسری اور سرور کے سُر ملے ہوئے
تھے۔ جیسے برسنے پر آمادہ بادلوں کی گرج کے درمیان کوئی بلبل گا رہی ہو۔ شیری کی حیرت پر
اس لڑکی نے مسکرا کر مرد کی آنکھوں میں دیکھا اور اس کے چہرے کے قریب اپنا چہرہ لے
جا کر کچھ بولی۔ مرد بھی مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کچھ کہنے لگا۔ وہ دونوں
باتیں کرتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ شیری نے اس طرح کا کوئی منظر پہلے
کبھی نہیں دیکھا تھا۔ چرند و پرند قہقہہ لگاتے ہیں نہ مسکراتے ہیں۔ جانوروں میں نر اور مادہ
آپس میں باتیں ہی کرتے ہیں نہ آنکھوں میں دیکھتے ہیں۔ انسان کو قدرت نے بولنے
،مسکرانے اور آنکھوں کو دل کی جگہ استعمال کرنے کی راحت عطا کی ہے۔ آج سے قبل شیری
نے قدرت کے بنائے ہوئے جو جوڑے دیکھے تھے ان سے انسانوں کا جوڑا سب سے
الگ، سب سے اشرف تھا۔ سب سے مکمل اور سمجھدار معلوم ہوتا تھا۔ کہ بات کر کے دل کی
بات کہنے کی قدرت رکھتا تھا۔ شیری ہر بات کو بغور دیکھتی۔ سمجھنے کی کوشش کرتی اور اس میں
کامیاب ہوتی۔ گو کہ ہر بات اس کے لئے نئی تھی۔ اور بہت سی نئی باتیں اس کی منتظر تھیں۔

پھر مرد نے شیری کو دیکھ کر عورت سے کچھ کہا تو عورت کا چہرہ یکا یک بجھ سا گیا۔

وہ کچھ لمحے شیری کی طرف بغور دیکھتی رہی پھر اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں شکوہ بھر کر اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اور پلٹ کر واپس گھاس کے ڈھیر کی جانب چل دی۔ مرد نے مسکراتے ہوئے اسے پکارا۔ اس نے مُڑ کر نہیں دیکھا تو وہ بھی اس کے پیچھے گھاس کی ڈھیری کی طرف لپکا۔ وہ سر جھکائے کام میں مصروف بنی رہی۔ وہ اس کے قریب جا بیٹھا۔ پھر کبھی ہنستا اور کبھی مسکراتا اسے کچھ کہتا رہا۔ وہ اس کی طرف سے منہ پھیر لیتی تو وہ اس کے چہرے کے رخ پر سامنے چلا جاتا۔ لڑکی اسے نظر انداز کرتی رہی۔ اس نے جیسے اس سے نہ بولنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ یہ حالت دیکھ کر مرد کچھ پل اسے سنجیدگی سے دیکھتا رہا پھر اس نے لپک کر لڑکی کو گود میں اٹھا لیا اور گول گول گھومنے لگا۔ لڑکی نے مسلسل سنجیدہ صورت بنائے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی مگر پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی اور لڑکے کے گلے میں باہیں ڈالے اس کی گود میں جھولتی رہی اور اس وقت تک ہنستی رہی جب تک وہ اسے گود میں گھماتا اس کے ساتھ ہنستا رہا۔ پھر لڑکا جب لڑکی کا بوجھ اٹھائے اٹھائے تھک گیا تو لڑکی کو گھاس کی ڈھیری پر پٹخ کر زور زور سے ہنستا وہاں سے بھاگا اور لڑکی زور سے ہنس کر ہلکے سے چلائی اور اٹھ کر اس کے پیچھے بھاگی۔ یہاں تک کہ دونوں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ شیری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ناچ رہی تھی اور اسے یاد ہی نہ تھا کہ وہ گھر میں نہیں ہے بلکہ بھٹک کر کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گئی ہے۔ ایسا منظر بھی شیری نے کبھی دیکھا تھا نہ تصور کیا تھا۔ ان دونوں کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی شیری نے محسوس کیا کہ وہ بڑی دیر سے مسکرا رہی ہے اور ساحل سے ساتھ آنے والا لڑکا ہونٹوں کو بائیں جانب خم سا دئے گویا مسکراہٹ پر آمادہ اسے دیکھ رہا ہے۔ شیری کی اس پر نظر پڑتے ہی وہ مسکرا دیا اور اسے دیکھتا رہا ایسے ہی جیسے کچھ دیر پہلے گھاس لپیٹنے والی لڑکی کو اس کا ساتھی دیکھ رہا تھا۔ شیری بھی اسے دیکھتی رہی۔ اس کا دل اس کے چہرے سے نظریں ہٹانے کو نہ چاہتا تھا اور وہ جیسے بے بس سی اس کی گھورتی ہوئی آنکھوں کو دیکھتی جا رہی تھی۔ مگر شیری کو اس بے بسی کا کوئی غم نہ تھا۔

یہ کیسی بے بسی ہے......

اسے اس مجبوری سے ایسی راحت کیوں مل رہی ہے......

یہ دل کے اندر کوئی راگ سا کیا چھڑ گیا ہے......

یہ روح اتنی پُرسکون کیسے ہوگئی ہے......

یہ زندگی اتنی آسان سی کیسے لگ رہی ہے......

اور......اور...... یہ زندگی اس کی زندگی سے کتنی بہتر ہے...... کتنی اصلی اور کیسی فطری ہے۔

اس لڑکے کی آنکھوں نے اس کی آنکھوں تک یہ کیسا سلسلہ سا باندھ دیا جسے توڑنے کی اس میں ہمت ہی نہیں......

اور جب...... جب ساتا اسے دیکھتی تھی تو۔۔

شیری کے چہرے پر سنجیدگی سی چھانے لگی تھی اور ساتا کے دیکھنے کے خیال سے اسے عجیب سی بیزاری کا خیال آیا اور پھر گھن سی آنے ہی لگی تھی کہ اس نے فوراً لڑکے سے نظر ملنے کے احساس کو دوبارہ خود پر حاوی کیا اور مسکرا اٹھی۔

وہ کتنی خوش نصیب ہے کہ اس نے زندگی کی اصل صورت دیکھ لی۔۔

وہ کسی جادوئی طاقت کے زیرِ اثر لڑکے کو دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ کچھ بچے کسی جانب سے دوڑتے ہوئے آئے اور ان کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر عورت۔ اس عورت نے دلچسپی سے شیری کو دیکھا اور بچوں سے کچھ کہا۔ ان کے پیچھے ایک سفید ڈاڑھی والا بزرگ سا آدمی ایک بچے کو گردن پر بٹھائے آرہا تھا۔ اور ان کے پیچھے ایک نوجوان جوڑا۔

بچے ادھر ادھر دوڑتے پھرتے کھیلنے لگے اور ایک بہت چھوٹا سا ننگ دھڑنگ بچہ شیری کی طرف دوڑا اور آدھے راستے میں رک کر اسے دیکھ کر شرماتا سا ٹھہر گیا اور پھر کچھ پل بعد مسکرا دیا تو شیری کو ہنسی آگئی۔ وہ اسے غور سے دیکھتی مسکراتی رہی کہ بچے بھی بچیوں کی طرح معصوم ہوتے ہیں اور ویسے ہی پیار کرنے اور پیار چاہنے والے بھی۔

تو جو اس نے آج تک پڑھا، سنا، جانا، سمجھا، سب جھوٹ تھا۔ سب غیر فطری اور

غلط تھا۔

شیری کے چہرے پر تناؤ ابھر آیا۔۔اس نے سر جھٹک کر دوسری طرف دیکھا۔

اور......اور گھناؤنا بھی......اس کی نظروں میں ساتا کا سراپا گھوم گیا۔اسے عجب سی کراہیت کا احساس ہوا۔

ایسی مثال درندو چرند میں کیا، پرندو حشرات الارض میں بھی نہیں مل سکتی کہ جسمانی ساخت میں بالکل اپنی سی صنف سے مخالف صنف کا سا غیر فطری طور پر اپنایا گیا فعل......محض کسی بیمار تجسس کی تسکین کے لئے......غیر متوازن نفسیات کے جنونی غلبے میں خود کو بے قابو ہو جانے دے کر......اپنے غلط عمل کو صحیح ثابت کرنے کی ناکام کوشش میں دوسروں کو ان عادات کا شریک بنانے کا صدیوں پر محیط مسلسل عمل اور معصومیت کا استحصا ل......اور پھر ایسے ذہنی مرض کو فطری ظاہر کرنے کے لئے احتجاجات بھی اور ہم خیالوں سے ان رجحانات کے تحفظ کی سند بھی......جبکہ فطرت نے انسان کو مکمل بنایا......ہر ذی روح کی طرح......ایک جوڑے کی صورت......ایک منطق کے تئیں......

ادھیڑ عمر عورت نے شیری کو سوچوں میں گم دیکھا تو قریب آگئی اور سر کے اشارے سے ساتھ چلنے کو کہا۔شیری پلٹ پلٹ کر ساحل والے لڑکے کو دیکھنے لگی تو عورت نے اپنی زبان میں لڑکے سے کچھ کہا۔چھوٹا سا وہ گھر بڑا پرسکون تھا۔جہاں شیری نے تازہ دم ہو کر نوجوان کے ساتھ پھلوں کا ناشتہ کیا تھا۔اور کوئی شربت پیا تھا۔شیری ایسی پرسکون تھی جیسے اس کا جہاز ڈوبا ہی نہ۔ایسی مطمئن تھی جیسے وہ گھر سے دور ہو کر گم ہی نہ ہوئی ہو۔ایسے خوش تھی جیسے خوشی اس نے پہلی بار محسوس کی ہو اور ایسے خاموش تھی جیسے کچھ حاصل کرنے کو باقی نہ رہا ہو اور زندگی اس نوجوان کے ہمراہ رہ جانے کا نام ہو۔

اور وہ وہیں رہ گئی۔اپنی تہذیب یافتہ دنیا سے کہیں زیادہ مہذب اور سچی دنیا میں۔جہاں تک مشینوں اور مشینی خیالات کی رسائی نے انسانوں اور فضا کو آلودہ نہیں کیا تھا۔ دنیا کا یہ اوجھل حصہ برباد ہونے سے بچ گیا تھا۔شیری نے ان کی زبان سیکھ لی اور ان میں

رچ بس کر اس ماحول کا حصہ ہوگئی۔

کئی مہینے بعد جب اس کے اندر اس کے ساحل والے ساتھی کا بچہ ننھے ہلکوروں سے اپنے ہونے کا احساس دلانے لگا تو وہ اپنے ساتھی کا ہاتھ تھامے سرشاری کے عالم میں اس مقام کی طرف نکل آتی جہاں زندگی سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔

وہ ایک دلفریب شام تھی جب اس نے دیکھا کہ سمندر نے اس کا جہاز اگل دیا ہے۔خوش ہونے کی بجائے اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا کہ جہاز میں لگے آلات کی مدد سے اسے ڈھونڈ نکالا جاسکتا تھا۔اور وہ شدتِ غم سے خود کلامی سی کرنے لگی تو اس کے ساتھی نے اس کا سر اپنی چھاتی سے لگالیا۔

اب......اب......اس کی مسرتیں اس سے چھین لی جاسکتی ہیں......شیری نے جھرجھری سی لی۔

اور......اور اس مقام کی معصومیت نوچ لی جاسکتی ہے۔شیری کا چہرہ پیلا سا پڑ گیا۔

اس کی دنیا تہہ وبالا ہوسکتی ہے......اور وہ اگر اپنے ساتھی کو اپنے ساتھ لے جائے تو کون جانے اس کے ساتھ کیا سلوک......اس کے ساتھی کی زندگی کو خطرہ ہوسکتا ہے۔

شیری ایک چیخ مار کر بے خود سی ہوگئی۔اس کے ساتھی نے اس کے سر اپنی گود میں لے لیا۔اور اس کا ماتھا سہلاتا رہا۔شیری نے آنکھیں کھولیں اور جہاز کی طرف گردن موڑی۔پھر کچھ لمحوں بعد اٹھ کر جہاز کے قریب چلی گئی۔

جہاز میں بہت زیادہ خرابی پیدا نہیں ہوئی تھی۔وہ جانتی تھی کہ جہاز کو کیسے ٹھیک کیا جا سکتا ہے۔وہ سگنل ریسیو کر رہا تھا۔بس چند ایک بٹن دبانے کی دیر تھی جس کے بعد اس کا اپنی دنیا سے رابطہ ہوسکتا تھا۔اور شیری یہ بھی جانتی تھی کہ سگنلز ہمیشہ کے لئے کیسے بند ہوسکتے ہیں۔

اس نے نظر گھما کر نوجوان کی طرف دیکھا۔اُس کی آنکھوں میں خوف کے سائے سے لہرا رہے تھے۔تکنیکی دنیا کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا اور اس بات کے علاوہ کچھ نہیں سمجھتا تھا کہ اس کے بچے کی ماں اس کے پاس ہے اور وہ دور بھی ہوسکتی ہے۔اس نے

شیری کے شانوں کو ہاتھوں سے تھام لیا۔اس کی باہوں میں شیری کے مستقبل کا تحفظ تھا۔اس کی گہری گہری آنکھوں میں وعدے تھے۔اس کے چہرے پر دکھ اور سکھ با۔نٹنے کا عظم تھا۔پریشان سی پیشانی پر ابھری لکیروں کے اوپر اس کے لہراہے بال اسے مزید حسن بخش رہے تھے۔لانبی لانبی انگلیوں والے اس کے ہاتھ اسی لئے بنے تھے کہ شیری کے کندھوں کو تھام سکیں۔اس کے بازوؤں کی مچھلیاں اسی لئے ابھری ہوئی تھیں کہ شیری کی کمر کو سہارا دے سکیں۔

شیری کی آنکھیں بھر آئیں۔اس نے نوجوان کے کھردرے رخسار کو اپنی نرم انگلیوں سے چھوا اور ایک گہرا سانس لیا۔

یہ راحتیں اس سے چھن سکتی ہیں۔۔اور وہ کبھی کسی کو ان راحتوں کے بارے میں سمجھا نہیں سکے گی......اور......اور ایسی راحتوں سے اس جیسی سوچ رکھنے والی لڑکیاں محروم رہیں گی......ہمیشہ......ہمیشہ......

شیری نے پلٹ کر شکستہ جہاز کو دیکھا۔

اگر وہ کسی طرح ماما کو اپنا ہم خیال بنالے تو ایک نئی دنیا کی بنیاد پڑ سکتی ہے......آنے والی نسلیں مکمل پیدا ہو سکتی ہیں......اور آنے والی نسلوں کی تکمیل کی خاطر اسے......اسے......دو جہاں کی فکروں میں غلطاں اس وجیہہ پیشانی سے بچھڑنے کا خطرہ مول لینا ہوگا۔۔

شیری نے جہاز سے نظریں ہٹا کر مرد کے چہرے کی طرف دیکھا پھر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر آہستگی سے اپنے پیٹ کے اطراف رکھ دئے۔اور پھر اس کے سینے پر اپنا سر رکھ کر اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔جانے کتنی دیر وہ روتی رہی کہ اچانک اُسے محسوس ہوا کہ اس نے ماما کی آواز سنی ہو۔

''اچھا ہوا۔۔اب مجھے گرینی بننے کے لئے کسی ٹام، ڈِک اینڈ ہیری کی ضرورت نہیں پڑے گی۔تم اکیلے مجھے نانی بنا سکتی ہو۔یو کین بی کم اے مام آن یوئر اون، بے بی۔۔''

اس کے کانوں نے سنا تو وہ گھبرا گئی۔اس کے پیٹ میں فطرت کے اصولوں سے الگ کوئی بچہ نہیں ہوگا۔کبھی نہیں اس نے پلٹ کر کہنا چاہا تو دیکھا کہ اس کی ماما تازہ

اخبار کے سائن والے صفحے کے اسی کالم کو بغور پڑھ رہی ہیں جسے شیری نے کچھ دیر پہلے پڑھا تھا۔اور اخبار، ماہِ جون سن پچیس سو سات کا نہیں ماہِ جون سن دو ہزار سات کا تھا۔اس نے اپنے صندلیں سے پیٹ پر انگلیاں گھمائیں۔اس میں کوئی بچہ تھا نہ اس کی کمر کے گرد کسی حسین نوجوان کی باہیں۔اس انکشاف سے اس کے ہونٹوں پر پُرسکون ہنسی ابھری اور غائب ہوگئی۔اس نے پلٹ کر کھڑکی کی چوکھٹ کے قریب لگی تصویر کی جانب نظر ڈالی۔

''آئی لو یو پاپا......'' وہ تصویر کے قریب چلی گئی اور کچھ اونچی آواز میں بولی۔

''آئی ہیٹ ہم......او کے......نفرت ہے مجھے اس سے......'' ماما نے بھی ذرا اونچی آواز میں کہا۔

وائی......ماما......؟''

نن آف یوئر بزنیس......''

''نو مام......اٹ از مائی بزنیس......''

''تم کیا جانو صدیوں سے عورت نے کتنا سہا ہے۔۔''

''ہوسکتا ہے اس سے پہلے مردوں نے سہا ہو......یا اس کے بعد سہنے والے ہوں ......خوامخواہ......''

''فضول کی بحث مت کرو۔۔تم جانتیں ہی نہیں ہماری حیثیت کیا تھی۔ترقی اور تہذیب پر فخر کرنے کے باوجود ہمیں کس کس طرح محروم رکھا گیا۔۔شروعات میں ووٹ تک کا حق لینے میں ہمیں صدی بھر کا وقت لگا تھا۔۔سب سے پہلے اٹھنے والی تانیثی آوازوں کو یورپ اور امریکہ جیسی جگہ میں دہائیوں چرچ سے ریکویسٹ کرنا پڑی تھی......پھر ساری دنیا میں پھیلا ہمارا موومینٹ......یا ساتھ ساتھ اپنے انداز میں دنیا بھر میں چلتا رہا......چل رہا ہے......یا چل رہا ہوگا......''

''او کے......بٹ پاپا......''

''یوئر پاپا......مائی فُٹ......وہ بھی ویسا ہی نکلا تمہارا باپ چہ انسکیور......اے

ٹپیکل میل شاونیسٹ......"

"او کے......اب ماما......آپ لوگوں نے اپنے حقوق حاصل کر لئے نا......آپ اپنی ہر مانگ قانوناً پوری کرا سکتی ہیں......اب میں......"

شیری نے لمحے بھر کے لئے ماں کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ پھر اٹھ کر کھڑکی کے قریب چلی گئی۔

"تو پھر مجھے بھی ماما......ایک مووُمینٹ شروع کرنا پڑے گی......اینٹی فیمینسٹ مووُمینٹ......آئی لو بوتھ آف یو۔۔"

اس نے چوکھٹ کے قریب لگی تصویر کے کانچ پر اپنی نرم نرم انگلیوں سے پاپا اور ماما کے چہروں کو چھوا اور پلٹ کر ماں کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔

............☆☆☆............

مشتاق مہدیؔ

نام :مشتاق احمد شاہ
قلمی نام :مشتاق مہدیؔ
تاریخ پیدائش :۱۳ر فروری ۱۹۵۲، خانیار سرینگر
پیشہ :ریٹائیرڈ سرکاری ملازم
افسانوی مجموعے :مٹی کے دیئے (۱۹۷۶)
آنگن میں وہ (۲۰۱۰)
پتہ :مدینہ کالونی، ملہ باغ، حضرت بل سرینگر
فون نمبر 9419072053

☆......مشتاق مہدی

منزل کہاں ہے تیری

''اپنی بکھری ہوئی کتابیں سمیٹو...... اور بڑھتے جاؤ کہ ہمیں آگے جانا ہے...... آگے...... بہت آگے......''

ماہان اُن سب کے بیچ اپنی ست رنگی جھنڈی لہراتا ہوا چیخ رہا تھا اور بستی کے لوگ جو ان، بوڑھے، مرد، عورتیں...... سبھی ہمہ تن گوش تھے۔ ان کے چہروں پر بڑا جوش وخروش نظر آ رہا تھا۔ لیکن کوئی کوئی تو اداس بھی تھا۔ اندر ہی اندر بجھا ہوا سا...... جیسے یہ لمحہ ہی عذاب ہے۔ یہ ساری کہانی ہی فضول اور بے معنی ہے۔ بس ایک فریب......

''ہٹاو...... ہٹاو یہ دُھند آنکھوں پر سے......'' ماہان کی آواز میں اچانک تلخی سی بڑھ گئی۔ کوئی جان نہ سکا کہ وہ کس سے مخاطب ہوا تھا...... اپنے آپ سے یا......

اچانک ایسا ہوا...... سیاہ گھنے بادلوں میں سے چمکتا ہوا حسین سورج باہر نکل آیا۔ دوسرے ہی لمحے زمین کی روشن کی بڑھ گئی اور سبز لہلہاتے کھیت بہت بھلے لگنے لگے اور آنکھوں کو فرحت بخشنے لگے۔

ماہان نے دور دور تک نظریں دوڑائیں...... رنگ بہ رنگی جھنڈیاں لہراتے ہوئے بستی کے لوگوں کو بڑے پیار سے دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں ننھے آنسو جھلملانے لگے لمحہ بھر بعد اُس کے ہونٹ حرکت میں آ گئے۔

''تم...... تم سب میری زمین ہو۔ میری زمین کی فصلیں ہو۔ تمہاری سبز گی ہی میری خوشی ہے۔ تمہارے خواب ہی میرے خواب ہیں...... تم لوگ نہیں جانتے ہو کہ تم سب

میرے لئے کیا ہو...... اور سنو راستوں کے پتھر توڑنے ہیں تو ہمیں ہی...... لیکن ایک دوسرے کا سہارا بن کے...... اور جہاں ہم ٹھہرے ہیں...... وہ ہماری منزل نہیں۔ ہمیں آگے جانا ہے اور آگے......''

''مگر کہاں......؟'' ایک بوڑھے نے اپنی جھنڈی لہرائی ''یار......'' ماہان نے اپنی ست رنگی جھنڈی کو آسمان کی طرف اوپر لہرا کر کہا...... ''اُس پار......''

''وہاں کیا ہے......؟''

''وہ سب جو ہم چاہتے ہیں۔ خوشی، مسرت، روشنی''

''روشنی......'' بوڑھے نے ایک قہقہہ لگا دیا...... ''ہم بہت فریب کھا چکے ہیں۔ اب کے اور فریب...... نہیں...... نہیں کہانی یہیں پر ختم کرو...... ہمیں واپس جانے دو...... ہمیں اور نہ بھٹکاؤ......''

ماہان نے ایک تیز خشم آلود نظر اُس پر ڈال دی۔ بوڑھے نے کچھ کہنا چاہا لیکن ہمت نہ ہوئی...... اچانک ہی بوڑھے کے ساتھی نے چلا کر کہا......

''ہماری تو عمریں گزر گئیں...... چلتے رہے اور انتظار کرو صبر کرو...... بس یہی لفظ سنتے ہوئے...... اور سبھی جانتے ہیں لفظوں سے خالی پیٹ نہیں بھرتا اور نہ کوئی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ ہمیں اور نہ بہکاؤ ماہان''

''دیکھو...... دیکھو تم......'' ماہان نے کچھ کہنا چاہا...... لیکن اس کے عقب میں اچانک ہی ایک شور سا اٹھا...... جس نے ماہان کی آواز کو دبا دیا......

اُس نے مڑ کر دیکھا۔ لوگوں کے بیچ ایک کھلبلی سی مچی تھی۔ وہ سب منتشر اور بے چین نظر آ رہے تھے...... ایک آواز کہیں نزدیک سے بلند ہوئی۔

''ارے...... چھوڑو یہ راگ پرانا...... آؤ چلیں......''

اور دوسرے ہی لمحے بستی کے لوگ واپسی کے لئے مڑ گئے۔ ماہان حیرت اور اداسی کے ساتھ انہیں دیکھتا رہا۔

ابھی وہ دس پندرہ میٹر ہی دور ہوئے تھے کہ آسمان کو کالے گھنے بادلوں کی چادروں نے اچانک گھیر سا لیا۔ سورج چھپ گیا اور اندھیرا سا چھا گیا جو بڑھتے بڑھتے پوری طرح پھیل گیا۔ لوگ سراسیمہ ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ ایک عمر رسیدہ بزرگ جو کچھ منتظر سا تھا قدرے اونچی آواز میں بڑے درد کے ساتھ بولا......

''بے وقوفو......! بہت بُرا ہوا۔ وہ کوئی عام آدمی نہیں ہے۔ اس اندھیرے کو دیکھتے ہو......''

''ہم نے کیا کِیا......؟'' ایک جوان کی آواز سنائی دی......عمر رسیدہ بزرگ نے کہا

''اچھا نہیں کِیا اُس کے ساتھ......میدان میں اُسے تنہا چھوڑ دیا......خدا معاف کرے ہمیں......چلو سب معافی مانگ لیتے ہیں......''

وہ منتشر تھے......اندر ہی اندر حیران و پریشان سے......کوئی آواز انہیں ہانک رہی تھی۔ اس بار عمر رسیدہ بزرگ کی آواز نے انہیں باندھ لیا۔ وہ پھر چلنے لگے ماہان کی طرف......

ماہان سر جھکائے کسی سوچ میں گم تھا۔ لیکن بستی کے لوگوں کی آوازیں......شور......اور قدموں کی آہٹیں قریب آتی ہوئی اُس کے ذہن سے ٹکرا رہی تھیں۔ بالآخر اس نے سر اٹھا کر دیکھا زن و مرد، بوڑھے، بچے سب اُس کے آس پاس قدرے شرمندہ سے کھڑے تھے۔ ماہان کی آنکھوں میں فطری شفقت ابھر آئی۔ لہجہ اونچا کر کے بولا۔

''یقین بہت بڑی چیز ہے جو ہر کامیابی کے لئے ضروری ہے......ایک بات بتاؤ۔ پار جانے سے تم کیوں کترا رہے ہو''

''وہاں اگلے پڑاؤ پر......''

بولتے بولتے وہ شخص رک گیا

ماہان نے حوصلہ بڑھایا......

''ہاں ہاں کہو......اگلے پڑاؤ پر کیا ہے......؟''

''اگلے پڑاؤ پر سیاہ دیوؤں کی ایک پُراسرار فوج ہے اور بھی کئی چھپی مخلوقات ہیں

جو بہت طاقت ور ہیں۔ ہم ڈرتے ہیں کہ ہم ان سے نہیں جیت سکیں گے۔ اس لئے ہم......"

"آگے بڑھنے سے رک جائیں....." ماہان نے تلخی کے ساتھ گھور کر کہا......

"بزدلوں کی طرح واپسی کا سفر اختیار کریں۔

شکست ماتھے پر لکھیں......حیف ہے تم پر......"

"ماہان......!" ایک غصہ بھری آواز ابھری

ماہان کے ٹھیک سامنے سرخ رنگی داڑھی والا درمیانی عمر کا شخص کہہ اٹھا...... "سمجھنے کی کوشش کرو ماہان......خودکشی عقل مندی نہیں ہے"۔

"اور بزدلی بھی عقلمندی نہیں ہے۔" ماہان کے لہجے میں ترشی آ گئی۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد بولا۔

"یقین رکھو خدا ہمارے ساتھ ہے اور آگے بڑھنا......آگے بڑھتے رہنا اُسی کا حکم ہے۔ اب جس کا جی چاہے میرا ساتھ دے......اور جس کا جی نہ چاہے......"

بستی کے لوگ پھر کسی شش و پنج میں پڑ گئے......لیکن ماہان کوئی آواز، کوئی عذر سنے بغیر ہی ایک تیر کی مانند نکل گیا۔

اور دوسرے ہی لمحے آسمان پر چھائی ہوئی ابر کی کالی چادریں ہٹتی سی نظر آ گئی...... آسمان صاف ہو گیا اور سورج پھر چمکتا ہوا دکھائی دیا۔ بستی کے لوگوں کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ قدم خود بخود ماہان کے پیچھے نکل گئے......!

..........☆☆☆..........

غلام نبی شاہدؔ

نام	:غلام نبی شاہد
تاریخ پیدائش	:۱۵/دسمبر ۱۹۵۲ء سرینگر
افسانوی مجموعہ	:مٹی کے دیئے (۱۹۷۶) تین ادیبوں کی مشترکہ کوشش
پتہ	:پرے پورہ، باغات برزلہ سرینگر
فون نمبر	9797946911

☆......غلام نبی شاہد

خوابیدہ گھونگھٹ

آج ۲۴ مارچ ہے۔ ہماری شادی کی تیسری سالگرہ مجھے تو خوش ہونا چاہئے تھا۔ میں اُداس کیوں ہوں......؟ عالیشان بنگلہ، نوکر چاکر، دھن دولت، پڑھی لکھی خوبصورت بیوی......سب کچھ ہوتے ہوئے بھی جیسے میرے پاس کچھ نہیں...... یہ بناوٹ ہے، فریب ہے، جل ہے......پھر......پھر حقیقت کیا ہے......؟......وہ بیرونی گیٹ کے دائیں طرف ایک خستہ مگر حقیقت پر مبنی ایک جھونپڑی...... جہاں نہ نوکر ہے، نہ چاکر ہے، نہ دھن ہے نہ دولت ہے...... جہاں حقیقت ہے......سکون سے پُر ایک خوشگوار زندگی ہے...... جہاں مالی اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ ایک پرسکون زندگی بسر کر رہا ہے......اُن کی شادی بھی تو آج ہوئی تھی...... یا ہاں ٹھیک تین سال پہلے اسی دن ۲۴ مارچ کو......!

میں جب بھی اُداس ہوتا ہوں۔ میرے قدم اُسی جھونپڑی کی اور بڑھنے لگے ہیں......جس کی گرد آلودہ دیواروں میں میرا ماضی دفن ہے......آج میں بہت اُداس ہوں...... اسلئے میرے قدم اُس جھونپڑی کی اور بڑھنے لگے......میں جوں جوں جھونپڑی کے اور بڑھنے لگا مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ماضی کا بپھرا ہوا سمندر مجھے نگلنے کے لئے بیقرار ہے......آج میں ماضی میں کھو جانے کے لئے تیار ہوں...... کیونکہ آج میں بہت اُداس ہوں......اچانک تند و تیز لہر نے مجھے ماضی کے بپھرے ہوئے سمندر میں ڈبو دیا......اور میں پیچھے بہت پیچھے چلا گیا......

اُن دنوں میری پوسٹنگ دہلی میں ہوئی تھی...... پہلے پہل میں دہلی کے نئے ماحول سے لوگوں اور خاص کر گرمی کی حدت سے کچھ اکتا سا گیا......لیکن چند ہی دنوں میں

مجھے ایک ساتھی مِل گیا......اور میں اس نئے ماحول سے مانوس سا ہو گیا...... یہ نیا ساتھی جس سے میں نے کبھی بات تک نہ کی...... جس کا نام تک نہ جانا...... جس نے میری طرف کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا...... اُسے دیکھ کر میرے دل میں ایک غیر معمولی ہمدردی پیدا ہوتی تھی...... میں ہر روز تصور میں اسکا ہمدرد بن کر اُس سے باتیں کیا کرتا تھا...... ہاں وہ بڑے پُل کے اس پار بائیں طرف فٹ پاتھ پر اپنے مستقبل کا دھندلا مگر زنگ آلودہ عکس دیکھتی رہتی تھی...... لیکن ہر آنے والا قریب پہنچ کر پھٹے ہوئے ڈوپٹے پر ایک سکہ پھینکتا ہوا چلا جاتا تھا...... میں نے اُس کے پھٹے ہوئے ڈوپٹے پر کبھی سکہ نہیں پھینکا...... وہ بھکارن تھی...... لیکن میرے دل نے اُسے کبھی بھکارن کے روپ میں نہیں دیکھا...... بڑی بڑی کالی آنکھیں جن کی خاموشی ساگر کی طرح اپنے اندر نہ جانے کتنے طوفان چُھپائے تھیں...... مُرجھایا ہوا معصُوم چہرہ...... گردشِ کی چکی میں پس کر پت جڑ کے پتے کی طرح سوکھ چکا تھا......

...... وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ درد بھی بڑھتا گیا...... ایک کسک تھی...... ایک چُھبن تھی...... ایک تصور تھا...... جو بھکارن کا لبادہ اوڑھ کر کبھی ہمدردی کی بھیک مانگا کرتا تھا...... اور کبھی افلاس کا لبادہ پھینک کر میرے دل و دماغ پر مُسلط ہو جاتا تھا...... آخر دو سال کے طویل عرصے کے بعد میری پوسٹنگ واپس سرینگر ہوئی...... لیکن میں اُس بھکارن کی کسکِ ۔درد۔ اور چھبن کو بُھلا نہ سکا۔ جس تصور درد اور چھبن کے سہارے میں نے دو سال کا طویل عرصہ ایسے گزارا جیسے میرے ساتھ میرا کوئی ہمدرد تھا...... ہم زبان تھا...... ہم خیال تھا......!

آخر میں نے اُس بھکارن کو اپنے ساتھ سرینگر لے جانے کا فیصلہ کر لیا...... اُس نے میرے ساتھ آنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔ جب میں نے اُس سے یہ کہہ کر اپنے ساتھ آنے کو کہا کہ "ہمارے گھر میں ایک مُلازمہ کی ضرورت ہے۔ اگر مناسب سمجھو"......! اِس سے پہلے میں کچھ اور کہتا اُس کی بڑی بڑی کالی آنکھیں میرا بغور جایزہ لینے لگیں۔ جیسے جو کچھ میں نے کہا تھا۔ اُس کا پسِ منظر میری آنکھوں میں دیکھنا چاہتی ہو۔ اُسکی آنکھیں پتہ نہیں کتنی دیر تک کھُلی رہیں۔ وہ مجھے بت بنی تکتی رہی...... جیسے اُسے ہاں وہ ۲۴

مارچ کی ایک شام تھی...... جب عبدآل میرا سب کچھ لوٹ لے گیا...... میں کچھ کہہ نہ سکا...... نجمہ خوش تھی۔ نجمہ کو اپنے وجود کا احساس ہو گیا تھا...... اُنہوں نے اپنی چھوٹی سی دنیا باغ کے بیرونی گیٹ کے دائیں طرف ایک جھونپڑی میں آباد کر لی......!

......آج ۲۴ مارچ ہے۔ اور میں بہت اُداس ہوں...... اسلئے میرے قدم اُس جھونپڑی کی اور بڑھنے لگے جس کی گرد آلودہ دیواروں میں میرا ماضی دفن ہے......!

............☆☆☆............

زاہد مختار

نام	:زاہد مختار
تاریخ پیدائش	:۱۵؍جنوری ۱۹۵۶
تعلیم	:گریجویشن
تصانیف	:ابتداء (۱۹۸۴) شعری مجموعہ
	خوشبو کا سفر (۱۹۸۲) ناول
	سلگتے چنار (۲۰۰۴) شعری مجموعہ
	جہلم کا تیسرا کنارہ (۲۰۰۵) افسانوی مجموعہ
	تمبرِ ہلم (۲۰۰۹) کشمیری شعری مجموعہ
	تحریریں (۲۰۱۲) افسانوی مجموعہ
اعزازات	:سفیر اُردو ایوارڈ، علی گڑھ، جموں و کشمیر اُردو اکادمی ایوارڈ
پتہ	:نئی بستی، اننت ناگ، کشمیر
فون نمبر	9797005555

❖

☆......زاہد مختار

جہلم کا تیسرا کنارا

سونہ جُو جس ہاؤس بوٹ میں رہتا تھا وہ ایک رات سیلاب میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بہہ گیا تھا نہ جانے سونہ جو کا کون سا سجدہ اللہ کے دربار میں ادا ہوا تھا جس کے طفیل اُسکا ایک مختصر سا کنبہ اُس آفت ناگہانی میں بچ گیا۔ جب ہاؤس بوٹ کا پہلا تختہ الگ ہو کر بہہ گیا تھا تب سونہ جو کی بیوی راجہ کو ہی اس بات کا احساس ہو چلا تھا کہ برسوں سے مرمت کی دہائی دینے والا اُنکے پُرکھوں کا ہاؤس بوٹ اپنے سارے حوصلے آج کے سیلاب میں ہار چکا ہے ......وہ بے اختیار چلاّئی تھی اور یوں اُس پورے کنبے نے جہاں اپنی گھر گرہستی کو جہلم کے پانیوں میں ڈوبتے اور بکھرتے ہوئے دیکھا تھا وہیں ایک کنارے پر وہ ایک دوسرے کو بارش میں چھپیرڑوں کی مانند بھیگے ہوئے دیکھ کر یہ یقین ہی نہیں کر پار ہے تھے کہ وہ سب زندہ تھے۔

لیکن وہ سب زندہ تھے ......سونہ جو بھیگی بھیگی آنکھوں سے اپنے گھر کو بکھرتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ وہ جس گھر میں پچھلی چھ دہائیوں سے رہ رہا تھا اُسے جہلم نے آج ایک ہی لمحے میں نگل دیا تھا۔ جہلم کے آس پاس کناروں پہ رہنے والے گھروں میں اندھیرا چھایا تھا، کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ رات کی اس بھیانک تاریکی میں اُن کے قریب رہنے والے ایک تنہا ہاؤس بوٹ کے مکینوں پر کیا گزری ہے... کہنے کو تو وہ سب آس پڑوس والے ایک زمانے میں سونہ جو کی طرح ہی ہاؤس بوٹوں میں رہتے تھے لیکن دھیرے دھیرے اُنہوں نے اپنے اپنے حصے کی زمین حاصل کر کے اپنا اپنا ایک پختہ اینٹوں کا گھر بنا لیا تھا اور شاید اسی لئے وہ اس طوفانی رات میں قدرے پرسکون تھے ....انہیں کم از کم یہ اطمینان تھا کہ یہ طوفانی، تیز و تند برق و باراں اُن کے کنکریٹ کے مکانوں کو نقصان نہیں پہنچا سکتی لیکن ....سونہ جو کا سارا گھر،

سارا اثاثہ اس بارش کی نذر ہو گیا تھا۔ وہ اپنے عیال کو بے بسی سے دیکھتا رہ گیا۔ چاروں طرف نیم تاریکی کا عالم تھا، کبھی کبھار آسمان پہ جب بجلی کھڑکتی تھی تو سونہ جو کو اپنی بیوی کے ساتھ ساتھ اپنے جوان بیٹے مختار اور بیٹی محبوبہ کے چہرے پر چھائے ہوئے خوف اور ماتم کے عکس نظر آتے۔ یہ کنبہ ایک چنار کے پیڑ تلے باد و باراں سے بچنے کی سعی لاحاصل کر رہا تھا لیکن چنار کا وہ درخت تو خود موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا کہ اُسکے بازوا بھی کٹ کر گر جائینگے اور وہ زندگی بھر کے لئے اپاہج بن کر رہ جائے گا اور اُسی بے بس پیڑ کے تنے سے قدرے چپکی ہوئی جوان، کنواری بیٹی محبوبہ کے چہرے پر بہتی ہوئی دھار کو دیکھ کر اس بات کا اندازلگانا ہی مشکل تھا کہ بارش کے قطرے کون سے ہیں اور آنسوؤں کے قطرے کون سے .... سونہ جو کا بیٹا غم ویاس کی تصویر تو بنا تھا لیکن اُس کے اندر ایک لاوا ابھی اُبل رہا تھا، کئی مہینوں سے وہ اپنے باپ کو ہاوس بوٹ سے نکل کر جہلم کے کنارے کی جھونپڑی تعمیر کرنے کی صلح دیتا آرہا تھا لیکن سونہ جو جانتا تھا کہ کنارے کی جھونپڑی باتوں سے تعمیر نہیں ہوتی....

راجہ اب پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی تھی سونہ جو نے تینوں کو چنار کے اُس پیڑ سے نکل کر قریب کے کسی ہمسائے کی چوکھٹ تک چلنے کی صلح دی اور تینوں اپنے بھیگے بھیگے جسموں اور ٹھٹھرتی روحوں کے ساتھ ہمسایہ خالق مٹہ کے مکان کی چوکھٹ تک آپہنچے .... بہت دیر تک خالق مٹہ یا اُسکے گھر والوں نے اُنکی آہ وپکار نہیں سنی۔ یا تو برق وباراں کے شور میں اُن کی آواز دب جاتی تھی یا خالق مٹہ اور اُسکا کنبہ بے خبر نیند سویا ہوا تھا...............

دنیا کا ایک نرالا دستور ہے، یہاں بھوکے کو بھی مرنے سے پہلے دو قطرے پانی کے منہ میں ڈال دیتے ہیں۔ عمر بھر جس کو تن ڈھانپنے کے لئے بھی دو گز کپڑا میسر نہیں ہوتا اُس کی میت کو مرنے کے وقت بھی چودہ گز کپڑے کا کفن دیا جاتا ہے۔ دنیا بڑی عجیب ہے، مرتے ہوئے کی کوئی فکر نہیں میتوں کے لئے ہر کوئی کچھ نہ کچھ کرنے کے لئے سامنے آتا ہے......

سونہ جو اور اُسکے کنبے کو کئی مہینے تک موت وحیات کا اصلی رنگ دیکھنا پڑا۔ اپنے

گھر کی بوسیدہ سی چادر دیواری میں آدمی فاقے سے بھی رہے تو بھی شان سے جینے کا مظاہرہ کرتا ہے لیکن جب بے سروسامانی کی حالت میں آدمی اپنے رشتہ دار کے گھر میں پناہ لے اور اُسکے پاس کھانے کے لئے دو لقمے اور پہننے کے لئے دو کپڑے نہ ہوں تو زندگی ایک اژدھا ہے کی طرح پھن پھیلاتی ہوئی نظر آتی ہے ....رہنے کو تو سونہ جو کا کنبہ بھی سر چھپانے کے لئے جہلم کے دوسرے کنارے پہ کھڑے ایک اور ہاوس بوٹ میں منتقل ہو گیا تھا لیکن رحمان ملہ کا یہ ہاوس بوٹ اُسکے اپنے عیال کے لئے بھی وسیع دل نہیں رکھتا تھا۔ ایسے میں ایک ہی کونے میں بے سروسامانی کی زندگی کو نئے سرے سے شروع کرنا........یہ کیفیت خود سونہ جو بیان کرنے سے قاصر تھا لیکن جب دو ہفتوں کے بعد رحمان ملہ نے اُسے ایک رات اپنے کمرے میں بُلا کر اُسکے مستقبل کے بارے میں پوچھا تو وہ کچھ کہہ نہ پایا۔

''سونہ جو؛ اس طرح خاموش رہنے سے اگر انسان کی مصیبتیں ختم ہوتیں تو ان دو ہفتوں میں حکومت نے تمہاری کوئی مدد کی ہوتی''

''نہیں ....اُس کے لئے تو مختار کئی دنوں سے وزیر وزارت کے چکر لگا رہا ہے......انشاء اللہ کچھ دنوں تک ہمیں ایک ہاوس بوٹ بنانے کے لئے کچھ لکڑی اور نقدی ملنے والی ہے''

''بس یہی خواب دیکھتے رہو...تم کیا سمجھتے ہو حکومت کو اس سیلاب اور طوفان سے ہوئی تباہ کاری کے بجائے صرف تمہارے اُس خستہ حال ہاوس بوٹ کی فکر ہوگئی....سونہ جو، خود کچھ سوچو، یہ حکومتیں ہم غریبوں کو صرف ووٹ کے دن یاد رکھتی ہیں''

''اللہ بڑا کارساز ہے رحمان بھائی، دیکھتے ہیں اُس نے ہمارے مقدر میں کیا لکھا ہوگا، ویسے بھی میں اپنا کنبہ لے کر تمہارے پاس زیادہ دن نہیں ٹھہر سکتا کیونکہ تم لوگوں کو بھی جگہ کی تنگی ہو رہی ہے''۔

''ارے نہیں؛ تم چاہو تو اس گھر میں ایک سال تک رہ سکتے ہو.....یہ تو تمہارا ہی ہاوس بوٹ ہے یہ سب باتیں ایسے ہر موقعے پر سننے کو ملتی ہیں۔ یہ سونہ جو بھی جانتا تھا اس

نے بھی بہت ساری دنیا دیکھی تھی۔ جوانی میں وہ اپنا ایک خوبصورت شکارا لیکر دنیا بھر کے سیلانیوں کو چار چناری اور نہرو پارک تک لے جاتا تھا لیکن پھر اُسکی ڈھلتی جوانی کے ساتھ ہی اُس کی ہمت جواب دینے لگی۔ یہ وہ دن تھے جب اُسکا بیٹا مختار جوان ہو چکا تھا لیکن جب مختار نے باپ کے پیشے کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھا تو سونہ جو کو پہلی بار یہ احساس ہو گیا کہ اُس کا برسوں پرانا گھر (ہاوس بوٹ) ٹوٹنے لگا ہے...... مختار نے باپ کو دوٹوک لفظوں میں کہہ دیا کہ وہ سیلانیوں کا غلام بن کر اپنی زندگی نہیں گزار سکتا۔

سونہ جو جہاں دیدہ تھا اُسے اپنے بیٹے کے ذہن میں اُبھرتے ہوئے شعلوں کی تپش اپنے جسم و جگر میں محسوس ہوئی تھی لیکن اُسے اولاد کے مستقبل کی بھی فکر تھی اور جب ایک دن مختار نے اپنے مستقبل کا خاکہ خود ہی پیش کیا تو سونہ جو کو ذرا بھر بھی حیرت نہ ہوئی...... مختار شال پھیری کرنے کے لئے کلکتہ جانا چاہتا تھا... اور اس فیصلے کے کچھ ہی دنوں بعد سیلاب نے سونہ جو کی ساری گھر گھر ہستی کو تاراج کر دیا تھا......

چند دنوں کے بعد مختار شال بیوپاری سے کچھ شال لیکر رحمان ملہ کے ہاوس بوٹ میں داخل ہوا اور سب سے پہلے رحمان ملہ کو ہی پتہ چلا کہ مختار اپنے گھر والوں کی فکر کرنے کا نیا جواز پیش کر رہا ہے.. رحمان ملہ جب اُس سے گٹھری کے بارے میں پوچھ رہا تھا اُسی لمحے اندر سے سونہ جو بھی باہر آ گیا، شام کی روزی روٹی کا بندوبست کرنے کے لئے۔

''آو سونہ جو آو..... مبارک...... تمہارا بیٹا تو ایک نیا کاروبار کرنے نکلا ہے''

سونہ جو کو رحمان کے لہجہ کچھ ہتک آمیز لگا لیکن جب اس نے اپنے بیٹے کی زبان سے یہ سنا کہ وہ اگلے دن کچھ دوستوں کیساتھ کلکتہ جانے کی پکی تیاری کر چکا ہے تو اُسے اپنی بوسیدہ ٹوپی میں ہزاروں شگاف نظر آئے ''بیٹے ابھی ہمیں اپنے سر چھپانے.....''

''ابو.. یہ سر چھپانے کا معاملہ جب تک حل ہو گا تب تک کلکتہ کا سیزن میرا انتظار نہیں کر سکتا.. آپ کچھ انتظام کیجئے، میں لوٹ کر آپکی مدد کرونگا... تب تک میرے ہاتھ میں کچھ پیسے آ چکے ہونگے'' رحمان ملہ سونہ جو کو تکتا رہ گیا اور سونہ جو اپنی خفت بھی نہ مٹا سکا

دوسرے دن پو پھٹتے ہی مختار جا چکا تھا اور اُسی دن سونہ جو نے کہیں سے کچھ لکڑیاں اور گھاس پھوس جمع کر کے جہلم کے کنارے ایک جھونپڑی بنانے کا صبر آزما کام شروع کیا۔ کچھ راجہ نے اور کچھ محبوبہ نے باپ کا ہاتھ بٹایا اور ایک ہفتے کے بعد وہ رحمان ملہ کے ہاؤس بوٹ سے اپنی جھونپڑی میں منتقل ہوگئے ۔ اُس رات راجہ نے کھانا پروستے ہوئے مختار کو بہت یاد کیا۔

''کاش آج مختار بھی ہمارے پاس ہوتا۔ آج ڈیڑھ سال کے بعد اپنے گھر میں کھانا پروس رہی ہوں۔ اتنے دنوں ایسے لگ رہا تھا جیسے سب کچھ کسی نے بھیک میں دیا ہو''۔

''جھونپڑے کے واحد کمرے میں کوئی کچھ نہ بولا ، ہر ایک کی اندرونی کیفیت ایک جیسی تھی بات تب طول پکڑتی ہے جب تضاد کے دھاگے میں پروئی جائے......اُس وقت سب خاموشی سے روکھی سوکھی کھانے لگے۔''

دوسری صبح جب سونہ جو نیند سے جاگ کر جھونپڑی سے باہر نکلا تو اُسکی نگاہوں کے سامنے جہلم کے اُس پار اُسے وہ جگہ نظر آئی جہاں برسوں تک اُس کا گھر ایک ہاؤس بوٹ کی شکل میں موجود تھا اُسے یوں لگا جیسے اب وہاں پانی کی ایک قبر ہو جس میں وہ خود دفن ہو چکا تھا.. اپنی اس سوچ سے چھٹکارا پانے کے لئے حسب فطرت اس نے اپنے آپ کو ایک جھٹکا دیا اور پیچھے مڑ کر اپنی چھوٹی سی دنیا، چھوٹی سی جھونپڑی کو دیکھنے لگا......زندگی بھر اس نے یہی کچھ تو سیکھا تھا۔ گزرے لمحوں کو بھول کر نئی ساعتوں کا خیر مقدم کرنا لیکن آنے والی ساعتوں نے اُسے ایک نیا جھٹکا دیا...ایک دن علی الصباح حکومت کے دو کارندے اُس کی جھونپڑی کے باہر اُسے بلانے لگے محبوبہ نے جھونپڑی کے اندر نمکین چائے بناتے ہوئے اُنکی آواز سنی.. سونہ جو اس وقت فجر کی نماز پڑھ رہا تھا۔ راجہ کی طبیعت اُس دن ناساز تھی، وہ دو دن سے بخار میں تپ رہی تھی......حکومت کے کارندوں کی آواز نے سونہ جو کی عبادت میں بھی خلل ڈال دیا اُس نے جلدی جلدی فرض ادا کیا اور باہر نکل آیا۔

باہر حکومت کے کارندوں کو دیکھ کر پہلے تو وہ کچھ سمجھ نہ پایا کہ کیا ماجرا ہے لیکن جب

اُس نے کارندوں کے عقب میں ایک دیوہیکل بلڈوزر کو بھی آتے ہوئے دیکھا تو اُسے یوں لگا کہ اُسکی زندگی کا آخری سیلاب اُس کے گھر کی طرف بڑھ رہا ہے......وہ صرف ملتجی ہوا۔

''میں بے آسرا کہاں جاؤں، کیا یہی حکومت کی امداد ہے۔ اُس کنارے میری ایک دنیا اُجڑ گئی، کیا اس کنارے آپ میری یہ دنیا بھی تاراج کرنا چاہتے ہیں۔ آخر میں اپنی بیمار بیوی اور جوان بیٹی کو لیکر کہاں جاؤں''۔

''جہاں بھی جاو گے خیال رکھنا، جہلم کے دونوں کناروں پر ناجائیز تعمیرات کو زمین بوس کیا جائے گا''۔

''تو بھائی میرے ....جب اس جہلم کے یہ دونوں کنارے ہم غریبوں اور بے سہاروں کے لئے ممنوع ہیں تو آو. میرے اس گھر کو زمین بوس کردو...میں ...میں اپنے لئے اور اپنے عیال کے لئے جہلم کا تیسرا کنارا ڈھونڈ ہی لونگا جہاں ہم لوگوں کا گھر نہ سہی قبریں تو بن سکیں گی۔

کارندے پیچھے مڑ کے دیکھ رہے تھے ...شاید سونہ جو کی بے بس نظروں کی تاب ہی نہ لا سکے تھے۔

لیکن دروازے پہ آنسو بہاتی ہوئی محبوبہ اور بخار سے کپکپاتی ہوئی راجہ کو ایسا لگ رہا تھا کہ اُن کا سرپرست سونہ جو اپنا دماغی توازن کھو چکا ہے۔''

بلڈوزر......کارندوں کے اشارے پر آگے بڑھ چکا تھا...........

............☆☆☆............

ڈاکٹر منصور احمد منصوؔر

نام :منصور احمد میر
قلمی نام :ڈاکٹر منصور احمد منصوؔر
تاریخ پیدائش :۱۹۵۷ء باندی پورہ کشمیر
تعلیم :پی۔ایچ۔ڈی (اُردو)
پیشہ :پروفیسر، شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی
تصانیف :(۱) کشمیر: خواب، سراب، گرداب (انشائے اور خاکے)
(۲) یہ عذابوں کی بستی (افسانوی مجموعہ)
(۳) اردو افسانے میں مشترکہ تہذیبی عناصر (تحقیقی مقالہ)
(۴) موجِ قلم (تنقیدی مضامین)
پتہ :شعبہ اردو، کشمیر یونیورسٹی، سرینگر
فون نمبر 9419420972

☆......منصور احمد منصور

سند باد جہازی کی ڈائری

یہ سند جہازی کی ڈائری کے چند اوراق ہیں جو دیس بدیس پھرنے کے بعد اس شہر میں آن بسا۔ اس شہر کو بعد میں سیلاب بہالے گیا۔ تباہ شدہ شہر کا ملبہ جب ہٹایا جارہا تھا تو ملبے سے سند باد کی ڈائری کے چند اوراق ملے......

پہلا ورق:

یہ عجیب وغریب شہر ہے۔ اس نے پہلی ہی نظر میں میرا دل ایسا موہ لیا کہ میں نے دنیا جہاں سے رخ پھیر کر اسی شہر میں بسنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اس طرح کا انوکھا اور نرالا شہر کہیں نہیں دیکھا۔ یہ بازیگروں، شعبدہ بازوں اور جادوگروں کا شہر ہے۔ طلسم سامری کے متعلق آج تک جو کچھ دیکھا، سنا اور پڑھا تھا وہ اس طلسماتی شہر کے آگے ہیچ معلوم ہوتا ہے۔

اس شہر کے بیچوں و بیچ ایک بڑی شاہراہ ہے جو شاہراہ ستم کہلاتی ہے۔ یہ شہر کی قابل دید شاہراہ ہے۔ اس شاہراہ پر خواجہ سگ پرست کی حکمرانی ہے اس لیے آدمی قید میں ہیں اور کتے آزاد۔ شاہراہ ستم کے ایک طرف آہنی پنجرہ ہے جس میں پیر و جوان قید ہیں۔ قیدیوں میں ایک معمر بزرگ بھی ہے جو ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا ہے۔ اس کے سر کے بال اور ناخن بڑھ گئے ہیں۔ بیشتر قیدی پنجرے کے اندر ہی گھٹ گھٹ کر مرتے ہیں۔ جو نہیں مرتے وہ مرنے کی دعا مانگتے ہیں۔ پنجرے کے مقابل میں سونے اور چاندی کا ایک بڑا تخت بچھا ہوا ہے جس پر کتا بیٹھا ہے۔ کتے کے گلے میں ہیرے جواہرات کا پٹا ہے۔ تخت کے اردگرد سیاہ رنگت کے خدمتگار کھڑے رہتے ہیں۔ کوئی سونے کا پنکھا جھلاتا ہے اور کوئی سونے کے رومال

سے کتے کے پاؤں اور منہ صاف کرتا ہے۔ بعض کتے کے آگے طلائی سر پوش سے ڈھکی لنگری میں کھانا رکھتے ہیں۔ سونے کے برتن میں پانی رکھتے ہیں۔ کتا جب سیر ہو جاتا ہے تو اس لنگری کو آہنی پنجرے کے نزدیک لیکر خواجہ سگ پرست سے کنجی مانگ کر قفس کا قفل کھولتے ہیں۔

آہنی پنجرے میں بند انسانوں کے کتے کا جھوٹا کھانے پر مجبور کرتے ہیں۔ جو کھانے سے انکار کرتا ہے اسے کوڑے مارے جاتے ہیں۔

شاہراہ پر لوگوں کی بھیڑ جمع رہتی ہے جو تخت پر بیٹھے کتے کو ٹکٹکی باندھے تکتی رہتی ہے۔ سونے کے برتنوں میں انوع واقسام کے پکوان دیکھ کر بھیڑ میں شامل افراد کے منہ سے رال ٹپکنے لگتی ہے اور ان کے اندر کتا بننے کی کواہش چوینٹیوں کی طرح رینگنے لگتی ہے۔ جب خواہش شدت اختیار کر لیتی ہے تو یکا یک انکی جون بدل جاتی ہے۔ جسم پر بال اگتے ہیں اور منہ سے بھوں بھوں کی آواز نکلتی ہے۔ ان کے گلے میں بھی سونے کا پٹہ ڈال کر تخت پر بیٹھا جاتا ہے۔

دوسرا ورق:

شہر کی گلیاں اور کوچے ناگن کی طرح بل کھاتی اور پھن پھیلائے محسوس ہوتی ہیں۔ گلیوں میں تو عجیب وغریب مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ لوگ جب سودا سلف خریدنے کے لیے گھروں سے نکل کر گلی میں آتے ہیں تو کوئی جادوئی آواز گونجنے لگتی ہے۔ لوگ جادوئی آواز سنتے ہی سودا سلف پھینک کر مرغوں کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ گلی مرغوں سے بھر جاتی ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ ان مرغوں کو جادوئی سانپ مینڈکوں کی طرح نگل جاتے ہیں۔ بعضوں کو جادوئی چیلیں چوزوں کی طرح اسطرح اچک لیتی ہیں کہ عقل حیران اور نظر دھنگ رہ جاتی ہے۔

تیسرا ورق:

بازاروں، ہوٹلوں، باغوں، دفتروں، تیوہاروں اور میلوں میں گھومنے پھرنے سے معلوم ہوا کہ یہ شہر بحث ومباحثٔ اور کٹھ پتلیوں کے کھیل کا بڑا رسیا ہے۔ شہر کے دانشور،

طلبا، اساتذہ، کلرک، تاجر، مزدور اور ملا و مولوی بیشتر وقت کج بحثی کے لیے، ہوٹلوں، ڈرائنگ روم اور پارٹی دفاتر پر مذاکروں اور سیمناروں کا اہتمام کرتے ہیں اور لاحاصل بحث کرتے ہیں۔ دور کی کوڑی لوتے ہیں۔ اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں اور ہوائی قلعے تعمیر کرتے ہیں۔ مرکز سے گریز اختیار کر کے لامرکزیت کی وکالت کرتے ہیں۔ کبھی ایک چیز کو اشو بناتے ہیں اور کبھی اسے نان اشو قرار دیتے ہیں۔ کبھی ہاتھ میں تلوار اٹھاتے ہیں اور کبھی بازؤں میں چوڑیاں پہنتے ہیں۔ کبھی مشرق کی طرف منہ کر کے سجدہ کرتے ہیں تو کبھی جنوب کو قبلہ قرار دیتے ہیں۔ اپنے ہر عمل کو صحیح اور حق بجانب ثابت کرنے کے لیے لفظوں کے دریا بہاتے ہیں......

چوتھا ورق:

لاحاصل بات چیت کے علاوہ شہر کٹھ پتلیوں کے تماشے کا بڑا شوق رکھتا ہے۔ شہر کے وسط میں ایک بڑا اسٹیج ہے۔ جہاں ستلیوں سے آویزاں کٹھ پتلیاں نظر آتی ہیں۔ جو مختلف اوقات میں سٹیج پر اتاری جاتی ہیں یا سٹیج سے ہٹائی جاتی ہیں۔ تماشہ گر جب چاہتا ہے ایک ستلی اوپر کھینچ لیتا ہے اور دوسری کٹھ پتلی نیچے اتار دیتا ہے۔ شہر کے باسی کٹھ پتلیوں کا والہانہ استقبال کرتے ہیں۔ ان پر گلباری کرتے ہیں۔ سروں پر دستار فضیلت باندھتے ہیں اور کٹھ پتلیوں کے آگے پیچھے وحشیوں کی طرح رقص کرتے ہیں۔ وہ کٹھ پتلیوں کو اپنا ہیرو مانتے ہیں تماشہ گر کو ہر ہر گام پر جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔

پانچواں ورق:

اس شہر کی یہ عجب ریت ہے کہ محسنوں اور مخلصوں کو دھتکارتی ہے، تختہ دار پر لٹکاتی ہے اور غداروں کی غداری کا جشن مناتی ہے۔ غداروں کے نام پر پل، اسٹیڈیم، اور ذبح خانے تعمیر کرتی ہے۔ موقف تبدیل کرنے والون، نظر اور نظریے سے منہ موڑنے والوں، تاریک سرنگوں میں دھکیلنے والوں کے ناموں کی مالا جپتے ہیں...... اور بعد میں پشیمان ہوتے ہیں۔

کافی عرصہ یہاں گزارنے کے باوجود یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ اس طلسم کے پیچھے کون سا سامری، کاہن اور جادوگر بیٹھا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ وہ پہاڑوں کے عقب میں رہتا

ہے۔ یہاں صرف اس کے وفادار کارندے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ طلسم کے پیچھے زر خالص کارفر ما ہے۔ کوئی کہتا ہے یہاں سب جادوگر اور شعبدہ باز ہیں...... اللہ اعلم بالصواب۔ البتہ یہ بات سمجھ میں ضرور آئی کہ یہاں ہر شخص خود اپنا دشمن ہے۔ اپنے ہی خلاف سازش کرتا ہے۔ خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مارتا ہے۔ اپنی حفاظت کے حصار مسمار کرتا ہے۔ اور خود ہی اپنے آپکو مجبور مظلوم و مقہور بناتا ہے۔

چھٹا ورق:

کئی دنوں سے یوں لگ رہا ہے کہ کوئی طوفان آنے والا ہے جو سب کچھ فنا کر دے گا۔ شہر کی گلیوں اور بازاروں میں گھومنے پھرنے کے دوران اس بات کا عندیہ ملا کہ شہر کی نئی پود کے اندر خواجہ سگ پرست اور بار بار موقف، نظریہ اور لبادہ بدلنے والوں کیخلاف نفرت کا لاوا پک رہا ہے جو آتش فشاں کی طرح پھٹنے کے لیے بے تاب ہے۔ اگر یہ پھٹ جائے تو بہتا ہوا لاوا سیلاب کی طرح شہر کو بہا لیجا سکتا ہے۔ یہ بھی اندازہ ہوا کہ کتا بننے کی خواہش کمزور پڑتی جارہی ہے۔ شہر میں کیا عالم ہوگا، کچھ کہا نہیں سکتا......

آخری ورق:

میں ڈائری لکھنے میں مشغول تھا کہ اچانک خوفناک گڑگڑاہٹ کی آوازیں سنائی دیں۔ آتش فشاں پھٹ چکا ہے اور لاوا شہر کے اطراف و اکناف میں تیزی سے پھیل رہا ہے......

ڈائری کی آخری سطریں ٹھیک سے پڑھی نہیں جاتیں یہ بھی معلوم نہیں کہ سندباد جان بچا کر شہر سے نکلنے میں کامیاب ہوا تھا یا وہ بھی اسی لاوے میں بہہ گیا......

............☆☆☆............

واجدہ تبسم گورکھو

نام :واجدہ تبسم گورکھو

تاریخ پیدائش :یکم نومبر ۱۹۵۲ء، سرینگر

تعلیم :ایم۔اے (اُردو)، ایم۔اے (کشمیری)

تصنیف :ڈولتی نیا (افسانوی مجموعہ)

پیشہ ریٹائرڈ سرکاری ملازم

مصروفیت ادارت، ہفت روزہ ''العطیق'' سرینگر

پتہ ۸/ای، کواپریٹو کالونی، پیرباغ سرینگر

فون نمبر 9906508662

ای۔میل wajida.tabassum@yahoo.com

☆......واجدہ تبسم گورکھو

رنگ برنگے سپنے

وہ کرسی پر بیٹھا مجھے بہت گھور رہا تھا۔ میں اپنے کام میں مگن تھی۔ مگر میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف بار بار نظریں اٹھاتی تھی میری شادی آج سے پانچ سال پہلے اس کے ساتھ ہوئی تھی۔ میں اور وہ ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے۔ کالج کے چار سالوں میں میرا دھیان اس کی طرف بالکل نہیں گیا تھا۔ مگر آخری سال میں ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے کہ بات شادی تک پہنچی۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے۔ جب اُس نے پہلی بار مجھ سے اپنے دل کی بات کہہ دی اور مجھے بھی ہاں کرنے میں دیر نہیں لگی۔ شاید ہماری عمر بھی اتنی ہو گئی تھی کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھنے لگے تھے۔ اس نے گھر میں اپنی ماں کو کہہ دیا تھا کہ میں جب بھی شادی کرونگا۔ تو ایک گاؤں کی لڑکی کے ساتھ ہی کرونگا جب اس نے مجھ سے یہ بات کہی تو مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ کیونکہ میں شہر میں پڑھی تھی۔ بے شک گاؤں کے ایک چھوٹے سے قصبے سے آئی تھی اور آج تک کسی نے مجھے یہ احساس نہیں دلایا تھا کہ میں دیہاتن ہوں یعنی گاؤں سے تعلق رکھتی ہوں۔ مجھے شہر کی زندگی بہت پسند تھی کیونکہ یہاں کی لڑکیاں بالکل نازک اور الگ انداز رکھنے والی ہوتی ہیں۔ وہ ہمارے گاؤں کی طرح کھیتوں میں کام نہیں کرتی ہیں۔ لکڑیاں نہیں کاٹتی ہیں۔ سر پر بوجھ نہیں اٹھاتی ہیں۔ چولے نہیں جلاتی ہیں۔ چکی نہیں پیستی ہیں۔ بھیڑ، بکریاں اور گائیں وغیرہ نہیں چراتی ہیں۔ کنویں سے پانی بھر بھر کے نہیں لاتی ہیں اور شہر کے لوگ اکثر گھر میں کام کاج کے لئے نوکر وغیرہ رکھتے ہیں۔ مجھے کام کرنے کا بالکل شوق نہیں تھا۔ شاید اسی لئے انور مجھے گھور رہا تھا۔ کہ یہ چُلبل سی لڑکی، کام سے جی چرانے والی آج کام

کیسے کر رہی ہے۔

شروع میں جب میں گاؤں سے شہر کالج میں پڑھنے کے لئے آئی تھی اور شہر کی لڑکیوں کے بارے میں اتنا سب کچھ نہیں جانتی تھی۔ جتنا مجھے ان چار سالوں میں دیکھنے کو ملا۔ میں دیکھتی تھی کہ لڑکیاں سرِ عام بِنا سر ڈھکے بالوں کو کھلے چھوڑ کر چلتی ہیں۔ ڈوپٹہ تو نام کے لئے ہوتا ہے۔ بے حیائی سے اپنے یا پرائے مردوں کے ساتھ کبھی کبھار ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے بھی چلتی ہیں۔ بڑی بے باکی سے گھومتی ہیں۔ بڑے بزرگوں سے بھی کوئی ہمدردی نہیں ہے، والدین کا لحاظ نہیں، بھائی بہنوں کے لئے پیار نہیں۔ صرف اپنے لئے جینا چاہتی ہیں۔ اپنے لئے سب کچھ کرنا چاہتی ہیں اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ اکثر بہوئیں اپنے سسرال میں خاندانی روایت کو درہم برہم کر کے رکھ دیتی ہیں۔ شادی کے بعد ہی اپنے سسرال والوں سے الگ رہتی ہیں۔ اپنا گھر الگ بنانا چاہتی ہیں اور یہ احساس مجھے انور نے دلا دیا تھا کہ میں یہ چیزیں اپنے مشاہدے میں لاؤں۔ اسی لئے انور چاہتا تھا کہ وہ ایک گاؤں کی لڑکی سے شادی کرے۔ کیونکہ گاوں کی لڑکیاں بہت ہی سیدھی سادھی ہوتی ہیں۔ سر پہ پلو رکھتی ہیں۔ کام کاج میں بھی ماہر ہوتی ہیں۔ حیا کا مجسمہ اور تہذیب کی دیوی ہوتی ہے۔ گاؤں میں سب لوگ کام کرتے ہیں۔ وہ کوئی نوکرانی یا آیا نہیں رکھتے ہیں۔ اس لئے شاید میں بھی ان کے گھر جا کر سارے کام اپنے ہاتھوں سے ہی کروں گی۔

میں ان سب باتوں سے تو ناواقف تھی مگر انور کی محبت نے میرے دل میں ایک ایسا چراغ جلا دیا تھا۔ جس کی لو ان کی یادوں سے کم ہی نہیں ہو جاتی تھی۔ انور نے مجھ میں گھر کی ملکہ کا خواب دیکھا جو آج سے پورے پانچ سال پہلے پورا ہو چکا تھا۔ جب ان کے گھورنے کی وجہ میں نے پوچھی تو کہنے لگے۔ تمہیں پتہ ہے کہ ''میں نے تم سے پیار کیوں کیا''۔ میں نے کہا۔ ''نہیں''۔ تو اُس نے اپنے دل کی کتاب کھول دی۔ مجھے بھی شاید اسی پل کا انتظار تھا کہ وہ کچھ بول دے کہ وہ مجھے کیوں گھور رہا ہے۔ جب سے تم نے کالج میں داخلہ لیا اور میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا۔ تبھی میرے من میں خیال آیا کہ اگر مجھے اپنی ماں

کو خوشیاں دینی ہے اور وہ خوشیاں تم دے سکتی ہے۔ میری ماں شہری ہونے کے باوجود ایک سیدھی سادھی گھریلو قسم کی عورت ہے۔ وہ ہر کسی کا بھلا چاہتی ہے۔ کسی کے بُرے کے لئے شاید ہی کبھی اس کے دل میں کبھی بُرا خیال آیا ہو۔ ہم تین بھائی تھے جیسے کہ آپ کو پتہ ہے۔ میرا بڑا بھائی پہلے ہی فوت ہو چکا ہے۔ جس کا غم آج تک میری ماں بُھلا نہیں پائی ہے۔ اس کے غم نے تو سارے گھر کو غم کے سمندر میں ڈبو دیا مگر میرے ابا نے اور چھوٹے بھائی نے حالات سے سمجھوتہ کر کے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے مگر ماں کے زخم مندمل زخموں کو ٹھیک نہیں ہو سکے۔ اس کے زخم آج بھی ہرے ہیں۔ کیونکہ وہ جب بھی کبھی کسی سے بات کرتی ہے تو پہلے ایک لمبی آہ بھرتی ہے اور بھائی کا تذکرہ کرتی ہے اور تب بات آگے بڑھاتی ہے۔ میں نے اپنی ماں کو بہت کم ہنستے دیکھا۔ وہ کسی سے شکایت بھی نہیں کرتی ہے۔ ہمیشہ اللہ کا شکر کرتی ہے۔ ابا جان کی کمر تو بیٹے کے غم نے توڑ دی تھی مگر اپنی انا کو برقرار رکھنے کے لئے وہ کسی کی نہیں سنتے ہیں۔ گھر میں سب سے پہلے جب میں نے اپنی ماں سے تمہارے بارے میں کہا تو میری لاغر ماں نے کہا ''بیٹا یہ تمہاری مرضی ہے'' تجھ کو زندگی گزارنی ہے۔ میں تمہاری مرضی کے خلاف نہیں جاؤں گی۔ تم جو چاہو وہی ہوگا اور جب ابو جان نے سُنا تو وہ آگ بگولا ہو گئے۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ ابا جان دراصل نہیں چاہتے تھے کہ میں گاؤں کی کسی سیدھی سادھی بھولی بھالی لڑکی سے شادی کروں۔ اس لئے اس نے میری مرضی پر اختلاف جتایا۔

آخر کار کچھ اختلافات کے باوجود میری مرضی اور خوشی کا خیال کرتے ہوئے سب نے میرے حق میں حامی بھری اور تم سے شادی ہو گئی۔ جب میری شادی تم سے ہو گئی تو مجھے لگا کہ میری کائنات مجھے مل گئی اور یہ بھی لگا کہ میرا جیسا خوش نصیب شاید ہی اس دنیا میں کوئی ہوگا۔ جسے زیادہ کشمکش نہ کرنا پڑی ہو اور وہ سب کچھ مل گیا ہو جو وہ چاہتا ہو۔

میں یہ سب کچھ سوال وجواب کئے بغیر سنتی رہی۔ کیونکہ آج اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ وہ اندر سے شاید رو بھی رہا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لئے رک گیا۔ میں نے اسے جھنجھوڑا اور پھر اس نے بات آگے بڑھائی بعد میں جب تم یہاں ہمارے گھر میں دلہن بن کر آئی اور تم

نے اپنے رنگ دکھانا شروع کئے تو میں نے سوچا شاید ابو جان ہی تھے۔ مگر بعد میں، میں نے حالات سے سمجھوتہ کیا۔ میں نے ماں کو سمجھایا۔ میں نے سوچا تھا کہ تم نوکری کا تقاضا نہیں کروگی۔ فیشن سے دور اطاعت پسند بن جاؤں گی تو میں آج اپنے آپ کو واقعی اور صحیح معنوں میں خوش نصیب سمجھتا ہوں اور مجھے تمہیں کام کرتے ہوئے دیکھنا بہت اچھا لگا اسی لئے میں تمہیں گھور رہا تھا۔

اور ہاں تم مجھے بار بار کیوں دیکھتی تھی۔ انور اگر تمہاری بات ختم ہوئی ہو تو میں اپنی کہانی شروع کروں۔ وہ چونک گیا اور اپنی بات کاٹ کے بولنے لگا۔ ہاں ہاں بولو مگر کوئی ایسی بات خدارا نہیں کرنا جسے میرا دل ٹوٹ جائے۔ نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مگر ایک بات ضرور ہے۔ میں گاؤں کی سیدھی سادھی لڑکی نہیں تھی۔ میں بھی ایک الھڑ قسم کی شرارتی لڑکی تھی۔ میں بھی چاہتی تھی کہ میں کسی شہری بابو سے شادی کرونگی۔ میں نے بھی جب تمہیں کالج میں پہلی بار دیکھا تھا۔ میرے دل میں خیال آیا اگر یہ لڑکا مجھ سے شادی کرے گا تو میں شہر کی بہو بنوگی اور میرے جتنے بھی ارمان ہیں وہ پورے ہو جائیں گے۔ میں بھی فیشن کرنا چاہتی تھی۔ شہری لڑکیوں کی طرح سر پر ڈوپٹہ نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ گھر کا کام کاج نہیں کرنا چاہتی تھی غرض ہر قسم کی آزادی چاہتی تھی۔ اِسی لئے میں نے کالج کے زمانے میں کسی اور لڑکے کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ کالج کے آخری سال میں جب تم نے مجھ سے اظہارِ محبت کیا تو میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ میں جھومنے لگی۔ خوشی سے اندر اندر ہی پاگل ہونے لگی اور مجھے بھی ہاں کرنے میں بقراریاں بڑھ گئی۔ تم سے ملنے کی آس نے کبھی آرام سے سونے نہ دیا تمہارا پیغام ملتے ہی ہمارے گھر میں بھی سکتہ طاری ہو گیا۔ گھر والوں نے یہاں تک کہا کہ یہ لڑکی ہمارا منہ کالا کر کے آئی ہے۔ مگر میں نے ماں کو صاف صاف بتایا کہ بات ایسی نہیں ہے اور یہ بھی کہا کہ اگر تم لوگ میری شادی وہاں نہیں کرنا چاہتے ہو تو مت کرو۔ مگر یہ منہ کالا کرنے والی بات بھی مت کرو۔ میرے نفی میں بات کرنے سے ان کو لگا کہ یہ پیار ہے اور یہ پیار قربانی چاہتا ہے۔ تب جا کے میرے ابو امی نے آپسی مفاہمت کر

کے اور میری خوشی کا مان خیال رکھ کے تمہارے پیغام کا جواب ہاں میں دیا اور اس طرح میری شادی تم سے ہوئی۔

میں بھی کچھ دیر تک خاموش ہوئی اور انور نے پھر کیا ہوا کہہ کر مجھے اور بولنے کے لئے اُکسا دیا۔ پھر کیا۔ جب میں اس گھر میں آئی اور میں نے دیکھا جو میں چاہتی ہوں وہ سب یہاں ممکن نہیں ہے۔ نہ نوکری ہے اور نہ نوکرانی ہے۔ نہ فیشن ہے اور نہ فیشنبل لوگ یہ حالات کے مارے ہیں زمانے کے ستائے ہیں، غمگین اور افسردہ ہیں۔ ان کو بہو کی نہیں بیٹی کی ضرورت ہے اور پھر بہت کچھ جانتے ہوئے بھی میں نے اپنے ارمانوں کا گلا گھونٹ دیا اور تمہارے رنگ میں رنگ گئی اور آج اپنے خوش حال گھر کو خوش دیکھ کر خود خوشی محسوس کر رہی ہوں۔

............☆☆☆............

طالب کشمیری

نام :آئی۔ کے۔کول

قلمی نام :طالب کشمیری

تاریخِ پیدائش :۱۰ نومبر ۱۹۴۸ء محلّہ باغ سندر بالا، چھتہ بل

تعلیم :پی۔ایچ۔ڈی (اُردو)

پیشہ :ریٹائیرڈ سرکاری ملازم

تصنیف :شناختِ گل ''افسانوی مجموعہ'' (۲۰۰۹)

پتہ :73-71 امر کالونی، گول گجرال روڈ،
تالاب تلّو جموں ۱۸۰۰۰۲

فون نمبر 9419119591

☆......طالب کشمیری

قسمت

محلے کی مسجد میں اذان اختتام پذیر بھی ہوئی لیکن نقطۂ انجماد سے پانچ درجہ کم حرارت اور کڑاکے کی ٹھنڈی کی وجہ سے آج صبح سویرے پانچ بجے تک کوئی بھی شخص گھر سے نکل کر فجر کی نماز ادا کرنے نہیں آیا۔ مسجدِ شریف کے وسیع ہال کے اندر ایک کونے میں بستر پر دراز سردی سے ٹھٹھرتے اور بیماری سے بے حال اکبر حسین نے اپنی پینسٹھ سال کی زندگی کے اس مقام پر جب اس کا کوئی اپنا قریب نہ تھا، خدا کی بارگاہ میں سر بہ سجود ہونے کی تمنا کی۔ لیکن نہ تو اس کی ٹانگوں میں اتنی سکت تھی، نہ جسم میں جان اور نہ آنکھوں میں اتنی بینائی۔ اوپر سے خون کو منجمد کرنے والی سردی۔ وہ اپنی اس آرزو کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بالکل بے بس پڑا رہا۔ اس نے لیٹے لیٹے ہی کھانستے ہوئے دھیرے سے پھٹی پرانی رضائی سر سے اوپر اوڑھ لی اور تقریباً نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا رہا۔ اُدھر موذن مولوی نظام الدین نے اکیلے اکیلے ہی نماز ادا کی اور خداوند تعالیٰ سے دعائے خیر کے واسطے دونوں ہاتھ اٹھائے...... ''یا اللہ اپنے بندوں پر رحم کر......، یا اللہ تمام بیماروں اور ناتوانوں کو صحت یاب کر......وغیرہ''۔

اکبر حسین کو اپنی مرحومہ بہن فاطمہ کی یاد آئی اوز بردست علیل ہونے کے باوجود وہ ماضی کے دھندھلکوں میں کھو سا گیا...... کاش وہ آج زندہ ہوتی...... کس طرح سے وہ دل لگا کر خدا کی عبادت کرتی تھی......

''اے میرے خدا اپنے بندوں پر رحم کر......اے میرے اللہ دنیا کے تمام بیماروں

اور ناتوانوں کو ہر قسم کے امراض سے نجات دلا کر انہیں صحت یاب کر......، اے میرے مولا تمام غریب، لاچار و مفلس لوگوں کو دولت سے مالا مال کر......، اے میرے پروردگار جو لوگ رزق کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتے پھرتے رہتے ہیں ان پر اپنی نعمتوں کے سارے دروازے کھول دے......، اے میرے مشکل کُشا جو لوگ مصیبتوں کے سمندر میں غوطے کھا رہے ہوں انہیں اپنی عنایتوں کے طفیل ان کی منزل سے ہمکنار کر......'' فاطمہ نہ جانے کتنی دیر اور دونوں ہاتھ اُٹھا کر نماز ادا کر کے خدا سے دعائے خیر مانگتی رہتی اگر اس روز اکبر بیچ میں ہی ''آمین......آمین......'' کہتے ہوئے اس عمل میں خلل انداز نہ ہوا ہوتا۔ فاطمہ مسندِ نماز کو تہہ کرتے ہوئے اپنے بھائی کی اس کے کمرے میں بے وقت آمد اور اس کے طنزیہ انداز میں بولی، ''کیوں اکبر کیا ہوا......نماز بھی ٹھیک طرح سے پڑھنے نہیں دیتے ہو تم''۔

''ارے میری پیاری ہمشیرہ، کچھ دیر کے واسطے اللہ میاں کو اکیلا بھی چھوڑا کرو...... اسے بھی تو آرام کی ضرورت ہوتی ہوگی،'' اکبر نے اسے چڑاتے ہوئے کہا۔

''تمہارا یہ اندازِ بیان کبھی نہیں بدلے گا، بھلے ہی تم اب ساٹھ برس کے ہو گئے ہو......اسی لئے تیس پینتیس سال قبل میں نے تجھ سے کہا تھا کہ شادی کر لو...... بیوی ہوگی، بال بچے ہوں گے تو تجھے جینے کا سلیقہ خود بخود آ جائے گا۔ لیکن تیرے ہاتھ میں بیاہ کی لکیر ہی موجود نہ تھی۔ دو ایک جگہ جہاں تمہارے بیاہ کی بات چلی تھی تم کسی نہ کسی بہانے سے ٹالتے گئے اور نتیجہ تمہارے سامنے ہے......نہ تم گھر کے رہے نہ گھاٹ کے۔ یہ تو چلو جب تک میں زندہ ہوں تب تک میرے گھر میں میرے بچوں کے ساتھ اپنی من مانیاں کرتے پھرتے رہتے ہو......دیکھ لینا جب میں مر جاؤں گی تو یہ لوگ تمہارے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ پھر میری قبر پہ آ کر آنسو نہ بہانا......'' اور اسی کے ساتھ فاطمہ کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ پڑے۔

''ارے میری پیاری بہنا......تم آنسو کیوں بہا رہی ہو۔ میری قسمت میں جو کچھ لکھا تھا سو ہو گیا، تم کیوں پچھتا رہی ہو،'' اکبر نے کہا۔

''اکبر اگر تدبیر کرنے پر بھی انسان کو کچھ حاصل نہ ہو جائے تو اسے تقدیر کی کرنی

کہتے ہیں۔ کھانے کی تھالی میں سے بھی آدمی کو اپنے ہی ہاتھ سے لقمہ اُٹھا کر منہ میں ڈالنا پڑتا ہے۔ تھالی سامنے ہو کر بھی آدمی حرکت ہی نہ کرے اور صرف قسمت کو کوسنے بیٹھے تو اسے کیا کہیں گے۔ بتیس سال بیت جانے کے باوجود مجھے اب بھی وہ دن یاد ہے جب منیرا کے والد غلام مصطفےٰ نے اپنی بیٹی کے لئے تمہارے رشتے کے لئے ہاں کہہ دی تھی، لیکن ایک تم تھے کہ یہ کہہ کر اس تجویز کو یکسر مسترد کیا کہ دونوں باپ بیٹی تمہارے مکان کو ہڑپنا چاہتے ہیں۔ مصطفےٰ کا چونکہ منیرا کے سوا اور کوئی اپنا نہ تھا اس لئے اس نے اپنی چاند جیسی اکلوتی بیٹی کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دینے کی رضامندی ظاہر کی تھی۔ اس معمولی شرط پر کہ شادی کے بعد وہ دونوں باپ بیٹی تمہارے ہی گھر میں آ کر رہیں گے...... تو اس میں کون سی ایسی بات تھی جسے ناجائز کہا جا سکتا ہے۔ کیا بیٹی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے والد یا والدہ عمر کے اواخر میں اس کی خدمت کرے اور اس وقت مصطفےٰ خود اپنے ہاتھوں سے کماتا بھی تھا۔ تم لوگ اکٹھے رہ کر آسانی سے گزارہ کر سکتے تھے، لیکن خدا جانے تمہاری عقل پر کون سا پردہ پڑا تھا۔ دیکھ لو اب وہی منیرا کس شان و شوکت سے اپنے بچوں کے ساتھ زندگی کے دن کاٹ رہی ہے،" فاطمہ دکھ بھرے لہجے میں بولی۔

"او فاطمہ بہن، یہ کیا صبح صبح لے کے بیٹھی تم۔ دیکھو میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ آج کل کے زمانے می پیسے کی قیمت ہے اور پیسے کے بل بوتے پر سب کچھ خریدا جا سکتا ہے...... جس کے پاس پیسہ ہوتا ہے اسی کی پرستش کرتے ہیں لوگ۔ یہی نظریہ ذہن میں رکھ کر میں نے شادی کرنے میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی اور دوسری بات یہ کہ میں شادی کر کے کسی عورت کا غلام بن کر نہیں رہنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ بیاہ کر کے کسی شخص کی بیوی ضرورت کے وقت اس کے کام آئے گی اور اس کی خدمت کرے گی۔ کیونکہ اس کا تھوڑے ہی کسی کے ساتھ خون کا رشتہ ہوتا ہے۔ اسے بہتر یہ نہیں ہے کہ پیسے کی کشش سے ہی سہی، کوئی نہ کوئی شخص اس کی خدمت کرنے پر آمادہ ہو جائے،" اکبر نے اپنے منطقی نظریئے سے کہا۔

’’دیکھو اکبر، مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تمہیں انسانی رشتوں اور ان سے منسلک حساس جذبات کی رتی بھر بھی واقفیت نہیں ہے۔ پیار کے رشتوں کو پیسوں سے تولا نہیں جا سکتا...... یہ وہ بندھن ہیں جو آپسی اشتراک، تعاون اور جذبۂ ایثار پر مبنی ہوتے ہیں۔ محبت میں انسان سب کچھ ٹھکرا سکتا ہے اور اپنے ساتھی کی خوشی کے واسطے جان تک قربان کر سکتا ہے۔ لیکن وہ تو تب ہے نا جب کوئی کسی کو جانے پہچانے، اسے پیار کرے اور دل سے اس کے اندرونی جذبات محسوس کرنے کی کوشش کرے...... پر تم جیسے شخص کے لئے پیسہ ہی سب کچھ ہے‘‘، فاطمہ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

’’تو اس سب کے لئے شادی وغیرہ کا جھنجھٹ سر پہ لینا ضروری ہے کیا؟ میں نہیں ایسا سمجھتا...... یہ سب فرسودہ باتیں ہیں جن کی حالیہ دور میں کوئی وقعت نہیں۔ مغربی ممالک میں بال بچے تو کیا، شوہر اور بیوی بھی ایک دوسریب کو چھوڑ کر خوش حال زندگی بسر کرتے ہیں‘‘، اکبر نے کہا۔

’’مجھے وہاں کے بارے میں زیادہ معلوم نہیں لیکن اتنا ضرور سنا ہے اور ٹی۔ وی پر دیکھا بھی ہے کہ ڈھلتی عمر کے ساتھ ساتھ وہاں بھی شوہر اور بیوی ایک دوسرے کی دیکھ بال کرتے ہیں اور بیماری کے ایام میں اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ جس شخص کے ساتھ انہوں نے زندگی کے چار دن گزارے ہوں اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ بھلے ہی جوانی کے دنوں میں انہوں نے کسی اور کے ساتھ عیش و عشرت کے چند لمحے گزارے ہوں۔ پھر بھی میں بتا دوں جس پہلو کی طرف تم نے اشارہ کیا، ہمارے معاشرے میں وہ مقام ابھی نہیں آیا ہے۔ ہمارا اپنا سماج ہے، اپنا رہن سہن ہے، اپنے اصول و اقدار ہیں اور ہمیں ان ہی میں جینا اور مرنا ہے۔ ہماری سوچ میں اتنی تبدیلی یا یوں کہو اتنا تنزل نہیں ہوا ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کو بیماری کی حالت میں کنارہ کشی اختیار کر کے اپنے حال پر چھوڑ دیں۔ تم نے تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ کس طرح انتقال کرنے سے قبل میں نے تمہارے بہنوئی آصف صاحب کی پورے دو سال تک جی جان سے خدمت کی، جب وہ بستر پر

پڑے رہے تھے۔ میرے حساب سے ہر رشتے کی بنیاد اس بات پر منحصر ہے کہ انسان دوسرے شخص کے آڑے وقت کام آئے، اس کی ہر ممکن مدد کرے، اس کے ساتھ ہمدردی کرے، دکھوں میں اس کا ساتھ دے کر اس کا بوجھ کسی حد تک ہلکا کر دے اور اس ضمن میں عورت اور مرد کا ازدواجی رشتہ زبردست اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن افسوس تم نے ان باتوں کو کبھی سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی اور اپنی ساری زندگی اپنے اُس منحوس ٹرنک اور بینک کھاتوں میں جمع رقوم دیکھ دیکھ کر خوش ہونے میں ہی گزار دی،'' فاطمہ نے جو جی میں آیا کہہ ڈالا۔

''ارے فاطمہ بہن چھوڑ و یہ اپنی فلسفانہ باتیں۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے...... اس کی رفتار اتنی تیز ہوگئی ہے کہ یہ سارے فلسفے اپنی افادیت کھو چکے ہیں۔ پیسہ دیکھ کے بڑوں بڑوں کے پیر ڈگمگا جاتے ہیں اور وہ کچھ بھی کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ اس لئے اس سلسلے میں تم میری فکر کرنا ترک کردو...... جو قسمت میں لکھا ہوگا وہ ہو کے رہے گا،'' اکبر یہ کہہ کر تو چل دیا، لیکن بہن کے لئے اس کے غیر شادی شدہ ادھیڑ عمر کے بھائی کے مستقبل کے بارے میں تشویش نہ کرنا کیا ممکن ہے اور وہ بھی تب جب ایسا بھائی ہر لحاظ سے نکما و تند مزاج ہو اور بات بات پر جھگڑا کرنا جس کی عادت بن چکی ہو۔

پینتالیس برس قبل جب فاطمہ کا بیاہ آصف سے ہوا تھا اس وقت اکبر کی عمر پندرہ برس کی تھی۔ بچپن سے ہی چھاتی کی کمزوری اور قوتِ بصارت کی کمی کے باعث اس نے میٹرک کا امتحان بڑی مشکل سے پاس کیا تھا اور پھر آصف کی زبردست دوڑ دھوپ کے بعد اسے فلڈ کنٹرول محکمے میں مستریوں کی نگرانی کے لئے میٹ کی معمولی نوکری ملی تھی جہاں اسے اس کی تنخواہ کے علاوہ تھوڑی بہت اوپر کی آمدن بھی تھی۔ لیکن اکبر جتنا پیسے جمع کرنے میں تیز تھا اس سے کہیں زیادہ پیسے خرچ کرنے میں سُست۔ جوتا جب تک مکمل طور پھٹ نہ جاتا اور پیر کا پنجہ دکھائی نہ دیتا تب تک بدلتا ہی نہ تھا...... کپڑے جب تک چیتھڑوں میں تبدیل نہ ہوتے تب تک نئے لانے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا...... عینک میں اتنی خراشیں کہ کئی بار مفت کا اخبار الٹا رکھ کے پڑھنے لگتا تھا۔ بخار آئے تو دوائی والے کو کہانیاں سنا سنا کر اس

سے ایک دوٹکیاں مفت حاصل کرنے میں وہ کوئی عیب نہیں سمجھتا تھا۔ ایک بار جب فاطمہ نے اسے تازہ پھل کھانے کی صلاح دی تو کہہ بیٹھا، ''کیسی باتیں کرتی ہو بہن، یہ چیزیں تو بیمار لوگ کھاتے ہیں اور میں تو ابھی ہٹا کٹا ہوں خدا کی مہربانی سے،'' اور اسی دن جب اس کے بھانجے ندیم نے ڈیڑھ درجن سنگترے لائے تو اکبر ماموں نے دس منٹ میں تین عدد چٹ کر دیئے۔ جیب سے پیسے خرچ کر کے بس یا آٹو رکشا وغیرہ میں سفر کرنے کو وہ ٹانگوں اور جوڑوں کی بیماری سے تعبیر کرتا تھا اور اگر مفت میں کوئی سواری ملتی تو اس کا بھر پور فائدہ اٹھانا وہ اپنی دانشمندی تصور کرتا تھا۔ اس کے والدین نے اپنی حیثیت کے مطابق گھریلو اخراجات پورے کرنے میں کبھی کوئی پس و پیش نہیں دکھائی تھی، اسی لئے فاطمہ بھی حیران تھی کہ اکبر کے خون میں یہ کنجوسی کہاں سے آئی تھی۔

لیکن ان سبھی خامیوں کے باوجود اکبر حسین کی شخصیت کا ایک مثبت پہلو بھی تھا اور وہ یہ کہ گھر میں چاہے اس کا برتاؤ کتنا ہی روکھا کیوں نہ ہو گھر سے باہر وہ لوگوں کے ساتھ خوب گھل مل جاتا تھا...... ہاتھ کی لکیریں پڑھ پڑھ کر پیشگوئیاں بھی کرتا رہتا تھا، چاہے غلط ہی سہی مستورات کے ساتھ کبھی کبھار ہلکے پھلکے مذاق بھی کر لیتا تھا۔ کسی دعوت میں مدعو کیا گیا ہو یا نہیں اکبر صاحب ضرور حاضر ہو کر ضیافتوں کا بھر پور لطف اُٹھاتا تھا اور جان پہچان ہو یا نہیں کسی کے جنازے میں شرکت کرنے ضرور پہنچ ...... یعنی عوام رابطے میں وہ اپنی مثال آپ تھا۔ ایک بار جب فاطمہ نے اسے کہا کہ شام کو تھوڑا جلدی گھر آجایا کرو تو فوراً جواب دے بیٹھا، ''تم فکر نہ کرو...... کبھی کسی اندھے کو گاڑی کے نیچے آتے سنا ہے تم نے؟'' اور وہ بیچاری چُپ ہو گئی، لیکن ایک دن وہ سچ مچ موٹر سائیکل کی زد میں آ ہی گیا اور تین مہینے تک فاطمہ اور اس کے بیٹوں، بہوؤں کو اس کی خدمت کرنا پڑی۔ پندرہ برس قبل ان کی بیوہ والدہ کے فوت ہو جانے پر فاطمہ اکبر کو لائی تھی۔ لیکن بات بات پر غیر ضروری مباحثوں میں الجھنا، اپنے بھانجوں کو کوسنا، ان کی بیویوں پر اُٹھتے بیٹھتے تیکھے طعنے کسنا اور ان کے والدین کے بارے میں برا بھلا کہنا، ان کے بچوں کو خفیف سی باتوں پر تنگ کرنا، اپنے ذاتی مہمانوں کی

زبردستی آؤ بھگت کروانا، گھر میں روزانہ پکائی جانے والی سبزیوں کے معیار پر فضول کی تنقید کرنا وہزار قسم کے نخرے کرنا اور سب سے اہم یہ کہ اپنی جیب میں سے اپنے کھانے پینے کے واسطے پھوٹی کوڑی بھی نہ دینا...... اس سب کو لے کر گھر کے امن وچین کو آگ لگ گئی اور آئے دن قسم قسم کے ہنگامے بپا ہونے لگے۔ اسی دوران فاطمہ کے شوہر پر فالج کا دورہ پڑا اور دو سال کی طویل بیماری کے بعد وہ رحلت فرما گئے۔ فاطمہ کے شانوں پر اور زیادہ بوجھ آ گیا اور اب وہ اپنی تکالیف کا تذکرہ کرتی بھی تو کس سے...... اس کا راز دار ہی جو چلا گیا تھا اور بھائی ایسا جو غیر تو غیر اپنی سگی بہن اور بھانجوں پر بھی بھروسہ نہیں کرتا تھا۔ خیر باقی دو بیٹوں لطیف اور شفیق کی بھی جیسے تیسے شادی ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی شکایتوں کے مراحلے بھی طویل ہوتے گئے۔ آخر کار وہ دن آ ہی گیا جب ندیم اور جمیل روز روز کی چک چک سے تنگ آ کر گھر سے اخراج کر گئے اور کرائے کے مکان میں سکونت اختیار کی۔ تیسرا بیٹا لطف بھی اپنے اہل وعیال کے ساتھ اسی مکان میں علاحدہ رہنے لگا۔ صرف سب سے کم عمر بیٹا شفیق ہی اپنی نو بیاہتا دلہن شہناز سمیت اپنی والدہ و اکبر ماموں کے ساتھ رہنے لگا۔ بیچاری فاطمہ اس عمر میں یہ ساری ذلتیں برداشت نہ کر سکی اور ایک روز وہ خدا کو پیاری ہو گئی۔ اب اکبر صاحب کو دیکھ بال کی ذمہ واری سو فیصد شفیق اور اس کی گھر والی پر آن پڑی۔

چند مہینے بعد شفیق کی بیوی کا بچہ ہو گیا اور اب اس کا بیشتر وقت بچے کو سنبھالنے میں لگ جاتا تھا جس کی وجہ سے وہ کئی مرتبہ شفیق اور اکبر ماموں کی ضرورتوں کا خیال نہیں رکھ پا تی۔ میاں بیوی کے درمیان اکثر تکرار ہونے لگی اور اکبر صاحب اس جھگڑے کی آگ کو جہاں اور جب موقعہ ملتا ہوا دیتا رہا جس کا اثر براہ راست بچے کی پرورش پر پڑنے لگا۔ معاملہ شہناز کے والدین تک جا پہنچا اور بالآخر مجبور ہو کر فتنے کی جڑ اکبر حسین کو گھر سے نکلنے کے لئے کہا گیا۔ پھر بھی اسے اپنی غلطی کا احساس نہیں ہوا اور مبہم الفاظ میں روپئے پیسے کا لالچ دے کر شفیق کو اپنے اس فیصلے پر عمل درآمد نہ کرنے کی چالاک کوشش کی جو اس نے یہ کہہ کر ٹھکرا دی،

"ماموں جان ہمیں معاف کر دیجئے ہمیں آپ کے پیسے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمیں بس

سکون کی زندگی چاہیئے اور کچھ نہیں"۔ اس پر وہ تلملا گیا اور اپنی جنت نصیب بہن اور اس بچوں کی اس کے تیئں بیس برس کی خدمات کو یکسر بھول کر انہیں برا بھلا کہتے ہوئے وہاں سے رخصت ہوا اور اپنے آبائی محلے کی مسجد شریف میں پناہ لی کیونکہ اس نے اپنا پشتینی مکان کب کا فروخت کر کے وہ رقم بھی اپنے بینک کھاتوں میں جمع کروالی تھی اور ان سے متعلق تمام کاغذات، وغیرہ اپنے ٹرنک میں مقفل کر کے رکھے تھے جس کی حفاظت کرنا اپنی زندگی کا واحد مقصد سمجھتا تھا۔ مسجد شریف میں پناہ لے کر وہ حمامی کی مدد کرتا تھا جو کام بھی اسے مشکل سے ہی ہو پاتا تھا۔ محلے کے کئی دین دار اشخاص محض انسانیت کے ناطے اسے گھر پر کھانے کے لئے بلاتے یا ادھر ہی اس کے لئے کھانا بھیجا کرتے تھے۔

کل رات نمازِ اعشاء کے اختتام پر سبھی لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے تو اکبر حسبِ معمول سخت کمزوری کے باوجود اگلے دن حمام کے واسطے لکڑیاں سٹور سے لانے گیا اور واپسی پر وہ دھڑام سے گر پڑا۔ ساری لکڑیاں بکھر گئیں اور اس کے سینے میں زبردست درد محسوس ہونے لگا اور اسے قے بھی آگئی۔ وہ بڑی مشکل سے رینگتا ہوا بستر کے قیرب پہنچا اور رات بھر زبردست ٹھنڈ سے کپکپایا اور درد سے تڑپتا رہا۔ لاچار نگاہوں سے وہ کبھی ایک نظر سرہانے کے ملحق اس ٹرنک کی جانب دوڑاتا جس میں اس کی عمر بھر کی کمائی تھی اور کبھی دوسری نظر اپنی ان ٹانگوں کی جانب جن کی تمام قوت اب مفقود ہو چکی تھی۔ لڑکھڑاتی زبان سے اس نے اپنی قسمت کو کوسا..... "یہ یہ یہ یا اللہ..... کہ کہ کاش میں.....ااا اپنی.....قہ قہ قہ قسمت کے.....سہ سہ سہ سہارے نہ رہتا.....، ہہ ہہ ہہ ہو سکتا ہے.....مہ مہ مہ میرا.....بھی کہ کہ کہ کوئی اپنا.....قہ قہ قہ قریب ہوتا.....قہ قہ قر.....۔"

جب موذن مولوی نظام الدین نماز ادا کرنے کے بعد جانے لگے تو اکبر کو ابھی تک بستر پر ہی پڑے دیکھا تو وہ اس کے پاس آیا اور اس کی نبض محسوس کی.....پھر وہ پُر اسرار ٹرنک کی جانب متوجہ ہو گیا بعد میں محلے کے کئی اور لوگ مسجد میں آئے.....کو سوتا ہوا پا کر محمد امین نے پکارا، "ارے اکبر میاں اب تو جاگ جاؤ.....یہ دیکھو دن تو کب کا نکل آیا

ہے۔ دوسری جانب سے جب کوئی جواب نہ ملا تو امین صاحب نے اس کے چہرے سے رضائی ہٹالی اور اس کے بدن کو چھولیا جو برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا تھا اور سارا جسم اکڑ گیا تھا۔ کسی کو بھی کچھ معلوم نہ تھا کہ یہ سب کیسے ہوا۔ سٹور کے باہر بکھری لکڑیوں اور جمی ہوئی قے سے قیاس لگالیا گیا کہ کیا ہوا ہوگا۔

دو سال بعد مولوی نظام الدین نے اپنا پرانا گھر فروخت کیا اور شہر کے بالائی علاقے میں دس لاکھ روپئے سے ایک عالیشان مکان خرید لیا۔

............☆☆☆............

اقبال نازش

نام :محمد اقبال

قلمی نام :اقبال نازش

تاریخ پیدائش :۱۱؍جولائی ۱۹۵۳

تعلیم :بی۔اے،ایل۔ایل۔بی

پتہ مسلم ایجوکیشنل ٹرسٹ تھنہ منڈی راجوری 185212

فون نمبر 8803527089

☆......اقبال نازش

اَدھ کھلی کھڑکی

جب سے وہ مجھے ناامیدی کی بوسیدہ چھت پر لٹکا کر گیا ہے، میری حسرتوں کے ریتیلے مینار بتدریج ہواؤں میں تحلیل ہو کر سورج کی نحیف کرنوں کو پامال کرتے جارہے ہیں اور میں..........

سورج کی آغوش سے پھٹتی ہوئی آگ کا الاؤ ساری کائنات میں پھیل چکا تھا۔ سارے کے سارے لوگ جس اور گھٹن سے بچنے کے لئے اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل آئے تھے لیکن اندر اور باہر کا ایک جیسا ماحول سبھی لوگوں کو کسی اژدھے کی طرح ڈس رہا تھا۔ گلی کوچوں میں ایک بار پھر ہنگامہ خیز لمحوں کو آباد کیا گیا تھا۔ ہر ایک شخص اپنی ہتھیلیوں پر اپنا سر لئے بھاگ رہا تھا۔ دوستی، بھائی چارہ، مذہبی اور خونی رشتے بے سروساماں اور بے نشاں منزلوں کی طرف بکھر رہے تھے۔ انسانیت کا دور سنگ وخشت میں تحلیل گمنام غاروں میں چھپ رہا تھا۔ احساس کی سبھی بیل بوٹیاں نامرادی کی چھت سے آویزاں قیامت خیز ہوتی جارہی تھیں۔ ہر طرف آگ تھی، الاؤ تھا، دھواں تھا۔

رات کے پہلو میں روشنی کا خنجر چبھوتے ہی مجھے کوئی جگا کر چلا گیا ہے۔ دُور دور تک ایک ہنگامہ ہے۔ ایک افراتفری کا عالم ہے اور میں.......... میں کہ بس ساکت وجامد ایک نقطے کی طرح اپنی ادھ کھلی کھڑکی میں بیٹھا ہوں جیسے.......... میرے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے ہیں۔ لگتا ہے صدیوں سے اس کھڑکی کے ساتھ چپکا ہوا ہوں اور نہ جانے کب تک.......... ہاں.......... یہ تو میں ہوں.......... میں

بہت سارے لوگوں کے نقش اپنے پھیکے رنگوں سمیت اپنی ہی کھڑکی کے ساتھ وابستہ ہیں جن کے چہروں پر ماضی کی ہزار ہاپُر اسرار داستانیں اپنا اپنا راگ الاپ رہی ہیں۔دراصل اہم بات تو یہ ہے کہ اس ادھ کھلی کھڑکی کے عین وسط میں ایک بہتی ہوئی گونگی سڑک ہے جس کی چھاتی پر ہزاروں لاشیں رینگتی رہتی ہیں اور پھر اس کے پہلو میں اس کا بھی تو گھر ہے جس کے در و دیوار اُس کے شب و روز میں ابھرتے ڈوبتے رہتے ہیں۔ جس کی شہنائیوں کے اژدھے ہر وقت پھنکارتے رہتے ہیں۔ جہاں ہر وقت فلک شگاف سناٹوں کا ہجوم رہتا ہے۔ جس کی منڈھیر سے یاس و نامرادی کے اشتہار ہر وقت آویزاں رہتے ہیں لیکن......... اور ہاں جہاں لمحہ لمحہ بے نام سسکیوں کا ماتم رہتا ہے۔ اُسی کا تو یہ گھر ہے......... یہ بوسیدہ گھر......... جس کے ادھے کھلے دروازے کے پیچھے اس کی چھ کنواری لڑکیوں کی ایک لمبی قطار ہے اور ایک نیم پاگل بیوی ہے۔ جس کی دیواروں کے پتھر آہستہ آہستہ پگھل رہے ہیں اور جہاں سرگوشیاں دم توڑ رہی ہیں۔

حسبِ عادت آج بھی میں اپنی کھڑکی میں بیٹھ کر اپنے والدین کو پھر پریشان کرنے کی ضد میں ہوں۔ ادھ کھلی کھڑکی میرے اور میرے ابا کے درمیان ایک دیوار بنتی جا رہی ہے۔ ایک طرف میری ضِد اور دوسری طرف ابا کی شفقت ریل کی دو پٹریوں کی طرح ہوتے جا رہے ہیں۔ ہر روز اپنے ابا سے اس بات پر اسرار کرتا ہوں۔ بھلا کھڑکی میں بیٹھنے سے کیا بگڑتا ہے۔ سبھی لوگ تو اپنی اپنی کھڑکیوں میں بیٹھتے ہیں اور بھلا پھر یہ بھی تو ایک کھڑکی ہے۔ ہاں ادھ کھلی تو رہتی ہے۔ یہ پرانی بوسیدہ کھڑکی......... ابا میری ایسی باتوں پر پتھرا جاتے۔ اُن کے ہونٹوں پر ہزاروں مدوجذر ابھرنے ڈوبنے لگتے اور دیر دیر تک نہ جانے کیسے کیسے طوفان میں بہہ جاتے ہیں۔ ابا کا سرخ چہرہ یک لخت بے بسی کے اندھے جزیرے میں ڈوب جاتا۔ ابا کی ایسی بے بسی پر مجھے کبھی کبھی رحم بھی آتا لیکن میری آنکھوں میں ادھ کھلی کھڑکی کا منظر جیسے ٹھہر جاتا میں واپس اپنے موڑ پر کھڑا ہو جاتا۔ رات کی سیاہی میں اک اشتہار کی طرح اس کھڑکی کے ساتھ چپک جاتا۔ سڑک کے باہر کا سنسان ماحول میری فکر کو

اپنے نوکیلے پنجوں میں دبوچ لیتا۔ سڑک پر اوندھے منہ پڑی لاشوں کے اونگھنے کی دل خراش آوازیں میرے اندر بھی حرص وہوس کی آگ کو ہوا دیتی رہتی جانے یہ لوگ...... یہ سارے لوگ اپنے پرائے لوگ.......... جو اپنی اپنی قبروں سے نکل کر رات کی سیاہی میں اپنے آپ کے تحلیل کرتے ہیں۔ پوری کی پوری سڑک بھر جاتی ہے اور پھر یہ قافلہ میری طرف اُمڈ آتا ہے۔ کچھ خوفناک آوازیں میرے کانوں کو خراشنے لگتی ہیں۔ بھلا یہ کون ہیں......

کئی دنوں سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ شام ہوتے ہی میں بگل مار کر ادھ کھلی کھڑکی میں بیٹھ جاتا ہوں۔ بس ایک ہی جیسا منظر میری آنکھوں میں بس جاتا ہے۔ لیکن ....اب تو اس کا چہرہ بھی اس پُر ہجوم سڑک پہ اُگ آیا ہے۔

ابا اکثر میرے قریب اس ادھ کھلی کھڑکی میں بیٹھ کر مجھے سہلانے کی کوشش کرتے۔ انہیں معلوم تھا اور جبھی تو انہوں نے میری آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسوؤں کے قطرے بھی دیکھ لئے تھے۔ ''ابا کھڑکی کا دوسرا پٹ بھی کھول دو'' کھڑکی کا دوسرا پٹ جو بہت پہلے سے بند پڑا ہے اور ہاں اگر یہ کھل گیا تو........

کچھ دنوں سے اس گھر کا بگڑتا ماحول میرے احساس کی رگوں میں زہر گھولتا جا رہا ہے۔ بھوک اور پیاس کی سلگتی ہوئی برفیلی آگ میں انسانیت کے نامراد جسم جل رہے تھے اور ہاں...... ہاں...... ماضی کے سبھی رسم و رواج جو اِس گھر سے وابستہ تھے بے بسی کی دلدل میں یکے بعد دیگرے دھنستے چلے جا رہے تھے۔ اب تو سارا سلسلہ بدل گیا تھا۔ پرانے اقدار نئے رنگوں کی آمیزش سے اپنی ہیئت کھو چکے تھے۔

سورج پوری آب و تاب کے ساتھ اس گھر میں داخل ہو چکا تھا اور........... میری آنکھوں نے کل شام ہوتے ہیں ایک شخص کو دیکھ لیا تھا۔ دراز قد...... پورے چہرے پر اگی ہوئی بے ترتیب داڑھی، آنکھوں سے رستا ہوا لہو اور پھر چند لمحوں کے ڈوبتے ہی ساری کائنات کانپ اٹھی تھی۔ انسانیت، سادگی اور اصول پرستی کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ لگا تھا۔ چند کراہنے کی آوازیں فضاؤں میں تحلیل ہونے لگی تھیں۔ اب باقاعدہ اس گھر سے دھواں اگ رہا

تھا۔اب تو ان کے گھر کا سارا ماحول بدل چکا تھا۔دھواں اس کے گھر میں آباد ہوا تھا اور یہی دھواں......اس دھویں کے چند مرغولے میری ادھ کھلی کھڑکی کی طرف بڑھ رہے تھے۔

اسے تو مرے ہوئے چند دن گزرے تھے۔وہ بڑا محنتی اور ایماندار شخص تھا۔اس کی اپنی ایک دنیا تھی۔کچھ ہی دنوں کے بعد......اس کے گھر سے......اس کی قبر سے......اس کے اردگرد سے دھواں پوری کائنات میں پھیلنے لگا تھا۔

آج میری آنکھ بڑی دیر کے بعد کھلی ہے۔دھواں ابھی تک میری طرف بڑھ رہا ہے۔میری ادھ کھلی کھڑکی کا کیا ہوگا......میری ادھ کھلی کھڑکی..........

...........☆☆☆...........

شیخ بشیر احمد

نام : شیخ بشیر احمد

تاریخ پیدائش : ۹ / مارچ ۱۹۵۰ء سرینگر کشمیر

پیشہ : ریٹائیرڈ سرکاری ملازم

تصنیف : بند مٹھی سے بھاگا پرندہ (افسانوی مجموعہ)

پتہ : ٹینگہ پورہ نواب بازار سرینگر کشمیر

فون نمبر 9858989900

❖

☆......شیخ بشیر احمد

سیندور کی لکیر

مورتی بنانے کا آرڈر آصف علی نے چند دن پہلے لے رکھا تھا۔ پچھلے دو دن سے لگاتار اس پر کام کرتا رہا۔ اب کام لگ بھگ مکمل ہونے کو تھا۔ البتہ جو تھوڑا سا کام ادھورا رہ گیا تھا، آج اُسے پورا کرنے کا ارادہ کر ہی لیا تھا۔

مگر زبیدہ کے پیٹ میں بے اختیار اینٹھن اٹھنے لگی۔ وہ شدتِ درد و کرب سے بے حال ہو رہی تھی۔

جونہی کوئی مروڑ اُٹھتا وہ بے اختیار چیخ پڑتی۔ سارا معاملہ گڑبڑ ہو گیا۔ ساتھ ہی ایک اچھا خاصا موڈ بھی خراب ہو گیا۔

''اب پہلے کسے نپٹا لوں؟''......اگر چہ زبیدہ کے اندر ایک اضطراب تھا جو کسی پل اُسے قرار نہیں لینے دیتا۔ مگر وہ بڑی متانت سے آصف علی کا ہاتھ دبا کر بولی۔

''گھبرانے کی بات نہیں۔ کیونکہ پہلے پہل ایسا ہی ہوتا ہے۔''

''مگر مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' آصف علی نے گھبراتے ہوئے کہا۔

''اتنی فکر ہے تو فوراً دایہ سلیمہ کو بلاؤ''

یہ سن کر وہ دوڑتے دوڑتے دایہ سلیمہ کے پاؤں پڑنے اور منت سماجت کرنے لگا۔

سلیمہ کسی نازک جھکی شاخ کی طرح نرم پڑ گئی اور اس کے ہمراہ آنے پر تیار ہوئی۔

دائی سلیمہ مزاج کی بڑی تیز تھی مگر جب دیر پا یا پیچیدہ مسئلہ کھڑا ہوتے دیکھتی تو فوراً دوڑ کے چلی آتی۔

چونکہ یہ علاقہ شہر سے کافی دُور تھا اور سہولیات سے محروم رہ گیا تھا۔ بستی کے آس پاس کوئی ڈسپنسری موجود نہ تھی اور نہ ہی کوئی معقول اِنتظام تھا۔ لہٰذا پرانے رسم و رواج اور تشخیص کے مطابق وعلاج معالجہ تھا۔ اس معاملے میں کئی معزز اور ماہر عورتوں میں سے دایہ سلیمہ ہی واحد وہ عورت تھی جو ایسا کام انجام دے سکتی تھی۔

زبیدہ بستر پر دراز درد زہ میں مبتلا تھی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں موتیوں جیسے چمک رہی تھیں اور دل کی دھڑکنیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں۔ ایک عجیب سی بے چینی اُسے مسلسل ہو رہی تھی آنکھیں نم ہوگئیں تھیں اور اُسے کسی پل چین وسکون نصیب نہیں ہو رہا تھا پھر جیسے ہی پیٹ میں بے اختیار درد اٹھتا تو بے حال ہو کر کراہنے لگتی اور اس کے منہ سے دبی دبی ہلکی ہلکی سی چیخیں نکل جاتیں۔

وہ سِسک سِسک کر دائی سلیمہ کے بازو پر سر رکھ کر سوالیہ نگاہوں سے دیکھا کرتی۔ اپنے آپ سے بڑ بڑاتی رہتی۔ کبھی خود کو بُرا بھلا کہنے لگتی۔ کبھی الٹے سیدھے لہجے میں بے تکی باتیں اور الٹی سیدھی حرکتیں کرتی رہتی۔

پھر کچھ ایسا ہوا کہ اچانک کوئی خیال اس کے ذہن میں بجلی کی طرح کوندا اور رگ وپے میں اُتر گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک طرح کی چمک پیدا ہوگئی۔ ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ چند لمحوں میں ایک ہفتہ پیچھے چلی گئی جب اُس نے خواب میں کسی بزرگ کے سامنے آصف علی کو دوزانوں بیٹھے اس کے کندھوں پر ایک کبوتر منڈلاتے ہوئے دیکھا تھا۔

ابھی اس واقعہ کو زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا۔ جب اُس بزرگ نے اس بار بیٹا ہونے کی بشارت دی تھی۔ یہ سوچتے سوچتے اس کے اندر ایک عجیب طاقت کا احساس ہونے لگا تھا اور اس نے یہ سب برداشت کرنے کا تہیہ کرلیا۔

سرہانے بیٹھی دایہ سلیمہ حیران و پریشان تھی اور کوئی جواب دے نہیں پا رہی تھی۔ سوائے اسکو پھلوں کا رس پلادیتی یا متلی آجانے پر اسکی پیٹھ پر ہاتھ پھیر لیتی اور کبھی کبھی

میٹھی میٹھی باتوں سے تسلی دیتی تو کبھی ہنسنے ہنسانے کی طرف مایل کرنے کی کوشش کرتی رہتی۔

سارا گھر اداسی کی پرتوں میں لپٹا ہوا تھا۔ دُور بیٹھا کمرے کے ایک کونے میں آصف علی سر نہوڑے کسی سوچ میں ڈوبا تھا۔ سامنے اسٹو (stove) پر کیتلی کے اندر پانی اُبل رہا تھا۔

''یونہی کب تک بیٹھے رہو گے۔ ذرا کچھ لاج شرم کر۔ بے شرم کہیں کے۔ کوئی کام دام نہیں رہا ہے۔''؟

''دفعتاً دائی سلیمہ کے ذہن میں کون سا خیال آیا۔ جھٹک کر آصف علی کو کمرے سے باہر نکلنے کے لئے کہا۔

بے چارہ! آصف علی سیدھا سادہ آدمی تھا۔ شریف النفس اور بہت محنتی تھا۔ اپنی بیوی کے قریب رہنا زیادہ چاہتا تھا۔ شرم وحیا سے اس کے کانوں کی لویں سرخ ہو گئیں اور وہ وہاں سے اُٹھ کر فوراً چلا گیا۔

بچپن سے ہی آصف علی کھیتوں کی منڈیروں پر یا چنار کے درخت کی چھاؤں میں مٹی کے کھلونے بنانے کا شوقین تھا۔ آس پاس کوئی درسگاہ یا مکتب نہ تھا اور نہ ہی پڑھنے پڑھانے کا کوئی معقول ذریعہ تھا۔ بچے زیادہ تر صبح سے شام تک بھیڑ بکریاں اور مویشی چراتے تھے اور بالغ عمر کے لوگ اپنے آبائی پیشے سے منسلک ہو کر اپنی روزی روٹی کما لیتے تھے۔

اُس نے ہوش سنبھالتے ہی پہلے سنگ تراشی کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ بعد ازاں مورتیاں بنانے کی طرف راغب ہو گیا۔ بچپن کی عادت اور شرارت ابھی چھوٹی نہ تھی۔ گھر کے اندر ایک کمرے کو کارخانہ کی شکل دے دی۔ فرصت کے لمحات میں وہاں چھوٹے چھوٹے پتھروں کے کھلونے اور مورتیاں بنانا شروع کر دی تھیں۔

زندگی ایک تماشہ ہے......

آصف علی کی زندگی میں جس چیز کی کمی رہ گئی تھی وہ بھی اللہ میاں نے ایک پری کی صورت میں عطا کی تھی۔ وہ کشمیری دیہاتی الھڑ دوشیزہ تھی۔ ماہتابی چہرہ بادامی آنکھیں اور

سیب کے قاشوں کی طرح سُرخ ہونٹ تھے۔

حسنِ اتفاق سے ایک دن اس نے ایسی حسین وجمیل مورتی بنائی کہ جسے ایک بار کوئی دل پھینک عاشق مزاج دیکھ لیتا تو وہ منہ مانگی قیمت دینے پر راضی ہو جاتا۔ خوشی میں زبیدہ کو پاس بلا کر سر پر اپنی میلی کچیلی سی ٹوپی کی نوک سیدھی کر کے بڑے مفکرانہ انداز میں بولا۔

''ادھر آؤ زبیدہ بیگم! دیکھو کیسی خوبصورت مورتی بنائی ہے میں نے''...... اُس نے اپنی پھٹی پرانی قمیض کے آستین سے مورتی کو صاف کر کے اس کی طرف بڑھا دی۔

''واقعی لاجواب ہے یہ۔'' وہ داد دیئے بغیر نہ رہ سکی۔

''ارے پگلی! تیری جان کی قسم، میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ کریم بخش ضرور خرید لے گا''

''کیا وہاں وہی ایک دکاندار رہ گیا ہے اور بھی کسی کو دکھانا۔''

فرطِ مسرّت سے مورتی کو اپنے مہندی سے رنگے نازک ہاتھوں میں لے کر زبیدہ جھومنے لگی۔

''انمول گڑیا۔ پری جیسی لگتی ہے۔''

''بالکل تمہاری جیسی ہے نا۔'' یہ کہتے ہوئے آصف علی اس کے ماتھے پر اپنی محبتیں ثبت کرنے لگا۔ مارے خوشی کے اُس کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ آخر اپنی ٹوپی کو سر سے اتار کر ہوا میں اچھالتے کوئی کشمیری گیت گاتے ہوئے کمرے سے نکل پڑا۔

اُس دن آصف علی بے حد مُسرور تھا۔ صبح اٹھ کر پہلے مورتی کو کاغذ کے پلندے میں ملفوف کیا۔ اس کا دل مورتی کو بیچنے کے لئے مچل رہا تھا۔ اس نے گھر پر ہی بلیوارڈ کے ایک جانے پہچانے دکاندار کے پاس جانے کا ارادہ کر لیا جو وقتاً فوقتاً اس کے بنائے ہوئے پرندوں کے مجسمے اور مورتیاں خرید لیا کرتا تھا۔

جلدی جلدی سے ناشتہ کر کے وہ اُجلے دھلے کپڑے پہن کر شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ شہر آ کر بلیوارڈ سڑک پر کہیں جا رہا تھا، کسی سوچ میں گم تھا کہ اچانک سامنے سے آ رہے

ایک غیر ملکی سیاح سے جاٹکرایا۔ یہ تو قسمت اچھی تھی کہ گرنے سے بال بال بچ گیا۔ مگر بغل میں دبائی ہوئی مورتی چھوٹ کر دوُر سڑک پر جا گری۔

سیاح خفیف سا ہو گیا۔ آگے چند قدم آگے بڑھا اور پھر بند پیکٹ سڑک سے اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''سوری! چوٹ تو نہیں آئی۔؟'' ...... پھر اسی انداز میں ''تھینگ گارڈ'' جھٹ سے بول پڑا۔

''اوہنہ!'' ...... یہ کہہ کر آصف علی نے لمحہ بھر اس کی طرف دیکھا۔ مورتی کا خیال آتے ہی اخبار کا تہہ کھول دیا اور اچھی طرح سے دیکھا پرکھا۔ مطمئن ہو کر وہ خوشی سے اچھل پڑا۔

سیاح حیران حیران سی نگاہوں سے چمکتی مورتی دیکھتا رہ گیا اور اس کی کاریگری کے آگے ہوش کھو بیٹھا۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھرتے ہوئے ایک دم بولا۔ ''کیا دام مانگتا ہے۔ جتنا مانگتا' میں دینے کو تیار ہوں'' ...... اس نے بنا چھوئے اپنی دلی کیفیت کا اظہار کیا۔

آصف علی حیرت سے اس کا منہ تکتا رہ گیا۔ اُسے یقین نہیں آرہا تھا' کہ چشم زدن میں چمکتا ہوا سورج جیسے اس کے ہاتھ میں آ گیا ہو۔ یہ تو اس کی فنکارانہ مہارت کا کرشمہ تھا۔ اس کی محنت کا صلہ اور کچھ قسمت کا کھیل بھی ......

اُس نے آسمان کی جانب نظریں اٹھائیں اور دل ہی دل میں خدا کی عظمت بیان کرنے لگا۔ اتنے میں دُور کسی مقامی مسجد شریف سے اذان کی گونج سنائی دی۔

''پانچ ہزار!'' ...... وہ بے ساختہ جیسے چیخ پڑا اور لفافہ بند پیکٹ سیاح کی طرف بڑھا دیا۔

وہ بار بار اپنا ہاتھ مورتی پر پھیرتا رہا اور داد بھی دیتا رہا۔ جیسے کوئی بچہ من پسند کھلونا ملنے پر خوش ہوتا ہے۔ اُس سے رہا نہ گیا۔ خوش ہو کر اپنی زبان میں بولا۔

How a genious artist you are !
Wonderful---- I like it.

آصف علی اس کی بات سُن کر جیسے سناٹے میں آ گیا۔ تھوڑی دیر تک کسی ہونق کی

طرح گھور کر دیکھتا رہا۔ بچارا! غیر ملکی زبان سے نابلد تھا۔ ان پڑھ اور گنوار بھی۔ وہ اس کی زبان سمجھ نہیں پا رہا تھا اور تذبذب کا شکار ہوا۔

چند لمحوں تک من ہی من میں اپنی حماقت پر پچھتا تا رہا اور اپنے آپ کو کوستا رہا۔

جبکہ سیاح ایک نظر آصف علی اور ایک نظر مورتی پر ڈالتا تو جیسے اُسے دُنیا کا آٹھواں عجوبہ ہاتھ لگا ہو۔

سیاح نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے بٹوہ نکالا اور ہزار کے پانچ نوٹ اس کے ہاتھوں میں تھما دیئے۔

آصف علی ہکا بکا دیکھتا رہ گیا۔ اس کے اندر خوشی کا فوارہ پھوٹ پڑا اور سوچنے لگا" کہیں وہ کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے۔"؟

آصف علی اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا یہاں تک کہ وہ آنکھوں سے اُوجھل ہو گیا۔

دیکھتے دیکھتے آصف علی کی قسمت جاگ اٹھی تھی۔ بلیوارڈ کے دکاندار حلقوں میں بات مشہور ہو گئی کہ آصف علی نے ایک پتھر کی مورتی پانچ ہزار میں فروخت کر دی ہے۔ جب یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تو اس کے پاس آنگن میں برسات آرڈر آنے شروع ہو گئے۔ قدرت کا کرشمہ یہ ہوا کہ اُسے بہت دنوں کی غریبی، تنگدستی، مفلسی اور بے چینی سے نجات ملی۔ اُدھر اس کے اندر کوئی چُھپا ہوا فنکار جاگ اٹھا ادھر دُور دُور تک اس کی کاری گری کا ڈنکا بجا۔ اُس نے ایک سے مورتیاں بنانا شروع کیں۔ قدرت نے اس کے ہاتھوں میں ایسا جادُو بھر دیا کہ لوگ حیرت سے دانتوں تلے انگلیاں دبانے پر مجبور ہو گئے۔

اس طرح جیسے تیسے گھر کا پہیہ چلتا رہا۔ مگر جاڑے کے موسم میں چھت سے بارش کے قطروں کا ٹپکنا بند نہ ہوا۔ برسوں سے اس کی مرمت ہو نہ سکی اور یہ خلش اس کے سوہانِ روح بنی رہی۔

چند دن پہلے کی بات ہے شہر کے ایک رئیس تاجر کمل رائے اس کے پاس ملنے کیلئے آئے انہوں نے اپنی بیٹی کے جنم دن پر نادر مورتی بنانے کی خواہش ظاہر کی۔ سارا

معاملہ طے پایا البتہ آصف علی نے ایک ہفتہ کی مہلت مانگی۔

پچھلے کئی دنوں سے وہ اس قدر کام میں منہمک رہا جیسے اس کے سر پر بھوت سوار ہو گیا تھا اور پھر پورا ہفتہ یوں چٹکی بجاتے گزر گیا کہ اب آخری دن رہ گیا تھا۔

وہ زبیدہ کو وہیں اپنے حال پر چھوڑ کر اپنے کارخانے میں آ گیا اور پھر دیر تک کھڑا سامنے مورتی کے سراپا کا جائزہ لیتا رہا۔ جوں جوں ایک ایک پل گزرتا رہا اس کے دماغ میں طوفان اٹھ رہا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس آزمائش کی گھڑی میں اس کی زندگی داؤ پر لگ چکی تھی اور اُسے کچھ سُوجھتا نہیں تھا۔

مورتی کی آنکھیں اس کو ایسے تکتی جا رہی تھیں جیسے اچانک مورتی کے وجود میں روح حلول کر گئی ہو، ہونٹوں پر جیسے مسکراہٹ رقصاں تھی۔ بس حیرانگی کی بات یہ تھی کہ ماتھے پر سیندور لگانے کی لکیر کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ جسے بنانے اور تراشنے کیلئے آصف علی کافی متفکر تھا اور اس سبب سے کام اُدھورا پڑا تھا یا یوں سمجھو کہ اس وجہ سے مورتی ادھوری سی لگ رہی تھی جس کے بغیر وہ کوئی بیوہ سی لگتی تھی۔

کمرے کے ایک بڑے میز پر چھوٹے بڑے پتھر کے بہت سے بے ترتیب ٹکڑوں کے علاوہ چند آہنی آلات جن میں دو الگ الگ سائز کے ہتھوڑے اور ایک چھینی بھی تھی۔ ایک رنگدار مارک لگانے کا ڈبہ بھی تھا۔ اُن سب چیزوں سے الگ تھلگ سامنے مورتی درمیانی حصہ پر رکھی تھی۔

آصف علی نے ہاتھ میں چاک کا ایک ٹکڑا اٹھایا۔ اس کے نوک دار سرے سے ٹھیک ماتھے کے درمیانی حصہ پر ٹکیہ جیسا لگا دیا۔ پھر ایک پتلی سی لکیر ماتھے سے اوپر کھوپڑی کے پیچھے کھینچ لی جو سر کے بالوں کو دو مساوی حصوں میں تقسیم کر رہی تھی اور یوں دیکھتے ہی سندور لگا دینے کی جگہ ظاہر ہو رہی تھی۔ جگہ کا تعین کر کے ایک ہاتھ میں ہتھوڑا اور دوسرے میں چھینی کی مدد سے تراشنے میں مشغول ہو گیا۔

ابھی وہ کام سے فارغ ہوا تھا کہ دوسرے کمرے سے زبیدہ کے کراہنے کی آواز

سنائی دینے لگی۔ آواز اتنی اونچی تھی جیسے اس کے دماغ پر کوئی زُور زُور سے ہتھوڑا مار رہا ہو۔ چند لمحے ایسے گزرے کہ اس نے اپنے ہاتھ روک کران کی باتیں سننے کی کوشش کی جو دائی سلیمہ اور زبیدہ کے درمیان ہو رہی تھی۔

''بیٹی! صبر سے کام لے۔ اس نازک میں گھڑی میں عورت کو درد سہنا ہی پڑتا ہے ورنہ کیسے وہ دیوی یا ماں کا رتبہ حاصل کر سکتی ہے''۔

''کیا اس کے بغیر ایک عورت ماں کا درجہ پا نہیں سکتی ہے؟''

''یہ تو قدرت کا نظام ہے کہ بانجھ عورت کو بھی ماں کی صف میں کھڑا دیکھ سکتی ہو۔''

دیکھنے میں وہ مورتی پر ہتھوڑا چلا رہا تھا لیکن اصل میں زبیدہ کے خیالوں میں گم تھا۔ اُسے اُن کی فلسفی باتوں سے کوئی سروکار یا دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی نظریں نئے مہمان کو دیکھنے کی منتظر تھیں اور سماعت ننھی معصوم سی چیخ کے لئے بے قرار......

کچھ لمحے ایسے گزرے پھر ایک خاموشی چھائی رہی۔ جیسے سمندر مدوجزر پیدا ہونے سے پہلے بے سدھ دکھائی دیتا ہے۔

آصف علی ضربوں پر ضربیں لگا رہا تھا۔ اس کا عمل پانی پر چابک مارنا جیسے تھا۔ باوجود کوشش کے سیندور کی لکیر صاف طور پر نمایاں نہیں ہو رہی تھی۔ کہیں نہ کہیں ایک سیدھ میں ہونے کی بجائے مڑتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

پھر جب اس کمرے میں خاموشی کو چیرتے ہوئے کسی نوزائیدہ بچہ کی پہلی چیخ سنائی دی جو چند ساعتوں کے بعد خود بخود بند ہو گئی اور دیر تک وہاں موت جیسا سناٹا چھا گیا۔ آصف علی کو ہوش نہ رہا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک سیاہ پھیل گیا اور ہتھوڑا بے تحاشہ ماتھے کے اس حصے پر اس زُور سے پڑا کہ پیشانی کا اگلا حصہ جہاں ٹیکے کا نشان تھا اکھڑ کر نیچے زمین پر آ گرا۔

............☆☆☆............

زنفر کھوکھر

نام	:زنفر کھوکھر
تاریخِ پیدائش	:۱۹/دسمبر ۱۹۵۷ء
تعلیم	:ایم۔اے (اردو)، بی۔ایڈ
پیشہ	:درس وتدریس
افسانوی مجموعہ	:(۱) خوابوں کے اس پار (۱۹۹۹)
	(۲) کانچ کی سلاخ (۲۰۰۴)
	(۳) عبرت (۲۰۱۰)
پتہ	:ساج، تھنہ منڈی، راجوری 185212
فون نمبر	9858009983

☆......زنفر کھوکھر

دو حکمران

خود کو بیوہ اور بے سہارا بتلا کر اس نے مدد کے لئے ہاتھ پھیلا دئے۔ وہ شکل و صورت سے تو جنت کی حور تھی مگر حالات سے بدحال۔

''کہاں کی رہنے والی ہو؟''

''کیوں کر اور کب سے بیوہ اور بے سہارا ہو؟'' ایسے سوالوں کے جواب میں اِس کی زبان گنگ اور آنکھیں دُور دُور تک ویران اور خشک تھیں۔

آخر بے حد اصرار کے بعد وہ تھکی تھکی سی آواز میں کچھ یوں گویا ہوئی۔

''میں ہوں رہنے والی اُس سلطنت کی، جس میں اکثریت ہے بیواؤں اور یتیم بچوں کی، جس کے حاکم ہیں دو۔ ایک کی حکومت چلتی ہے دِن کے اُجالے میں اور دُوسرے کی رات کے اندھیرے میں۔ دفاتر، مجلسیں اور عدالتیں لگتی ہیں دِن کو بھی اور رات کو بھی۔ لین دین، کاروبار اور دیگر معاملات طے پاتے ہیں دِن کو بھی اور رات کو بھی۔ مگر اِس سب کے باوجود سلطنت دِن دُگنی اور رات چوگنی اِنتشار کا شکار ہے اور بدحالی کی طرف گامزن ہے۔

ایک اندازے کے مطابق دو حکمرانوں والی اِس سلطنت کے اَسّی فیصد سے زائد باشندے مالی، جسمانی اور ذہنی طور پر بدحال، اپاہج اور مُفلس ہو چکے ہیں۔

تاریخ میں یہ واحد سلطنت ہے جس کے دو حکمران ہیں۔ اِن دو حکمرانوں سے پہلے تک اِس سلطنت کا حاکم ایک ہی بادشاہ ہوتا تھا اور یہی سلطنت جنتِ بے نظیر کہلایا کرتی تھی مگر بادشاہ سے ایک باپ ہونے کے ناتے انجانے میں ایک بھول ہوئی۔ اُس کے دو

جڑواں بیٹے تھے مگر اُس نے اپنے جیتے جی دونوں میں سے کسی کو بھی بادشاہت کے لئے منتخب نہیں کیا۔ اُس کا خیال تھا کہ اپنے اِنتقال سے کچھ پہلے وہ اپنے ایک بیٹے کو بادشاہت سونپ دے گا۔

مگر ہوا یوں کہ بادشاہ اچانک وفات پا گیا۔ دستور کے مطابق تو بڑے بیٹے کو بادشاہ بننا تھا مگر وہ دونوں جڑواں تھے اور بادشاہت حاصل کرنے کے لئے دونوں میں جنگ اور زور آزمائی شروع ہوگئی۔ مگر ایک جیتا نہ دوسرا ہارا۔ آخر من مانی کرتے ہوئے ایک حاکم دن مقرر ہو گیا اور دوسرا حاکمِ شب۔

دو حکمرانوں والی اِس سلطنت کے باشندگان میں سگے بھائی ایسے تھے جن کے درمیان کئی برسوں سے لڑائی' کشیدگی اور تناؤ چلا آرہا تھا۔ لڑائی' کشیدگی اور تناؤ کی موجودہ وجوہات تو کئی تھیں مگر اُن سب وجوہات کے پیچھے اصل وجہ حق وراثت میں ملنے والا سیب کا وہ بڑا باغ تھا جس کا اِن کے بوڑھے باپ نے اپنے جیتے جی بٹوارہ نہیں کیا تھا۔ یہاں بھی ایک باپ کی بھول دونوں بھائیوں کے کام آرہی تھی۔

اکثر باپ وراثت میں اپنی اولادوں کے لئے جاگیر کے ساتھ ساتھ بہت سارے جھگڑے بھی چھوڑ جاتے ہیں۔

اِن دونوں بھائیوں کے باپ کے پاس سیب کے تین باغات تھے جن سے اُسے خاطر خواہ آمدنی ہو جاتی تھی۔ ایک ایک باغ تو اُس نے اپنے دونوں بیٹوں کے حوالے کیا مگر تیسرا اور بڑا باغ اُس نے اپنے پاس ہی رکھا۔ اِس خیال اور فکر سے کہ اگر وہ خالی ہو گیا تو اُس کے بیٹے اُس کی بڑھاپے میں عزت اور اچھی دیکھ بھال نہیں کریں گے۔ اگر بڑا باغ اس کے پاس رہا تو دونوں بیٹے بڑھاپے میں اُس کی خوب خاطر مدارت کرتے رہیں گے اور پھر مرنے سے کچھ ایام قبل وہ بڑا باغ بھی اپنے دونوں بیٹوں میں برابر بانٹ دے گا۔ مگر ہوا یوں کہ اُن کا بوڑھا باپ بیمار ہوا اور باغ کا بٹوارہ کئے بغیر ایک دِن اچانک مر گیا۔ باپ کے مرنے کے بعد بڑے باغ کے بٹوارے کو لے کر دونوں بھائیوں میں جھگڑا اچل پڑا۔

ایک بھائی نے بزورِ بازو اس بات کو بنیاد بنا کر بڑے باغ پر اپنا قبضہ جمالیا کہ مرنے سے قبل باپ اُس کے ساتھ اُسی کے گھر میں رہ رہا تھا۔ لہٰذا وہ بڑے باغ کا تنہا مالک ہے۔

یوں بڑے باغ کے بٹوارے کو لے کر سال ہا سال کی کشیدگی اور تناؤ سے تنگ آکر ایک بھائی نے حاکم شب کی عدالت میں اپنا مقدمہ پیش کر دیا۔ ردِعمل کے طور پر دُوسرے نے حاکمِ دن کی عدالت میں اپنا دفاعی مقدمہ پیش کر دیا۔

دو حکمرانوں والی اِس سلطنت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اِس کا عدالتی نظام بڑا ہی تیز ہے۔ یہاں دیگر سلطنتوں کی طرح عدالتی معاملات برسوں پر محیط نہیں ہوتے ہیں بلکہ فوری کارروائی ہوتی ہے۔ دونوں ہی حکمران ایک دوسرے پر سبقت لے جانے اور ایک دُوسرے کو نیچا دِکھانے کی کوشش میں عوامی معاملات اور جھگڑوں کا فوری طور پر نپٹارہ کرتے ہیں۔

حقِ وراثت کو لے کر دونوں بھائیوں کے درمیان چل رہے جھگڑے کا فیصلہ یوں ہوا کہ یکے بعد دیگرے دونوں حکمرانوں نے اپنے اپنے مدعی کے حق میں فیصلہ کیا اور مجرم کے حصّے میں ڈالی موت۔

فرق صرف اِتنا ہوا کہ ایک کو دِن کے اُجالے میں موت ملی اور دُوسرے کو رات کی تاریکی میں۔ یوں بیواؤں کے اکثریت والی اِس سلطنت میں دو اور بیواؤں کا بہ یک وقت اِضافہ ہوا۔ اُن ہی میں سے ایک میں ہوں۔ میری مدد کیجیے۔"

یہ کہتے ہوئے اُس نے ہاتھ پھیلا دیئے۔

............☆☆☆............

ڈاکٹر نکہت نظر

نام	:ڈاکٹر نکہت سعید قریشی
قلمی نام	:نکہت فاروق نظر
تاریخِ پیدائش	:
تعلیم	:پی۔ایچ۔ڈی،بی۔ایڈ
پیشہ	:کالج لیکچرار
تصنیف	:قہر نیلے آسمان کا (افسانوی مجموعہ)
پتہ	:لال بازار سرینگر
فون نمبر	9419138115

❖

☆......نکہت نظر

آدھے ادھورے لوگ

یہ تب کی بات ہے، جب بستی میں آگ لگی ہوئی تھی۔ دہکتے شعلوں میں انسانی چیخیں بلند ہو رہی تھیں...... ظلم کی دست درازیاں امن و آشتی کی چتائیں جلانے میں مصروف تھیں...... لاشوں کے ڈھیر پر دہشت کے راکھشش ناچ رہے تھے...... لرزتی قدروں کی سانسوں کے چراغ ٹمٹمارہے تھے...... لوگوں کا ایک بڑا ہجوم ہاتھوں میں سفید عَلم لیے پہاڑوں کے حصاروں کو توڑتے ہوئے اُس پار چلے گئے...... وہاں ایک ایسے میدان نے ان کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ جہاں آفتاب سوا نیزے پر اُگتا تھا...... وہ جھلسنے لگے...... پگھلنے لگے...... ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے روزِ محشر ہے اور وہ اپنے اپنے نامۂ اعمال حاصل کرنے کے لیے انتظار میں کھڑے ہیں...... آپا دھاپی کے عالم میں سب کی نظریں اس ٹیلے کی طرف لگی تھیں جس پر سفید بادل کا ٹکڑا منڈلا رہا تھا۔ آفتاب کی تپش سے بادل کا ٹکڑا پگھلنا شروع ہوا اور ٹیلے پر نور کی بوندیں اترنے لگیں۔ ہجوم میں افراتفری بڑھ گئی۔ ٹیلے تک پہنچنے کی کوشش میں لوگ آگے بڑھنے لگے لیکن اگلے ہی پل انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ ان کے شریر کا کوئی نہ کوئی حصّہ الگ ہو چکا ہے۔ وہ اپنے آدھے ادھورے شریر لے کر آگے بڑھتے گئے۔ کٹے ہوئے اعضا کی جگہ سے لہو رسنے لگا...... وہ تڑپنے لگے...... ہجوم میں سے آہ و بکا کی آوازیں بلند ہونے لگیں...... پھر اچانک سوا نیزے پر اُگا آفتاب مغرب کی آغوش میں جا چھپا...... اور وہ رات...... سب نے کھلے آسماں کے سیاہ آنچل تلے ہی گزار دی۔...... صبح پو پھٹنے سے قبل ہی یہ آدھے ادھورے لوگ بھوک کے دیوتا کی پوجا کے لیے چڑھاوے کا

انتظام کرنے نکل پڑے.....ایک عورت رجنی روتی بلکتی اس ٹیلے کی جانب بھاگنے لگی.....لیکن وہاں نہ تو سفید بادل کا ٹکڑا تھا اور نہ ہی بادل کے ٹکڑے سے برستی بوندیں.....بس ٹیلا تھا.....وہ بھی خاموش.....رجنی کو لگا کہ گزرا کل ایک سپنا تھا جو کسی کچے وعدے کی طرح ٹوٹ کر چکنا چور ہو گیا۔ مایوس ہو کر اُس نے اپنے کانوں کو چھوا جہاں سچ اس کی مٹھیوں میں تھا.....لٹکتا ہوا.....ڈیجہ ہور.....اس کے کانوں سے جدا ہو گیا تھا۔ ڈیجہ ہور اس کی زندگی کا ترجمان.....اس کے شریر کا ایک اہم حصہ..... ہلتا ہوا.....حرکت کرتا ہوا.....ڈیجہ ہور.....نہ سپنا تھا اور نہ کوئی کچا وعدہ.....رجنی کو اپنے کانوں سے لہو رستا ہوا محسوس ہونے لگا۔

اس تپتے میدان میں جہاں روز آفتاب سوا نیزے پر اُگتا تھا اور آدھے ادھورے لوگوں کے لیے روزِ محشر کا عذاب لے کر آتا تھا وہاں وقت کے گزرتے انہی آدھے ادھورے لوگوں کی بستی بس گئی۔ سب نے اپنے اپنے غم کو گلے کی گھنٹی بنا کر لٹکائے رکھا، جس کی صدائیں ان کی روح میں اتر جاتیں۔ ان دلدوز صداؤں نے تو ان کے زخموں کو بھرنے ہی نہ دیا۔ اپنے اندر کے زخموں سے زیادہ انہیں شریر کے کٹے ہوئے انگوں کی فکر تھی جو دوبارہ نہ اگ سکے.....لیکن ان سب میں سے رجنی کا دکھ الگ تھا.....ڈیجہ ہور کا غم رجنی کے لیے کسی حادثے سے کم نہ تھا.....اگرچہ یہ حادثہ بیتی یادوں کی صف میں شامل ہو گیا تھا لیکن اکثر رجنی کے کریدتے رہنے سے یہ زخم دھیرے دھیرے ناسور کی شکل اختیار کر رہا تھا۔ اکثر شام کے دھندلکوں کے ساتھ ہی سوچ کا اڑن کھٹولا اسے اُن دہکتے شعلوں کے بیچ لاشوں کے ڈھیر پر لے جاتا جہاں امن و آشتی کی چتائیں جل رہی ہوتیں۔ وہ مسجدوں کے میناروں سے بھی اونچی قدروں کی راکھ میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتی، شاید اس کو ڈیجہ ہور مل جائے۔ اس کی ہتھیلیاں سیاہ ہو جاتیں لیکن ہاتھ کچھ بھی نہ لگتا۔ ڈیجہ ہور کا غم اسے کھائے جا رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کی پہچان ہی گم ہو چکی ہے.....وہ بے چہرگی کے کرب میں مبتلا ہوتی گئی اور لمحہ لمحہ اداسیوں کے پیرہن میں سمٹتی چلی گئی۔ ایک شام ہوا کا جھونکا اس کے خالی کانوں کو چھو کے

گزرا تو ڈیچہ ہور کی یاد آتے ہی اس کی آنکھیں بھر آئیں...... کسی دُھندلے تصور نے اسے بہلایا...... اور جیسے ہی...... شوق نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو رجنی نے بکھری ہوئی ہمت کے ریزے چنتے ہوئے بڑھتا ہوا ہاتھ تھاما اور اپنے ڈیچہ ہور کی تلاش میں نکل پڑی۔

اُداسی میں ڈوبی بستی کا سر سبز و شاداب چہرہ...... بارود کے دھویں سے آلودہ تھا۔ یہاں کی زمین ایک ایسی بدنصیب ماں کی طرح تھی، جس کی اپنی ہی کوکھ اب تک ہزاروں معصوموں کو نگل چکی تھی...... ساتھ ہی اُن ہزاروں نادان بچوں کا دکھ بھی اپنے من میں سمائے بیٹھی تھی جو برسوں پہلے اُسے آگ کی لپٹوں میں چھوڑ کر اپنا منہ پھیر کر چل دیئے تھے۔ ......اب تو بوڑھے آکاش کے قہر سے اس کی آنکھیں جلتا الاؤ ہو چکی تھیں...... پھر رجنی کو ڈیچہ ہور کی تلاش کہاں کہاں نہیں لے گئی...... خستہ مکانوں کے سلگتے ملبے...... گنجان مقبروں میں اُگتی ہوئی ڈری سہمی سی کونپلیں...... مسجدوں کے اونچے میناروں کی بے بسی...... مندروں کے گھنٹوں کی خاموشی...... درگاہوں کے گنبدوں کی اداسی...... چناروں کے سلگتے سائے...... شنکر آچاریہ کا آہنی عزم...... ڈل جھیل پر جمی اداسی کی کائی...... کھیر بھوانی کے بجھے ہوئے سینکڑوں دیئے...... سب کے سب خاموش نگاہوں سے رجنی کے خالی کانوں کو تکے جا رہے تھے...... رجنی اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگی۔ اسے تپتے میدان کی یاد آئی۔ جہاں ہر روز آفتاب سوا نیزے پر اُگتا تھا اور آدھے ادھورے لوگ جلتے بھی تھے اور پگھلتے بھی...... اگلے ہی پل رجنی کی حیرت میں اضافہ ہوا...... بستی سے دور کچھ لوگ دو دھاری تلواروں...... اور کچھ...... آگ کی لپٹوں میں چلنے کے کرشمے دکھا رہے تھے۔ رجنی آگے بڑھتی گئی...... شاید ان لوگوں میں سے کوئی ڈیچہ ہور کے بارے میں کچھ جانتا ہو۔ لیکن یہ لوگ تو گونگے تھے...... رجنی ان کے اشاروں کی زبان سمجھ نہ پائی...... وہ بھاگنے لگی...... ہاری پربت کی طرف...... ماں شارکا دیوی سے ڈیچہ ہور کی خبر پوچھنے...... شاید رجنی کے خالی کانوں کو دیکھ کر دیوی جلال میں آجائے...... لیکن نہیں...... تھکی ہاری رجنی کے پہنچنے پر ماں شارکا دیوی چپ تھی...... اس کی آنکھیں بند تھیں اور...... لال چُنر کے رنگ رجنی ہاری پربت

کے ایک ایک پتھر کے نیچے اپنے ڈیچہ ہور کو ڈھونڈتی رہی، یہاں تک کہ اس کی انگلیاں گھس گئیں اور آنکھیں پتھرا گئیں......لیکن ڈیچہ ہور نہ ملا......شاید اس کو آسماں کھا گیا تھا یا پھر زمین نگل چکی تھی......رجنی ایک دن......اپنا آدھا ادھورا شریر لے کر ہاری پربت سے نیچے اتری اور مخدوم صاحب کی زیارت کے نچلے زینے پر بیٹھ گئی۔ آج بھی اس کی پتھرائی آنکھیں ہاری پربت کے پتھروں کو چیرتی ہوئی ماں شارکا سے یہی سوال پوچھ رہی ہیں......میرا ڈیچہ ہور کہاں ہے؟؟

............☆☆☆............

عبدالرشید راہگیر

نام	:عبدالرشید
قلمی نام	:رشید راہگیر
تاریخِ پیدائش	:۱۶رفروری ۱۹۵۳ءبہ مقام لیہہ
تصنیف	:احساس (ناول)
اعزازات	:بیسٹ ٹیچر سٹیٹ ایوارڈ ۲۰۰۷
پتہ	گورنمنٹ سرائے صفا کدل، سرینگر
فون نمبر	9419729731

☆......عبدالرشید راہگیر

کفّارہ

معمول کی طرح رات کے گیارہ بجے برقی روشنیوں کے گُل ہوتے ہی پاور انجن کی گڑگڑاہٹ خاموش ہوئی تو رات کی قیامت خیز تاریکی نے وحشت ڈھا کر لیہہ شہر کے کون ومکان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ گھروں کے دَر و دریچے بند ہوتے چلے گئے۔ شہر کے اکلوتے ڈیلائٹ سینما کے تماش بین بھی ٹارچوں کی روشنیوں میں رستہ ٹٹولتے اپنے گھروں کو نکل بھاگے۔ آن کی آن میں نشیب و فراز، گلی، گلیارے، میدان، سڑکیں سنسان پڑ گئیں۔ ہر کوئی خاموش تھا۔ پست نسل کے لمبے بالوں والے لداخی پالتو اور آوارہ کتے اپنے ہی بے ترتیب بالوں میں منہ چھپائے جائے پناہوں میں دبک گئے۔

ہر سُو ہُو کا عالم......اور ہُو کے عالم میں گورستان سے ایک سسکی سناٹے کے بھاری لبادے کو چیر چیر کر اُبھر رہی تھی......شاید سوز و گداز میں ڈوبی اسی سسکی کے سبب تاریکی کے باریک لبادے نے کون ومکان کو ڈھک کر ماتم کدہ بنالیا تھا۔

پہاڑی دامن اور شہر کے بیرونی سڑک کے درمیان واقع وسیع قبرستان کے ایک تاریک کونے میں شمیم دیوانوں کی سی صورت بنائے، خون میں لت پت پھٹے ہوئے لباس کے پھٹے ہوئے آستین پنڈ ولموں کی طرح کہنیوں سے جھلائے، دو مقبروں کے درمیان دوزانو بیٹھے زار و قطار روتے ہوئے بین پر بین کئے جا رہا تھا۔ مقبرے پر ٹکی حسرت و یاس بھری آنکھوں سے گویا جھرنے جاری تھے۔ اس کی آہ وزاری سناٹے کو مسلسل چیر رہی تھی۔

''جمیلہ...... یہ کیسی سزا دی......؟ عمر قید سے بھی دردناک، قیامت سے بھی اذیت ناک، کیسے سہوں میں...... کہاں سے لاؤں اتنی اہمیت؟ اس سزا سے تو موت ہزار درجہ بہتر ہے۔ میں جانتا ہوں۔ میں نے دھوکے سے تمہاری بے داغ زندگی داغدار بنادی تھی۔ لیکن جمیلہ سچ مانو وہ دھوکہ نہیں تھا۔ تجھے اپنے سے جوڑے رکھنے کی سازش تھی۔ نہیں نہیں، کوشش تھی۔ اس لئے کہ میں سچ مچ تجھے دل کی گہرائیوں سے پیار کرتا تھا۔ نہ چاہتا تھا کہ میری غیر موجودگی میں کوئی دوسرا تیری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ لے یا اپنانے کا ارادہ کرلے، کیونکہ میں سچ مچ محاذے سے واپسی پر تمہارے لئے سماج سے تک لینے والا تھا۔ جمی......محاذ پر جانے سے پہلے سماج اور خویش و اقارب کے دباؤ سے خوف اور کم ہمتی مجھ پر، میرے اعصاب پر حاوی ہوکر رہ گئی تھی۔ لیکن اب میں نے محاذ سے لوٹنے کے بعد خوف کی ساری دیواریں اپنے قوتِ ارادی سے گرادی تھیں۔ ہاں جمی......صرف تمہاری خاطر میں نے اتنی جرأت کی تھی۔ صرف تمہارے لئے......''۔

آب رواں کی طرح شمیم کے آنسوں بہتے رہے اور پھر یک لخت اس کا پشیمانی کی آگ میں سلگتا گلا رُندھ گیا۔ وہ تڑپ کر کہنے لگا۔

''افسوس مجھے ہمت جُٹانے میں دیر ہوگئی اور تم نے یہ سزا دے ڈالی......مجھ بد نصیب سے تو تمہارے پہلو میں لیٹا اشرف ہی بھلا......سنا ہے اس نے نازک موقعے پر ڈٹ کر ساتھ دیا۔ تمہاری کوکھ کی عزت بچائی......سماجی گیدڑ بھبکیوں کی پرواہ کئے بغیر تمہارا ہاتھ تھاما......آہ......ایک میں خودغرض تھا۔ سماج سے ٹکرانے کی ہمت نہ ہونے کی باوجود عہد و پیمان کے بل پر تمہاری عزت سے کھیلنے والا......اور ایک یہ......جس نے اپنی عزت تو کیا سارے خاندان کی آبرو تم پر قربان کردی۔ اونچی سوسائٹی کا ہونے کے باوجود تمہاری حقیقی محبت میں قربان ہوگیا۔ آفرین ہے اس مایۂ ناز پر جس کے پہلو میں تم جیسی پری صورت قیامت تک کے لئے سوگئی۔ میری خطا معاف کردو جمی......محاذ جنگ سے زندہ لوٹنا آسان نہیں ہوتا......تم ایک بار سرحد کی جنگ کا سماں دیکھتی، تو شاید کانپ جاتی۔ میری ہمّت اسی

جنگی سماں سے بندھی ہے۔ میں نے ڈٹ کر مقابلہ کر کے دشمن کے دانت کھٹے کئے ہیں۔ اس لئے کہ میری ہمت تمہاری چاہت نے بھی بڑھائی تھی۔ جمی موت کو پچھاڑنے کے بعد یہ سوچ کر لوٹا تھا کہ سماج سے بھی نپٹ لوں گا اور فتح پا کر تجھے دل کی ملکہ بناؤں گا۔ لیکن تم، تم تو مجھے بیچ منجھدار میں چھوڑ کر چلی گئی۔ آخر کیوں......؟ تم کہا کرتی تھی نا کہ انسان پر اپنے قوم کا حق زیادہ ہوتا ہے۔ مجھے بھی اس بات سے انکار نہیں۔ جمی کیا دیش کی حفاظت کرنے سے قوم کا حق ادا نہیں ہوتا؟ اگر ہوتا ہے تو مجھے محاذ پر مصروف پا کر میرا انتظار کیوں نہیں کیا......؟ مجھ سے بے رُخی جتا کر اپنے حسن کا حقدار کسی اور کو کیوں ٹھہرایا مگر ہاں تجھے کہاں معلوم تھا کہ میں کس حال میں ہوں۔ پھر شاید کوکھ کی بڑھتی ہوئی حالت نے مجبور دیا ہوگا۔ ایسا ہی ہوا ہوگا لیکن ایک موقع تو دیا ہوتا۔ میرے لوٹنے تک ذرا سا انتظار تو کیا ہوتا......اور جمی یہ کیا۔ اگر اشرف کینسر کی وجہ سے اپنی موت مرا تھا تو تم نے ڈھیر ساری دوائیاں نگل کر اپنے جان کیوں گنوادی؟ کیا اشرف کے احسان پر اپنی وفا کی مہر ثبت کرنے کے لئے؟ اُف جمی، تم کتنی اچھی ہو۔ تم نے تو جان دے کر نہ صرف اشرف کی قربانی کا بھرم رکھ لیا بلکہ مجھے بھی سماج میں رُسوا ہونے سے بچالیا......لیکن جمی اس ننھی سی جان کا کیا، جو تمہاری کوکھ میں میری نشانی بن کر پلتی رہی......کیا تمہارے ساتھ وہ بھی یہاں......؟ آہ جمی، سوچا تھا تجھے اپنانے کے بعد میری دنیا روشن ہوگی۔ دُکھ سکھ اکٹھے جھیلیں گے، بچے کی قلقاری سے گھر آنگن چہک اٹھے گا۔ لیکن تم نے مجھ سے دامن چھڑا کر میری آرزوں کا گلا گھونٹ ڈالا......آہ اتنی بڑی سزا......خدا کی پناہ......یہ سب میری خطا ہے۔ مجھے معاف کردو جمی۔ میں اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیسے ادا کروں......جمی تم معاف کردو تو شاید خدا بھی بخش دے۔ لیکن تم تو مر چکی ہو اور مرنے والے آواز نہیں دیا کرتے......آواز نہیں آئے گی تو کفارہ کیسے ادا ہوگا؟''

روتے، ہوئے شکوہ کرتے اُس نے سر کو دھیرے سے جمیلہ کی قبر کی اونچی سطح پر رکھ دیا۔ زار زار رونے سے اس کی حالت ابتر ہو چکی تھی۔ تبھی پرانے ٹرانسپورٹ یارڈ میں واقع

شکستہ مکان سے سیاہ برقعے میں لپٹا ایک ہیولا آنچل میں کچھ چھپائے آس پاس کی ٹوہ لینے کے بعد تیزی سے اوپر سڑک پار کر کے پتھریلی دیوار پھلانگتا اسی وسیع وعریض قبرستان میں داخل ہوا۔ آسمان کی کالی گھٹاؤں اور بجلیوں کے گل ہونے سے ہاتھ کو ہاتھ نہ سُجھائی دینے والی تاریکی میں قبروں کے درمیان سے گذرتے ہوئے چہرے کا نقاب رکاوٹ بننے لگی تو اسے سر کے پیچھے پلٹ کر ایسے چل دیا کہ چال زنانہ معلوم ہونے لگی۔ وہ کوئی نازک اندام دوشیزہ ہی تھی۔

اُدھر شمیم نے قبر کی سطح سے سر اٹھایا ہی تھا کہ اس کی نگاہ قبرستان کے درمیان سے گذرتے ہوئے ہیولے پر پڑی۔ وہ اُچھل کر پیڑ کی آڑ لیتا سوچنے لگا کہ شاید کوئی اور بدنصیب بھی خود اس کی طرح حالات کا مارا ہے۔ جورات کی تاریکی میں آہ وفغاں کرنے ویرانے میں آنکلا ہے۔ وہ اُسے دُور پہاڑی کے دامن کی طرف بڑھتے دیکھتا رہا۔ پھر اُسے پہاڑی کی آڑی ترچھی چڑھائی چڑھتے دیکھ کر اُسکی چھٹی حس بیدار ہوگئی۔ اُسے چڑھائی چڑھنے والی کے عزائم جارحانہ اور ارادے جان لیوا محسوس ہوئے۔

اس طرف پہاڑی زیادہ اونچی نہ تھی۔ صرف چند منٹوں میں طے ہوسکتی تھی۔ البتہ دوسری طرف کافی گہرائی تھی۔ پہاڑی چڑھ کر ٹیکری تک پہنچ ہی پائی تھی کہ ٹھیک اسی بلندی سے کسی معصوم شیر خوار کے رونے کی دل فراش صدا سناٹے کو چیر گئی۔ شمیم چونک پڑا۔ اس کے کان بج اٹھے......دل و دماغ میں اندیشوں نے سر ابھارا کہ کہیں بچّہ اس کا اپنا تو نہیں......بے چین ہو کر پیڑ کی آڑ سے باہر آیا اور شیر خوار کا اسرار جاننے کے لئے قبروں کے درمیان تیزی سے بڑھنے کی کوشش میں بڑی مشکل سے رستہ ٹٹولتا، کچھ چلتا، کچھ دور بلندی کی طرف بڑھنے لگا۔ کئی آڑی ترچھی غیر ہموار چڑھائی سر کر کے ٹیکری پر پہنچنے تک بچہ شانت ہو چکا تھا۔

شمیم نے اوپر پہنچتے ہی کچھ فاصلہ کی دوری بنائے چٹانی پتھروں کی آڑ سے تاریکی میں اس کی موجودگی کی سمت کا پتہ لگانے کی کوشش کی۔ تبھی اس نے آسمانی برقی لپک میں دوشیزہ کو قبرستان کی طرف منہ کئے استادہ پایا۔ دوشیزہ ٹیکری کی بالائی سطح سے ہی دور نیچے قبروں

کے درمیان مدفون جمیلہ کے مرقد سے غمگین لہجے میں مخاطب تھی۔ وہ بڑ بڑاتی کہہ رہ تھی۔

''بہن......کیا کروں اس بچے کا؟......کب تک سب سے چھپاتی پھروں؟ تو لوگ مجھ پر بھی شک کرنے لگے ہیں۔ تمہارا روگ اپناتے اپناتے میں بھی سماج کے غضب کا شکار ہونے لگی ہوں......یوں بھی ہم کون سی اونچی ذات کے ہیں جو خاندانی جان کر پردہ پڑا رہے۔ یہاں تو ہر کوئی مجھے ستانے کے درپے ہے......بہن اس کا باپ زندہ بچا ہوتا تو اس کو سونپ کر الزاموں سے بچ پاتی۔ لیکن پھوٹے نصیب سے نہ آسکا کوئی سگا اسے لینے آیا نہ میں مُکت ہو پائی۔ اب میں بھی الزاموں بھری زندگی سے تنگ آ چکی ہوں اور شاید تمہاری طرح اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا میرا بھی مقدر ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا اس ننھی سی جان کا کیا کروں......کسے دوں کسے سونپوں......آخر کون اسکی پرواہ کرے۔......؟ پھر خود ہی اپنے سوال کا جواب دیتی۔

......''اب جو بھی ہو۔ میں ناکردہ گناہ کے لئے سماج کے طعنے سہتی ہوئی کسی بے اعتبار کا اب اور انتظار نہیں کرسکتی۔......میں بس سکون چاہتی ہوں......روز روز کے بچھوں سے مُکتی چاہتی ہوں......میرے لئے اپنی زندگی کا خاتمہ مجبوری ہے۔ اور جمیلہ تمہارے بدنصیب بچے کو یوں بھی بے درد سماج کبھی نہیں اپنائے گا۔ کبھی چین سے جینے نہیں دے گا۔ پھر بھی اسے قسمت کے رحم کرم پر چھوڑے جارہی ہوں۔ میں آرہی بہن۔ کچھ ہی پل میں، میں تم سے آملوں گی......ہاں میں کھائی میں کود جاؤں گی''۔

شمیم کچھ فاصلے پر دوری بنائے بڑے سے چٹانی پتھر کی آڑ میں چھپ کر دوشیزہ کی گفتگو سنتا رہا۔ اس کی آہ وزاری میں شکوہ کے ساتھ ساتھ خطرناک ارادے صاف عیاں تھے اور پھر وہ ننھی سے جانِ جو اس کے موت کا سبب بنی ہوئی تھی، بھی بے خطا موت کے منہ میں جانے والی تھی۔ یہ سب سوچ کر شمیم تڑپ اٹھا۔ اگر چہ وہ دوشیزہ کو نہ پہچان سکا اور نہ اُس کی باتوں سے معصوم بچے کی اصل حقیقت پوری طرح جان پایا تو بھی اس کے شعور میں دونوں کو بچانے کا احساس تیزی سے گردش کرنے لگا۔ دوشیزہ کہتے کہتے یکا یک بے ساختہ بچے کو

سینے سے چپکا کر فرطِ محبت سے بڑبڑائی۔

''مگر نہیں۔ اس ننھی سی جان کو کس کے سہارے چھوڑوں۔ آسمان پر کالے بادل گڑ مڑ ہو رہے ہیں۔ بڑا ہی خوفناک منظر تھا...... یہیں چھوڑ دوں تو کوئی بجلی چمکے یا نہ چمکے، یہ رات بھر تڑپ تڑپ کر بلکتا رہے گا۔ صبح تک اس کی موت بار بار ہو گی۔ لومڑی اور پہاڑی بلے تڑپا تڑپا کر اس کی چیر پھاڑ کر دیں گے۔ نہیں نہیں میں اسے تڑپ تڑپ کر مرنے نہیں دوں گی...... اس کی موت ایک بار ہی ہو گی...... میرے ساتھ ہو گی...... معاف کرنا جمیلہ بہن، مجھے ایسا ہی کرنا ہو گا۔ اس معصوم کو لے کر ہی کودنا ہو گا۔ میں مجبور ہوں جمیلہ بہن۔ میں مجبور ہوں''۔

اب کے دوشیزہ کے منہ سے بابار جمیلہ کا نام سنتے ہی وہ دوبارہ چونکا جمیلہ کی اولاد کے بارے میں جان کر سر سے پیر تک خوشی کی کرنٹ سی دوڑ گئی۔ کفارہ ادا کرنے کی اُمید نے جوش مارا۔

اُدھر دوشیزہ نے یکبارگی بچّے کو چوم کر دوبارہ سینے سے لگالیا اور پلٹ کر ٹیکری کے اُس طرف بڑھی جہاں گہرائی بہت زیادہ تھی۔

دوشیزہ کو ٹیکری کے دوسری طرف جاتے دیکھ کر شمیم پتھر کی آڑ سے نکل کر اُس کی طرف دوڑا۔ ابھی وہ ٹیکری کے کنارے آ کر رُکی ہی تھی کہ بادلوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ بجلی چمکی۔ کئی لپکیں بادلوں کو چیرتی دائیں بائیں بھاگیں۔ ان لپکوں سے پل بھر کے لئے ٹیکری روشنی میں نہا گئی۔ تیز روشنی کی چمک اور گرج سے شیر خوار چیخ پڑا۔ چیخ سنتے ہی شمیم بے اختیار بڑھا کر پکار اُٹھا۔

''میرا بچّہ''۔

سناٹے دار تاریکی میں عقب سے پکار سن کر وہ خوف کے مارے اُچھل سی پڑی اور مڑ کر بے تحاشہ پوچھ بیٹھی۔

''کون ہے وہاں؟

''میں ہوں۔ اِس بدنصیب کا باپ.....رُک جاؤ۔ خدا کے لئے وہیں رُک جاؤ۔''

جب تک شمیم اُس تک پہنچتا وہ خوف کے مارے تھرتھراتی رہی۔ قریب پہنچتے ہی شمیم نے درد بھری آواز میں فریاد کرتے ہوئے کہا۔

''یہ ننھی سی جان میری ہے۔ اسے میری جھولی میں ڈال دو۔''

''لیکن تم ہو کون.....؟'' دوشیزہ نے خوف و حیرت کے ملے جلے لہجے میں پوچھا تو اس نے تڑپ کر جواب دیا۔

''میں عاشق مراد ہوں۔ ایک ایسا بدنصیب جس کی دُنیا لٹ چکی ہے۔''

دوشیزہ اسے پہچان گئی تو چیخ سی پڑی۔

''شمیم تم.....تمہاری تو مرنے کی خبر آئی تھی۔''

''اب بھی کون سا زندہ ہوں میں۔ شائد اس معصوم کے لئے چند سانسیں بچی ہیں۔ لاؤ مجھے دو...... میں اس کی دُنیا بناؤں گا۔''

''ہاں ہاں.....لو سنبھالو۔ میں طعنوں بھری زندگی سے تھک چکی ہوں۔''

وہ بچے کو سونپنے کے بعد مُڑی ہی تھی کہ شمیم نے روک کر پوچھ لیا۔

''سنو۔ یہ کیا کرنے جا رہی ہو؟''

''خاتمہ اپنی زندگی کا خاتمہ''۔

''نادان نہ ہو.....خاتمہ کرنے سے کیا ہوگا؟''

''روز روز کے طعنوں سے آزاد ہو جاؤں گی۔ اونچ نیچ کا غم نہ رہے گا''۔

''نادان نہ بنو.....زندگی ایک بار ملتی ہے۔ اسے یوں نہ گنواؤ۔''

لیکن ذات پات کی بندش میں بندھی میری زندگی کس کام کی!''

''اس بندش کو مٹانے کے لئے میرا ساتھ دو گی.....؟''

''کیسے.....؟''۔ وہ پلٹ کر حیرت سے پوچھ بیٹھی تو شمیم پورے اعتماد سے بولا۔

''میری پناہ میں رہ کر''۔

"میں سمجھی نہیں......!"

"میرے معصوم کی ماں بن کر......"

"جینے کے لئے اتنا ہی کافی نہیں"۔

"میں بھرپور سہارا دوں گا......سارے فرق مٹا دوں گا"۔

"لیکن سماجی بندش......؟"

"مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔ قرآن وسنت کی روشنی سارے بندشیں توڑنے کے لئے کافی ہیں"۔ وہ ایک پل کچھ سوچتی رہی۔ پھر بے اختیار بچی کو گودی میں لینے کے لئے باہیں پسار دیں۔ آکاش پر چھٹے ہوئے بادل کی جگہ کئی ستارے نمودار ہو کر مسکرا دیئے۔

............☆☆☆............

پرویز مانوسؔ

نام :پرویز احمد بٹ

قلمی نام :پرویز مانوسؔ

تاریخ پیدائش :۱۶؍مارچ ۱۹۶۶ء سرینگر

تعلیم :ایم۔اے (اُردو)

شعری مجموعے :بیتے لمحوں کی سوغاتیں، موسم اڑان کا، چاند لمس گلاب

افسانے مجموعے :شکاری کی موت، مُٹھی بھر چھاؤں

اعزازات :سٹوڈنٹس کلچرل کونسل جموں یونیورسٹی لٹریری ایوارڈ ۲۰۰۴ء،
ادبی کُنج جموں، لٹریڑی ایوارڑ (۲۰۰۵)
ریاستی کلچرل اکیڈیمی ایوارڈ، بیسٹ بک ایوارڈ ۲۰۰۷
لوک لِکھاری سبھا جالندھر، لالہ جگت نارائن لٹریری ایوارڈ
انجمنِ ترقی اُردو کشتواڑ، لٹریری ایوارڈ (۲۰۰۸)

پتہ :۱۱۵۔آزاد بستی نٹی پورہ (ویسٹ) سرینگر.....۱۹۰۰۱۵

فون نمبر 9419463487

❖

☆.....پرویز مانوس

گھونسلے

گزشتہ دو روز سے برف باری ہو رہی تھی۔ جہاں تک نظر جاتی تھی سارا علاقہ جیسے پشمینے کے سفید شال میں لپٹا ہوا نظر آتا تھا۔ درختوں کی شاخیں برف کے بار سے ایسے سرنگوں تھیں جیسے زمین کو سلام بجا لا رہی ہوں۔ مکانوں کی چھتوں پر جمع ہوئی برف کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے دھنی ہوئی روئی کے ڈھیر لگا دیئے ہوں۔ رسوئی کی بخاری سے نکلنے والے دھوئیں کی موٹی لکیر خلاء میں تحلیل ہو رہی تھی۔ اس سے مکان کے چھجے پر جمی ہوئی برف اُس کے سر کا تاج لگ رہی تھی۔

اس ٹھٹھرتی ہوئی سردی میں آدم زاد تو اپنے گھروں میں بیٹھ کر اپنے جسموں کو حرارت پہنچانے کر رہے تھے لیکن بے زباں پرندے دانے کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹک رہے تھے۔ وہ کونوں کھدروں سے دانے چُگ چُگ کر اپنا پیٹ بھرتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ ان کی چہچہاہٹ کانوں میں مدھر رَس گھول رہی تھی کہ یکا یک یہ چہچہاہٹ کرخت ہو گئی اور کچھ چڑیوں نے ادھر اُدھر اُڑنا شروع کر دیا پھر چڑیوں کی چہچہاہٹ میں شدّت آ گئی۔ شدت بھی ایسی کہ ہر ذی شعور کو اپنی جانب متوجہ کرنے لگی۔

اب تو چڑیوں کے جھنڈ کو پورا یقین ہو چکا تھا کہ جنگلی بلی ایک بار پھر اُن پر حملے کی تیاری کر رہی ہے۔

یہ وہی بلی تھی جس نے گزشتہ دو دنوں میں ان پر کئی بار جھپٹ کر چار چڑیوں کو اپنا نوالہ بنا لیا تھا اور اب پھر موقع کی تلاش میں تھی۔

وہ اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس بیٹھ کر اس ٹھٹھرتی سردی میں حقّے کے گرم گرم کش لگانے میں مصروف تھا، بیچ بیچ میں سے نظریں اُٹھا کر برف باری سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

حسبِ معمول آج بھی اس نے چھجے کے نیچے آنگن میں گندم اور چاول کے دانے اس غرض سے ڈال رکھے تھے تا کہ اس برف باری میں پرندے اپنے پیٹ کی آگ بجھا سکیں۔

حقّے کی نَے دانتوں تلے دبائے وہ سوچ رہا تھا کہ آج تک اس جنگلی بلی نے کتنے ہی پرندوں کا شکار کر کے کئی گھونسلے اُجاڑ دیئے لیکن پھر بھی اس کی تشفی نہیں ہوئی۔ اگر اسی طرح روزانہ یہ جنگلی بلّی ان پرندوں کا شکار کرتی رہی تو بہار میں درختوں اور منڈیروں پر کون سریلے نغمے گا کر اپنی چہچہاہٹ سے اس علاقے کو رونق بخشے گا؟

یہ نہ ہو کہ گھونسلوں میں بیٹھے ان کے بچے اپنی ننھی ننھی چونچیں کھول کر غذا کا انتظار کرتے رہیں۔

ایک لمبی آہ بھر کر اس نے حقّے کا ایک لمبا کش لگا کر دھواں ہوا میں چھوڑ دیا۔ دھواں پھیلتے پھیلتے چڑیوں کے جھنڈ تک پہنچ گیا۔ دھواں اتنا گھنا تھا کہ چڑیوں کا جھنڈ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اسے عجیب سی گھبراہٹ ہونے لگی دھوئیں میں کئی بے خطا پرندوں کا دم گھٹ گیا تھا۔ بے قراری کے عالم میں اس نے جلدی جلدی اپنے ہاتھوں سے آنکھوں کے سامنے پھیلے ہوئے دھوئیں کو ہٹا کر اپنی آنکھوں پر عینک چڑھائی تو اب چڑیوں کا جھنڈ اسے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

اس نے کھڑکی سے باہر نظر دوڑائی تو برف لگاتار گر رہی تھی۔ موٹے شیشوں والی عینک کے اندر سے گرنے والی برف اُسے روئی کے گالوں کی طرح لگ رہی تھی گردن پھیرنے پر دفعتہً اس کی نظر اُس جنگلی بلی پر پڑی جو چھجے کے نیچے رکھے ہوئے شہتیروں کی آڑ میں ہولے ہولے چڑیوں کے جھنڈ کی جانب اپنے قدم بڑھا رہی تھی۔ اُس نے غور سے دیکھا تو اس کے ہوش اُڑ گئے۔ یہ کیا؟ اس جنگلی بلی کے پیچھے چھوٹی چھوٹی بلیاں قطار میں آگے بڑھ رہی تھیں۔ اس نے کنکھیوں سے شمار کیا تو اس کے قریب چڑیاں اور آٹھ بلیاں

تھیں۔نہیں......یہ ظلم ہے......سراسر ظلم۔میں یہ کبھی برداشت نہیں کروں گا۔اس کا خون کھول اُٹھا۔حقہ ایک طرف رکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔پھر وہ کمرے کے کونوں میں کچھ تلاش کرنے لگا۔جلدی ہی اس کی نگاہیں ایک چیز پر جم گئیں...... یہ گھاس اکٹھی کرنے والا ''جندرا'' تھا......اب دیکھتا ہوں یہ اپنے ناپاک ارادے میں کیسے کامیاب ہو پاتی ہیں؟

''جندرا'' اُٹھا کر وہ دروازے کے پٹ کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔چند لمحے انتظار کرنے کے بعد اُس نے وہ ''جندرا'' بلیوں پر دے مارا۔ایک بلی تو موقعے پر ہی ڈھیر ہو گئی اور باقی وہاں سے بھاگنے میں کامیاب ہو گئیں۔چڑیوں کا غول اُڑان بھر کر دوسرے مکان کی منڈیر پر جا بیٹھا۔

مری ہوئی بلی کو دیکھ کر وہ خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا جیسے اس نے کسی شیر کا شکار کیا ہو۔

''جندرا'' سنبھال کر وہ پھر کھڑکی کے پاس بلیوں کے تاک میں بیٹھ گیا۔وہ سوچنے لگا، ان کالی اور سفید بلیوں کا ملاپ کیسے ہو گیا۔چند مہینے قبل تو وہ ایک دوسرے کی جانی دشمن تھیں۔اس نے سر جھٹکا، چلو اس کی ایک کوشش سے کتنی جانیں بن بچ گئیں۔کاش! اس نے پرسوں سے ایسی کوشش کی ہوتی تو اس وقت تک کئی گھونسلے اُجڑنے سے بچ گئے ہوتے۔

چہچہاہٹ سن کر اس کو لگا جیسے چڑیاں اس کا شکریہ ادا کر رہی ہوں۔ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر بکھر گئی۔

ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلنے لگا پرندوں کو ڈالا ہوا دانہ بھی اب ختم ہو چکا تھا۔پرندے ایک ایک کر کے اپنے گھونسلوں کی راہ لے رہے تھے۔دور موذّن کی اذان دین داروں کو عبادت کی دعوت دے رہی تھی برف باری میں قدرے کمی آ چکی تھی۔

اس نے حقے کا آخری کش لگا کر دھواں کھڑکی سے باہر چھوڑ دیا پھر اس دھوئیں کو غور سے دیکھنے لگا۔دھواں ایک لمبی لکیر کی صورت اختیار کر کے دلاور خان کے بنگلے کی طرف چلا گیا اور اس کے پیچھے پیچھے اس کا ذہن بھی دلاور خان کے بنگلے کے دروں چلا گیا، جس

کے چھجے کے نتیجے کبھی بے شمار پرندوں کے گھونسلے ہوا کرتے تھے۔ خوشیاں اس بنگلے کا طواف کرتی تھیں اور آنگن میں سکھ کی بانسری بجتی تھی۔ پورے پانچ کنال پر پھیلا ہوا ایسا شاندار بنگلہ سارے علاقے میں کسی کا نہیں تھا۔ بے شمار دولت ہونے کی وجہ سے ہر حاجت مند کی مراد پوری ہوتی تھی۔ رحم دل اور خدا پرست سخی سے کسی کا دکھ نہیں سہا جاتا تھا۔ پورے چالیس افراد کا کنبہ تھا، پھر جب چند بلیوں سے اس گھر کی خوش حالی برداشت نہ ہوئی تو انہوں نے جنگلی بلیوں سے ساز باز کر کے اس گھرانے کی خوشیوں کا شیرازہ بکھیر کے رکھ دیا اور اس بنگلے پناہ لینے والے کچھ پرندوں نے ہجرت کو ترجیح دی۔ کچھ پرندوں کا گھونسلوں کے اندر ہی دَم گھٹ گیا۔

اس نے سر کو جھٹک کر اپنا ذہن دلاور خان کے بنگلے سے آزاد کیا تو اس کی نظر برف پر پڑے ہوئے بلیوں کے پاؤں کے نشانات پر جم گئی جو دلاور خان کے بنگلے سے چلتے ہوئے اس کے مکان کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ''جندرا'' ہاتھ میں اٹھا کر وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ نہیں ......! میں ان کو ناپاک ارادوں میں کبھی کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔

............☆☆☆............

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

نام :مشتاق احمد وانی

قلمی نام :ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

تاریخ پیدائش :۳ر مارچ ۱۹۶۰ء

جائے پیدائش :محلّہ سروال، بھوتہ، ڈوڈہ

تعلیم :پی۔ایچ۔ڈی (اردو)، بی۔ایڈ، ڈی۔لٹ

تصانیف :تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران (تحقیق وتنقید)

ہزاروں غم (افسانوی مجموعہ)

میٹھا زہر (افسانوی مجموعہ)

پتہ :ادھمپور۔جموں وکشمیر

فون نمبر 9419336120

❖

☆......ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

بیٹی

ویک اینڈ پر جونہی وہ گھر کے اندر داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ اس کے گھر والے چہرے لٹکائے بیٹھے تھے اور اس کی بیوی دو دن کی بچی کو دودھ پلا رہی تھی۔ وہ سمجھ گیا چونکہ اس کی بیوی نے بیٹی کو جنم دیا ہے اس لئے گھر کے تمام افراد کا رویہ روکھا ہے پھر بھی اس نے بچی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیوی سے پوچھا۔

''یہ کیا ہے؟''

بیوی مسکراتے ہوئے بولی ''بیٹی''۔

''لفظ ''بیٹی'' سنتے ہی اس کے دل کی گہرائیوں میں احساس ذمے داری کی تیز چھری اُترتی چلی گئی۔ گھر میں داخل ہونے سے پہلے اس کے چہرے پر جو بشاشت تھی وہ بہت جلد کافور ہوگئی۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے ہزاروں لوگوں کے سامنے اُس کا وجود زمین میں دھنستا جا رہا ہو اور لوگ اس کا یہ حال دیکھ کر قہقہے لگا رہے ہوں۔

شام ہو رہی تھی۔ آسمان پر گھنے سیاہ بادلوں نے گھیرا ڈال دیا تھا لیکن بجلی کی روشنی سے سارا شہر جگمگا رہا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ وہ کمرے سے اُٹھ کر برآمدے کی کرسی پر آبیٹھا اور خیالوں کے اتھاہ سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔ اُسے اپنا مستقبل ایک کالی دیوار کی مانند دکھائی دینے لگا۔ اُسے بار بار یہ خیال اندر ہی اندر نوچ رہا تھا کہ وہ ایک بیٹی کا باپ بن چکا ہے۔ وہ شعوری اور لاشعوری طور پر بیٹی کے بارے میں بہت سی باتیں سوچتا رہا۔ اس نے چھوٹی ہی عمر میں اپنی ماں سے یہ باتیں سن رکھی تھیں۔ ''بیٹی پرایا دھن ہوتی ہے'' ''پڑھاؤ لکھاؤ

اور پال پوس کر کسی دوسرے کے حوالے کردو۔" یا یہ کہ بیٹی ماں باپ کے دل کا گہرا زخم ہوتی ہے!" وہ نہ جانے اور کیا کچھ سوچتا کہ اتنے میں اس کی چھوٹی بہن نے آ کر کہا۔

"بھیا کھانا کھانے کے لئے آ جایئے۔"

وہ فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور اُداس سا اندر چلا گیا۔ کھانا کھاتے اُسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے وہ اناج نہیں، مٹی کھا رہا ہو۔ بیوی نے اس کے اندر کی کیفیت بھانپ لی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد جب وہ بیوی کے قریب جا کے بیٹھا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے نہ جانے کیا تلاش کرنے لگا تو بیوی کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ اُس نے روتے ہوئے کہا۔

"اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

اُس نے بیوی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی اس کے سر پر زور زور سے ہتھوڑا مار رہا ہو۔ وہ اُٹھا اور بیوی کے قریب ہی ایک دوسری چار پائی پر لیٹ گیا۔ شرم اور احساس ذمے داری کا اَن دیکھا ہیولیٰ اُسے بار بار جھنجھوڑ دیتا۔ وہ بار بار یہ کوشش کرتا کہ اس کے دل و دماغ میں بیٹی کے پیدا ہونے پر کوئی بھی تشویش اور مایوسی پیدا نہ ہو لیکن ہر بار اس کے ذہن و دل میں ان اذیت ناک خیالات کی گرفت مضبوط ہو جاتی۔ اُس نے نیند کی خاطر کروٹ بدلی مگر فوراً وہ نوزائیدہ بیٹی کے مستقبل پر غور فکر کرنے لگا۔ وہ سوچنے لگا۔

اُس کی بیٹی دو دن کی ہو چکی ہے۔ دیکھتے دیکھتے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ دے گی۔ کیا وہ اس کی صحیح تعلیم و تربیت کر سکے گا؟ موجودہ دور میں کتنی بداخلاقیاں پیدا ہو چکی ہیں۔ معاشرے میں ان لوگوں کی تعداد زیادہ ہے جو حرص و ہوس کے پجاری ہیں۔ سنیما اور رسائل کے ذریعے بداخلاقی اور فحاشی کی تعلیم دی جانے لگی ہے۔ چوروں، بدمعاشوں اور دغابازوں کی تعداد دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے۔ مہنگائی آسمان کو چھو رہی ہے۔ کیا اس کی بیٹی ان تمام بحرانی مسائل کا مقابلہ کر پائے گی؟

اس نے دوسری کروٹ لی تا کہ نیند کی پری اُسے اپنی آغوش میں لے لے، مگر نیند

تو جیسے اُس کی آنکھوں سے ہمیشہ کے لئے روٹھ گئی تھی۔ فوراً اُس کے ذہن میں خیال آیا کہ جہیز کی اندھی رسم معاشرے میں مختلف روپ اختیار کر چکی ہے۔ کل اُس کا داماد بھی اُسے جہیز دینے لئے پریشان کرے گا اور کیا بیٹی کے لئے اُسے کوئی مناسب رشتہ مل پائے گا۔ اسے معلوم تھا جب کسی گھر میں بیٹی جوان ہونے لگتی ہے تو ماں باپ کی نیند اُڑ جاتی ہے۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ سماج کے آوارہ اور اوباش لوگ شریف گھرانے کی بیٹی کو راہِ راست پر نہیں رہنے دیتے۔ ان تمام باتوں پر غور وفکر کرتے ہوئے اُسے انتہائی گھٹن محسوس ہونے لگی۔ اس نے پھر کروٹ بدلی تاکہ آرام کی نیند سو سکے۔ لیکن کوشش کے باوجود وہ اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اس کے ذہن میں یکے بعد دیگرے کئی سوالات اُبھرتے چلے گئے۔ اُس کا ذہن ماضی، حال اور مستقبل میں گردش کرتا رہا۔ عرب میں اسلام سے قبل بیٹیوں کو زندہ درگور کیا جاتا تھا اور ہندوستان میں بھی بیٹیوں کو ستی کے طور پر جلایا جاتا تھا اور خبارات میں بھی ہر روز یہی خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں کہ فلاں بیٹی نے زہر کھا کر خودکشی کی اور فلاں کی بیٹی نے سسرال والوں سے تنگ آکر اپنے آپ کو آگ لگائی۔ ان تمام باتوں پر غور وفکر کرنے سے اُسے سخت روحانی اذیت پہنچ رہی تھی۔ اُس نے ایک بار پھر کوشش کی کہ اُسے نیند آجائے اور سوالات کا یہ لامتناہی سلسلہ ذہن سے منقطع ہو جائے لیکن نیند کی دیوی روٹھی رہی۔ اُس نے پھر کروٹ بدلی۔ اب اس کے دل ودماغ کو پھر یہ احساس ستانے لگا کہ تم ایک بیٹی کے باپ بن چکے ہو۔ اس بار بیٹی سے متعلق اس کی سوچ مثبت رویہ اختیار کرنے لگی۔ سوچتے سوچتے اس نے اپنے آپ سے کہا "اس دنیا میں بیٹی کا تقدس اور رتبہ بہت بلند بھی ہے کیونکہ اسی کے بطن سے انبیاءؑ، صوفیائے کرامؒ اور بزرگانِ دین پیدا ہوئے ہیں ملکہ نور جہاں، ملکہ وکٹوریہ، رانی جھانسی، چاند بی بی، رضیہ سلطان، سروجنی نائیڈو اور اندرا گاندھی بھی تو کسی کی بیٹیاں ہی تھیں۔ آج بیٹیاں زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کر رہی ہیں۔ انہوں نے ایک معمولی دفتر سے لے کر اعلیٰ سیاسی حلقوں تک رسائی حاصل کر لی ہے۔ پھر میں کیوں اپنی بیٹی کے مستقبل کے بارے میں سوچ سوچ کر

دماغ خشک کر رہا ہوں۔ مجھے اپنی بیٹی کے متعلق مزید نہیں سوچنا چاہیئے اور یہ خیال آتے ہیں اُس نے لحاف سے چہرہ ڈھانپ لیا لیکن ایک بار پھر احساس شکستگی نے اُسے آگھیرا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی سوچ اپنی بیٹی سے متعلق جاری رہی۔ اُس نے اپنے آپ سے کہا ٹھیک ہے موجودہ دور میں بیٹیاں ستاروں پر کمندیں ڈال چکی ہیں۔ وہ ترقی کے تمام زینے طے کر چکی ہیں۔ بھلے ہی وہ کتنی ہی ترقیاں کیوں نہ کر چکی ہوں لیکن بنیادی طور پر وہ انتہائی کمزور اور بے حد مجبور ہیں۔ وہ اپنے آپ سے محوِ گفتگو تھا کہ اچانک مندروں سے گھنٹیاں اور مسجدوں سے اذانیں گونج اُٹھیں۔ وہ چونک اُٹھا۔ اُس نے گھڑی پر نظر ڈالی، صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ وہ اُٹھا اور وضو کر کے نمازِ فجر ادا کی۔ گھر کے سبھی افراد ابھی تک سوئے تھے۔ باہر درختوں پر چڑیوں نے چہچہانا شروع کر دیا تھا۔ روشنی پھوٹ رہی تھی۔ رات بھر سوتے رہنے کی وجہ سے اُس کی آنکھوں میں سرخی اور سر میں درد پیدا ہو چکا تھا لیکن وہ اپنے عزیز دوست مدن ورما کے پاس جانے کے ارادے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کی نظر بیٹی کے چہرے پر پڑی۔ وہ معصوم نیند کے عالم میں تھی۔ اس کی زبان سے بیساختہ نکل گیا۔ بیٹی! اور اسی احساس شکستگی کے ساتھ وہ گھر سے باہر نکل آیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ مدن ورما کے گھر پہنچا اور جونہی گھر میں داخل ہوا تو مدن ورما اُسے دیکھتے ہی بولا۔

''واہ! آج یہ چاند کدھر سے نکل آیا۔ کیا حال ہے میرے دوست؟''

دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ مدن ورما کے تینوں بیٹے آنگن میں بیٹھے لکھنے پڑھنے میں مصروف تھے۔ ورما کی بیوی گنگوتری رسوئی میں ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ مدن ورما اُٹھا اور اس کے لئے چائے لے کر آ گیا۔ چائے پیتے ہوئے مدن کی نظر اس کی آنکھوں پر پڑی، جو انگارے کی طرح سرخ دکھائی دے رہی تھیں۔ ورما نے حیران ہو کر پوچھا۔

''تیری آنکھیں سرخ کیوں ہیں؟''

''یار! رات بھر نیند نہیں آئی۔''

''کیوں؟'' ورما نے پوچھا۔

''میرے دوست! تجھے شاید یہ معلوم نہیں ہے کہ میرے گھر میں بیٹی پیدا ہوئی ہے اور جب سے بیٹی پیدا ہوئی ہے تب سے میری نیند غائب ہے۔''

''بیٹی تو خوش نصیبی کی علامت ہے۔ تیرے گھر میں لکشمی آئی ہے۔ میرے دوست بیٹی بہت وفادار ہوتی ہے جس گھر میں بیٹی نہیں ہوتی وہ گھر کھنڈر ہوتا ہے، بیٹی گھر کی رونق ہوتی ہے، دیکھ میرے تین بیٹے ہیں، میری بیوی گنگوتری کی کمر میں اکثر درد رہتا ہے۔ میں جب دفتر چلا جاتا ہوں اور تینوں بیٹے اسکول چلے جاتے ہیں تو گنگوتری اکیلی درد کی وجہ سے بستر پر کراہتی رہتی ہے، کبھی کبھی ہمارے گھر کھانا بھی نہیں پکتا اور نہ برتن دھوئے جاتے ہیں۔ میں اور گنگوتری ایک بیٹی کے لئے کتنا ترستے ہیں۔ لیکن ہماری کوئی بیٹی نہیں، میری بیٹی ہوتی تو وہ گھریلو کاموں میں اپنی ماں کا ہاتھ بٹاتی، لیکن ہم بدنصیبوں کی قسمت میں ''بیٹی'' کہاں۔ اگر تو بیٹی کے پیدا ہونے پر اتنا مایوس ہوا ہے تو لا اپنی بیٹی ہمیں سونپ دے۔ ہم اسے خوشی خوشی اپنا لیں گے ہمارے گھر میں روشنی آجائے گی۔''

مدن ورما کی باتیں سن کر اُسے ندامت کے ساتھ خوشی بھی ہو رہی تھی۔ وہ خاموش مدن کی باتیں سنتا رہا اور جب اُس سے رخصت ہونے لگا تو اُس کے چہرے پر خوشی کے آثار اور دل میں یہ احساس تھا کہ وہ ایک اہم اور قیمتی شے کا مالک بن گیا ہے۔

وہ جب اپنے گھر پہنچا تو اس کا دل خوشی سے اُچھل رہا تھا۔ اُس کی بیوی بیٹی کو دودھ پلا رہی تھی۔ اس نے آتے ہی بیٹی کو اپنی گود میں اٹھا لیا۔ تو اُس کی بیوی نے پوچھا۔ ''خیر تو ہے، بیٹی پر اچانک لاڈ کیوں آنے لگا۔'' اُس نے بے حد غور سے اپنی بیوی کو دیکھا اور بولا۔ ''اس لئے کہ بیٹی گھر کی زینت ہوتی ہے۔''

بیوی نے اپنی حیران حیران آنکھوں سے اُسے دیکھا اور دوسرے ہی لمحہ اپنی پلکوں پر لرزتے موتی خشک کرنے لگی۔
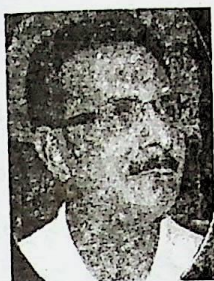
............☆☆☆............

محمد شفیع ایاز

نام :محمد شفیع بٹ

قلمی نام :محمد شفیع ایاز

تاریخ پیدائش :۱۷/مارچ ۱۹۶۰ء

تعلیم :ایم۔بی۔اے، پی۔ایچ۔ڈی

تصانیف :(۱) دردِ پنہاں (۱۹۹۹) افسانوی مجموعہ

(۲) تلاش سحر (۲۰۱۰) شعری مجموعہ

(۳) پگڈنڈی کا مسافر (۲۰۱۱) افسانوی مجموعہ

(۴) شبِ تنہائی (۲۰۱۲) شعری مجموعہ

پیشہ :بینک منیجر (جموں و کشمیر بینک)

پتہ :اقبال آباد کے۔پی روڈ اننت ناگ، کشمیر

ای۔میل msayaz11@gmail.com

فون نمبر 9419040604

☆...... محمد شفیع ایاز

پگڈنڈی کا مسافر

سورج غروب ہو چکا تھا اور لوگ مغرب کی نماز ادا کر کے مسجد سے باہر آرہے تھے ۔ یہ ایک چھوٹا سا پہاڑی گاؤں تھا اور میں پچھلے چھ مہینوں سے یہاں کے واحد تعلیمی ادارے پرائمری سکول کا واحد ٹیچر تھا۔ یہ گاؤں شہر سے کافی دور تھا اور پانچ چھ میل کی پیدل مسافت طے کر کے ہی آدمی اس گاؤں میں پہنچتا۔ یہ میری پہلی تقرری تھی ورنہ کوئی بھی دوسرا اُستاد اس گاؤں کے سکول میں ڈیوٹی دینے نہیں آتا۔ یہ گاؤں بہت ہی پسماندہ تھا اور یہاں بسنے والے لوگ بھی خطِ افلاس سے نیچے اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ عام لوگوں کا پیشہ زمینداری تھا اور یہاں صرف مکی کی کاشت ہوتی تھی۔ گاؤں میں نہ کوئی ہسپتال تھا، نہ ڈسپنسری، نہ بنک، نہ ڈاکخانہ اور سرکاری پرائمری سکول کے بغیر کوئی گاڑی۔ چھ میل دور تک گاڑی آتی تھی اور وہیں سے گاؤں جانے کا واحد راستہ پگڈنڈی کا تھا۔ اس پگڈنڈی پہ ایک وقت ایک طرف سے صرف ایک آدمی چل سکتا تھا۔ یہ گاؤں قریباً پچاس چولہوں پر مشتمل تھا اور سارے مکان کچے تھے اور اُن کی چھت گھاس پھوس کی تھی۔ کوئی سرکاری ملازم نہیں تھا اور نہ کسی نے کوئی تعلیم حاصل کی تھی۔ سادہ زندگی، سادہ لباس اور رہن سہن کا پرانا ڈھنگ نمایاں تھا۔ جس سکول میں میری تقرری ہوئی تھی اُسے حال ہی میں کھولنے کا اعلان کیا گیا تھا اور سکول ایک چھوٹے سے کمرے میں شروع کیا گیا تھا۔ گاؤں میں کوئی دکان بھی نہ تھی، ماچس کی بھی ضرورت پڑتی تو چھ میل دور جانا پڑتا جہاں کچھ دکانیں تھیں۔ پورے علاقے میں تین شاندار کوٹھیاں تھیں اور وہ بھی ایک ہی جگہ تعمیر ہوئی تھیں۔ گاڑی بھی وہیں تک جاتی تھی اور وہاں سے آگے صرف

پگڈنڈی۔ گاؤں میں مغرب نماز کے بعد شاید ہی کوئی شخص باہر دکھائی دیتا۔ یوں تو گاؤں میں بجلی کے کھمبے لگے تھے اور بجلی کی تاریں بھی بچھی تھیں لیکن بجلی کبھی کبھار ہی ایک آدھ گھنٹے کا درشن دیا کرتی تھی۔ آج بھی حسب معمول بجلی کا کہیں پتہ نہیں تھا لیکن آسمان پر چاند چمک رہا تھا۔ اُس کی روشنی میں سب کچھ صاف صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں کچھ مسافت طے ہی کر چکا تھا کہ مجھے ایک تیز چیخ سنائی دی۔ میں نے اپنے قدم روک کے جو دیکھا تو پاس ہی ایک شخص زور زور سے چیخ رہا تھا۔ وہ میری جانب ہی بڑھ رہا تھا اور جب وہ میرے قریب پہنچا تو میں نے اُسے پہچان لیا۔ یہ وہی شخص تھا جو مجھے اُس وقت ملا تھا جب میں پہلی بار گاڑی سے اُترا اور اُس سے گاؤں کا راستہ پوچھا تھا۔ اُس نے مجھے نہ صرف گاؤں کا راستہ بتایا تھا بلکہ پورے چھ میل میرے آگے آگے اُس پگڈنڈی پر چلتا رہا۔ تب اُس نے مجھ سے بہت سوالات کیئے تھے۔ بہت باتیں کی تھی اُس نے ......میں کون ہوں؟ کیا کرتا ہوں؟ کہاں کا رہنے والا ہوں؟ کس غرض سے گاؤں میں آیا ہوں؟ وہاں کس کے پاس رہنا ہے اور نہ جانے کیا کیا پوچھ رہا تھا۔ ہاں بار بار وہ مجھ سے صرف ایک بات کہہ رہا تھا کہ وہ جو تین کوٹھے والے لوگ بس اڈے پر رہتے ہیں ان کے پاس کبھی نہ جانا اور نہ اُن سے ملنا۔ پگڈنڈی کا یہ مسافر جس طریقے سے بات کر رہا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ اس کا دماغی توازن ٹھیک نہیں تھا۔ پورے رستے میں وہ بس ایک ہی بات رٹے جا رہا تھا۔

''میری بات یاد رکھنا، کوٹھی والوں کے پاس نہ جانا۔ بات یاد رکھی نا....وعدہ کرو....وہ کوٹھی والے..اُدھر مت جانا....جب وہاں سے گزرو گے اُن کی طرف نظر اُٹھا کے بھی نہ دیکھنا.. ہاں..ورنہ نظر لگ جائے گی....میں پاگل نہیں ہوں..اس گاؤں میں میرے سوا کوئی سمجھدار نہیں ہے....میں تو راجا ہوں راجا..''

آج جب وہ میرے سامنے آیا تو اُس نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہنے لگا ''یہ گاؤں والے پاگل ہیں۔ یہ میری بات نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے۔ گاؤں میں طوفان آگیا ہے۔ کوئی نہیں بچے گا۔ چلو تم میرے ساتھ چلو۔ ہم گاؤں سے بھاگ جائینگے۔ تم ہی تو ایک سمجھدار ہو

جو میری بات سمجھ سکتے ہو۔۔چلو جلدی کرو۔۔بھاگو۔۔۔بھاگو۔۔۔"

کیوں بھئی کیا بات ہے؟ کون سا طوفان آیا ہے گاؤں میں؟ اتنا کیوں گھبرائے ہوئے ہو؟" میں نے ایک ساتھ کئی سوال پوچھے۔

"تم نہیں سمجھو گے۔ کوٹھی والے تینوں لوگ حاجی، لیڈر اور وہ سرکاری افسر ابھی گاؤں کی طرف آئے ہیں۔ نہ معلوم کس کو مرنا ہوگا۔ میں مرنا نہیں چاہتا اور تم بھی نہ مرنا۔ نہ معلوم کس کی شامت آئی ہے۔ میں بھاگ رہا ہوں" یہ الفاظ کہہ کر وہ پگڈنڈی کی طرف بھاگنے لگا۔ میں بھی اپنے ڈیرے کی طرف چل پڑا لیکن اس شخص کی باتیں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ آخر کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔

میں جس مکان میں رہتا تھا اس کے مالک سے میں نے اس شخص کے بارے میں پوچھا تو اُس نے بتایا کہ یہ شخص کہاں کا ہے اُسے معلوم نہیں اسکا نام نذیر ہے۔ پچھلے پندرہ سال سے وہ اسی گاؤں میں گھومتا پھرتا ہے۔ کبھی کسی کے ہاں روٹی کھاتا ہے تو کبھی بھوکا رہتا ہے۔ رات مسجد میں گزارتا ہے، ہر روز بس اڈے پہ جاتا ہے اور ہر اُس شخص کو راستہ دکھاتا ہے جو اُس سے گاؤں کا پتہ پوچھتا ہے یہی نہیں بلکہ وہ پگڈنڈی کے پورے سفر میں اُس کے ساتھ قدم بہ قدم اس کے آگے چلتا رہتا ہے۔ ہر کسی سے یہی کہتا ہے کہ وہ کوٹھی والوں سے بچ کے رہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی جا رہی ہے کہ یہ شخص پندرہ بیس سال پہلے جب پہلی بار اس گاؤں میں آیا تھا تو راستے میں اُسے تین آدمی ملے تھے اور یہ ان کے ساتھ ہی دوسرے گاؤں میں رہنے لگا تھا۔ یہ شخص اس گاؤں میں کوئی بڑا سا کارخانہ لگانا چاہتا تھا۔ اس کے پاس لاکھوں روپیہ تھا اور وہ اپنے گھر کا واحد چشم و چراغ تھا۔ کافی پڑھا لکھا تھا اور اُن تین آدمیوں نے اُسے گاؤں میں کارخانہ لگانے میں اپنا پورا تعاون دینے کی یقین دہانی دی تھی۔ پہلے اُنہوں نے زمین خریدی بعد میں تعمیرات کا کام شروع ہوا۔ اس شخص نے ساری پونجی اُن کے حوالے کر دی۔ تین سال بعد ان لوگوں نے اُس کے ساتھ بے ایمانی کی اور اُس کا سارا کارخانہ ہڑپ کر گئے۔ اُس کے پاس نہ کوئی تحریر تھی نہ گواہ۔ وہ ہر گھر، ہر

دفتر پہ دستک دیتا رہا کہ اُس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے اُسے انصاف ملے لیکن اُس کی کسی نے نہیں سنی۔ اُن تینوں نے گاؤں سے نکل کر بس اڈے کے قریب عالیشان کوٹھیاں تعمیر کیں۔ تینوں سماج کے ذی عزت شہری کہلاتے تھے۔ ایک حاجی عثمان، دوسرا سیاسی لیڈر چودھری اور تیسرا تحصیلدار میر صاحب۔ کس کی مجال تھی کہ اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا۔ نتیجہ یہی ہوا کہ یہ شخص اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا اور بے سر و پیر کی باتیں کرنے لگا۔ لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ پاگل ہے............آج...آج یہ اس لئے چلّا رہا تھا کہ وہ تینوں حاجی، چودھری اور میر گاؤں میں آنے والے تھے کیونکہ گاؤں والوں نے اُن کو نئی مسجد کی سنگ بنیاد ڈالنے کے لئے دعوت پہ بُلایا تھا۔

مالک مکان کی باتیں سن کر نہ جانے میں کہاں کھو گیا۔ یہ شخص پاگل نہیں بلکہ ایک مظلوم شخص ہے۔ جس سے سماج کے ٹھیکداروں کی شاطرانہ ذہنیت کا شکار ہونا پڑا۔

رات بھر میں کروٹیں بدلتا رہا۔ فجر کی اذان ہوئی تو میں مسجد کی جانب روانہ ہوا لیکن نماز ادا کرنے کے بعد جوں ہی میں اور لوگوں کے ساتھ مسجد سے باہر نکلا تو پگڈنڈی کے قریب ایک بھاری بھیڑ جمع تھی اور.............

پگڈنڈی پہ اُس کی لاش.......

میں سکتے میں آ گیا اور میرے کانوں میں اُس کے الفاظ گونجنے لگے ''وہ تینوں آ رہے ہیں نہ جانے کس کی شامت آنے والی ہے''

پگڈنڈی کا مسافر سچ ہی کہہ رہا تھا۔

...........☆☆☆...........

محمد مقبول ساحل

نام :محمد مقبول کھوکھر
قلمی نام :مقبول ساحلؔ
تاریخ پیدائش :۱۵؍مارچ ۱۹۶۸ء اڑحال (کوکرناگ) کشمیر
تعلیم :بی۔ایس۔سی
تصانیف :خاموش طلاطم (اردو شعری مجموعہ)
شبستانِ وجود (جیل ڈائری)
قدم قدم تعزیریں
پتہ :معرفت: ہفتہ روزہ ''پکار''، جواہر نگر سرینگر
فون نمبر 9797248039

☆......محمد مقبول ساحل

قہقہوں سے دور

.......دن بھر کے بدن شکن کام، دوڑ دھوپ اور اتھل پتھل سے چور چور ہو کر جب میں گھر لوٹا تو ایسا لگا گویا کسی ایسے سنیما ہال میں داخل ہو چکا ہوں، جہاں چین یا ہانگ کانگ کے مارشل آرٹ پر مبنی جیکی چن یا بروسلی کی کوئی فلم دکھائی جا رہی ہو، یا کسی لوک تھیٹر میں، جہاں کشمیری فوک ڈرامہ، بھانڈ پاتھر، واتل پاتھر یا شکارگاہ وغیرہ دکھایا جا رہا ہو..... یا پھر کسی میلے میں، جہاں دھمال چل رہی ہو...... یا پھر مچھلی مارکیٹ میں......لیکن اس جگہ کو اگر سٹاک ایکسچینج کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا کیونکہ سٹاک مارکیٹ میں ہر آدمی اپنی اپنی دُھن میں مست ہوتا ہے اور کوئی کسی کی بات نہیں سنتا، اس کے باوجود سب لوگوں نے چلا چل کر آسمان سر پر اٹھا رکھا ہوتا ہے...... ہمارے گھر میں شور شرابے کا عالم یہ تھا کہ ایک بار شام کے وقت پاس والے کھوکھر محلّہ میں کراس فائرنگ ہوتی رہی......ساری رات محلے میں مظاہرے ہوتے رہے......جلوس نکالا گیا اور دھرنا دیا گیا......لیکن کیا مجال کہ ہمیں اس واقعے کا پتہ چل جائے......ابھی کچھ ہی عرصہ قبل ہمارے گاؤں کے خان محلے کی عمر رسیدہ خاتون تاجہ بیگم دل کا دورہ پڑنے سے فوت ہو گئی......اس کی سات بیٹیاں، درجنوں پوتے، نصف درجن بہوئیں اور سینکڑوں پڑوسی ساری رات گریہ زاری کرتے رہے لیکن ہمیں صبح اس وقت پتہ چلا جب گاؤں کے لوگ تاجہ کو دفن کر کے قبرستان سے لوٹ رہے تھے......اس کے چند روز بعد جنگلات کی چھاپہ مار ٹیم نے دورانِ شب تلاشی کے دوران ہمارے زیرِ تعمیر مکان کی ساری لکڑی گاڑیوں میں بھر کے اپنے دفتر پہنچا لی اور ہمیں اس وقت پتہ چلا جب

ایک پولیس اہلکار نے ہمیں تھانے پر حاضر ہونے کا حکم سنایا...... یہ چند واقعات تو 'مشتے نمونہ ازخروارے' کے مصداق ہیں لیکن بتانا یہ مقصود ہے کہ میرا یہ ہنستا، گاتا اور دھمال مچاتا کنبہ کچھ زیادہ ہی خوشحال تھا۔ .. پانچ بچے ...... ایک سے بڑھ کر ایک تیز طرار، چالاک اور زیرک...... کمپیوٹر کی طرح چلتا ان کا دماغ، دماغ میں شیطانی منصوبے اور منصوبوں کی عمل آوری میں توڑ پھوڑ، شور اور ہنگامہ...... قینچی کی طرح چلتی زبان، زبان پر نت نئی باتیں اور طرح طرح کے فقرے، ڈائیلاگ اور ڈائیلاگوں کی مقابلہ بازی سے پیدا ہونے والی صوتی آلودگی..! کُشتی، کنگ فو، کراٹے، تائکوانڈو، کبڈی اور کھوکھو کے مقابلے اور ان مقابلوں کے نقصان دہ نتائج...... سرہانوں اور تکیوں کی جنگ اور برتنوں کے آزادانہ حملے ... میرے قیمتی کافی مگ اور ٹی سیٹ...... اُن کی ٹوٹی ہوئی کرچیاں...... کانگڑی جنگ... اور ان سبھی کھیلوں میں سے سب سے زیادہ ہولناک اور بھیانک تھا...... سمیر کا پھوٹا ہوا ماتھا، ...... ضمیر کے بازو سے بہتا ہوا خون ، رشید کے پھٹے ہوئے کپڑے اور گلزار کی ناک سے بہتی ہوئی نکسیر تو اِرشاد کے ہاتھوں پر بندھی ہوئی پٹی ...... ہمارے گھر میں ان دنوں اگر کسی چیز کی سب سے زیادہ ضرورت پڑتی تو وہ تھی ...... فسٹ ایڈ...... پٹیاں، بنڈیج، دوائیاں، اور یہ اشیائے ضرور یہ راشن پانی کے ساتھ ساتھ روزانہ خریدنا پڑتیں......

بچوں کے علاوہ میرے والدین اور دو چھوٹے بھائی...... ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ ان ننھے بدمعاشوں کی لٹر مستیوں اور بدماشیوں پر قابو پاتے اور انہیں سدھارنے کے لئے کچھ کرتے لیکن وہ ان سے بھی چار قدم آگے تھے...... سچ کہوں تو بچے تو بعد میں اس شورغل میں شامل ہوتے تھے، اس کا آغاز اکثر بزرگوں سے ہی ہوتا تھا...... ابا حضور بچوں کے درمیان بیٹھ کر اپنی زندگی کا کوئی واقعہ سناتے یا پھر کوئی لطیفہ ہوا میں چھوڑتے تو بچوں کی بسم اللہ ہوجاتی ...... پھر لطیفے پر لطیفہ اور قہقہے پہ قہقہہ شروع ہوجاتا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورا گھر ایک تھیٹر میں تبدیل ہوجاتا...... ہماری بیگم صاحبہ ......وہ تو جیسے ان بچوں سے بھی چھوٹی اور کم سن تھیں...... ہلہ گلہ مچانے میں سب سے آگے اور قہقہہ لگانے میں سب سے

اوّل......اور حد یہ کہ یہ سبھی مجھے ایک انتہائی تنگ نظر اور مردہ دل انسان سمجھتے تھے

''ان پھول جیسے ننھے بچوں کے ساتھ بھی کبھی کھیل لیا کرو......ان کا بچپن ہے ......اس کا مزہ لیا کرو''

ابا حضور مجھے اپنے تھیٹر میں مسخرے کے رول کے ساتھ شمولیت کی دعوت دیتے ہوئے کہتے تو امی جان ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہتیں......

''بچپن سے آج تک تم کتابوں میں کھوئے ہوئے ہو، کب تک اور کتنا پڑھو گے، کتاب چھوڑتے ہو تو کمپوٹر پر بیٹھ جاتے ہو، دوستوں کے ساتھ فون پر پہروں باتیں کرتے ہو اور پھر بیڈروم میں گھس جاتے ہو...... پڑھ پڑھ کر اپنی آنکھیں خراب کر لی ہیں تم نے ......اس موئے کمپوٹر نے تو تمہاری راتوں کی نیند چھین لی ہے......کبھی کبھی تو انٹرنیٹ پر ساری رات گزار دیتے ہو......کبھی ان بچوں سے بھی دل بہلا لیا کرو......اوپر والے نے دیئے ہیں تو اس کا شکریہ ادا کرو''۔

میں امی کی باتیں سنتا رہتا......میں اسے کیسے سمجھاتا کہ پڑھنے لکھنے کی وجہ سے ہی میں آج چار پیسے کمانے کے قابل ہوا ہوں، کمپوٹر پر دفتر کا کام کرنا ہوتا ہے......ڈاک خانے کے ذریعے خط لکھنے کا زمانہ ختم ہوا، انٹرنیٹ پر بیٹھنا ایک مجبوری ہے......اور یہ جو اوپر والے کی نعمت، یعنی پانچ پانچ بدمعاش ہیں، ان کے لیے کھانے پینے اور کپڑوں کا انتظام بھی تو کرنا ہے ......اتنی مہنگائی کے زمانے میں......اتنے بچے...... اور وہ بھی، تخریب کا عناصر......توڑ پھوڑ اور ہلہ گلہ کرنے والے شیطان ......''میں یہ سبھی کچھ اندر ہی اندر سوچتا رہتا اور خاموشی سے ان کا چہرہ دیکھتا رہتا۔

کئی بار دل میں خیال آتا کہ کچھ دن گھر چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں......ان سبھی سے جھگڑا کر کے، روٹھ کر کہیں بھاگ جاؤں، تب ان کو پتہ چلے گا ......تنخواہ کے پیسے بھی نہیں دوں گا۔ نہ کپڑے اور نہ ہی ضروریات کی دوسری چیزیں......کچھ دن میں ہوش ٹھکانے آجائیں گے تو شور شرابہ اور ہلہ گلہ بھول جائیں گے......اس کے بعد گھر میں امن وسکون اور

چین وشانتی ہوگی......تب یہ لوگ میرا مول جانیں گے اور میری قدر کریں گے......چنانچہ ایک دن دفتر سے لوٹنے کے بعد جب ان ننھے بدمعاشوں نے میرے کمرے میں رکھی چیزوں کو تہ وبالا کر کے رکھ دیا تھا اور کمپیوٹر کا key بورڈ توڑ دیا تھا......تو میں نے موقعہ غنیمت سمجھ کر اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی......بید کی نرم شاخوں سے تین بچوں کی خوب مرمت کی، بیگم ان کو بچانے آئیں تو ان کو بھی ایک دو ہاتھ......امی گھر پہ نہیں تھیں، ابا جان باہر کھیت میں تھے......بچوں کا رونا سنتے ہی اندر آگئے اور مجھ پر برس پڑے......میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا......کیونکہ مجھے روٹھ کر گھر چھوڑنے کا بہانہ چاہیے تھا......چنانچہ میں نے، گلاس اور پلیٹ دیوار پر دے مارے اور غصے کا اظہار کرتے ہوئے گھر سے باہر چلا گیا......

کئی دن تک اِدھر اُدھر دوستوں کے پاس مارا مارا پھرتا رہا......نہ کسی نے مجھے ڈھونڈا اور نہ فون کر کے میرے بارے میں معلوم کیا......دفتر بھی نہیں گیا اور دوستوں سے بھی کہہ دیا کہ کوئی ڈھونڈے تو بتا دینا کہ یہاں نہیں آیا......دو ہفتوں تک بھی جب کسی نے نہیں ڈھونڈا تو دل نے چاہا کہ واپس چلا جاؤں لیکن پھر خیال آیا......غیرت کا معاملہ ہے، دھمکی دے کر آیا تھا، یونہی کیسے چلا جاؤں ..... گھر کا مالک ہوں......میری اتنی بے قدری اور بے عزتی ......آخر سمجھتے کیا ہیں یہ لوگ خود کو......میری تنخواہ سے گھر چلتا ہے، سب کے سب، کام کے نہ کاج کے، دشمن اناج کے......لیکن کئی دن تک پریشان رہنے کے بعد ہتھیار ڈال دیئے......پھر یہ خیال آیا کہ اگر گھر والوں نے تھانے میں گمشدگی کی رپوٹ لکھوا دی تو......نہیں نہیں میرا بنا، بنایا کیریئر تباہ ہو جائے گا......خیریت اسی میں تھی کہ میں سرینڈر کرتے ہوئے، اپنی شرمندہ اور جھکی ہوئی گردن لے کر خود ہی اپنے تھیٹر، میرا مطلب اپنے گھر لوٹ آؤں......سو میں نے ایسا ہی کیا۔

گھر آنے کے بعد میں کئی گھنٹے تک اپنے کمرے میں بیٹھا رہا۔ سبھی نے مجھے آتے دیکھا تھا، امی جان کے بغیر کوئی میرے پاس نہیں آیا۔ اس نے بھی بس یونہی دروازے سے ہی خیر خیریت پوچھی، میں نے جواباً کہہ دیا کہ ٹھیک ہوں، بس یونہی

دوستوں کے پاس چلا گیا تھا،شام کو بیگم صاحبہ کمرے میں داخل ہوئیں تو ان کے لبوں پر چراغ کی سی روشن مسکراہٹ تھی، وہ سینما ہال... یعنی بیٹھک سے اٹھ کر آ رہی تھیں، جہاں وہ سب کئی گھنٹوں سے موج مستی اور ہنسی مذاق میں مصروف تھے ......
انہوں نے بے دلی سے میرا بستر ہ لگایا اور بتی بجھا کر سو گئیں ......میں کبھی انہیں آنکھیں موندھے انتہائی پرسکون انداز میں سوتے دیکھتا رہا اور کبھی اپنے دل و دماغ میں اٹھنے والی غصے اور ناراضگی کی لہروں کو سنبھالتا رہا......کم عقل اور بے فکر ہونا بھی کبھی کبھار کتنا اچھا ہوتا ہے.....موجودہ تناؤ، ڈر اور خوف سے لبریز ماحول میں ان لوگوں نے کتنے اچھے طریقے سے جینا سکھ لیا تھا......اور میں اندر ہی اندر کڑتا رہتا، غصے سے جلتا رہتا اور ان پر ناراض ہوتا رہتا......لیکن پھر مجھے بادشاہ اور فقیر کا وہ واقعہ یاد آتا جس میں ایک فقیر جب دوپہر کے وقت فصیلِ شہر کے قریب پہنچا تو اس نے دیکھا کہ شام ہونے سے قبل ہی شہر کے دروازے بند کر دیئے گئے ہیں، نہ تو کسی کو اندر سے باہر جانے دیا جا رہا ہے اور نہ ہی کسی کو باہر سے اندر آنے کی اجازت دی جا رہی ہے......ایک فقیر نے داروغۂ شہر سے شام ہونے سے پہلے فصیل اور دروازے بند کرنے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ بادشاہ کا شاہین گم ہو گیا ہے اس لئے شہر کے سبھی دروازے بند کر دیئے گئے ہیں، فقیر نے بات غور سے سنی اور پھر سوچنے لگا، بادشاہ کا شاہین گم ہو گیا ہے تو اس کے لئے دوازے بند کرنے کی کیا ضرورت تھی، شاہین کیا پیدل چل کر دروازں سے بھاگ جائے گا، وہ تو اڑنے والا جانور ہے، فقیر کو بادشاہ کے احمقانہ حکم پر سخت غصہ آیا اور پھر اس نے اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہا ''اوپر والا بھی کیسے کیسے کم دماغ احمقوں کو بادشاہ بنا دیتا ہے......اس کے پاس سوچنے کے لئے اتنی سی بھی عقل نہیں ہے......یہ اپنی رعایا کا کیا خیال رکھے گا......؟''فقیر نے ایک دانا آدمی کے سامنے اس بات کا ذکر کیا تو آدمی نے اسے پوچھا کہ اگر فقیر کو یہ بادشاہی دے دی جائے تو کیا وہ اس کے بدلے اپنی عقل بادشاہ کو دے سکتا ہے؟......

''نہیں......''...فقیر نے جواب دیا۔

بالکل اسی فقیر کی طرح میرا حال بھی غیر تھا.....ان حالات میں، میں اس تھیٹر نما گھر میں کیسے رہ سکتا تھا.....

بہر حال.....'لوٹ کے بدھو گھر کو آئے' کی مصداق میں بھی واپس آ کر خاموشی سے بیٹھا رہا۔اور اسی نوٹنکی کو اپنا گھر سمجھ کر حالات سے سمجھوتہ کرنے کی ٹھان لی۔

چند دن ، چند ہفتے اور چند مہینے گزرتے گئے .....دھما چوکڑی کے سمندر میں مدوجزر آتے رہے اور میں کبھی اندر ہی اندر ناراض ہوتا، غصہ آتا اور کبھی کسی کی پٹائی کر دیتا.....لیکن صورتحال بدلنے کا نام نہیں لے رہی تھی .....کئی بار خفاء ہوکر، لڑ جھگڑ کر گھر چھوڑا اور چند روز کے بعد پھر واپس لوٹ آیا..... گھر میں، تخریب کار عناصر کی سرگرمیاں جاری تھیں اور بڑے چھوٹے ان سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔میں روز روز کے اس شور شرابے سے چڑچڑا ہوتا جا رہا تھا۔بات بات پر غصہ آتا اور گھر والوں سے جھگڑا ہو جاتا.....اماں اور ابا کے ساتھ کئی بار بڑی ترش اور تلخ زبان میں بھی پیش آیا...بیگم کو بھی جھڑکا اور بچوں کے ساتھ ساتھ دو بھائیوں کی بھی پٹائی کر دی،ایک بھائی بشیر مجھ سے تین سال چھوٹا تھا اور اکثر میری بیگم یعنی اپنی بھابھی سے جھگڑتا رہتا تھا اور وہ اس کی شرارتوں کو چھوٹا دیور سمجھ کر معاف کر دیتی .....لیکن میرے سامنے بالکل نہیں بولتا تھا.....کبھی کبھار جب اسے پیسوں کی ضرورت ہوتی تو وہ میرے پاس آ کر بیٹھ جاتا اور تھوڑی دیر میرے ساتھ باتیں کر لیتا۔اس کے علاوہ اس گھر میں میری ہمدرد.....میری بیٹی .....شریفہ تھی،وہ اپنے نام کی طرح بہت شریف اور خاموش تھی اور سچ بتاؤں میں اس گھر میں اب تک موجود تھا تو محض شریفہ کی وجہ سے... باقی سب مطلب کے یار تھے..... پیسے لینے آتے اور پھر گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو جاتے لیکن شریفہ.....کسی پالتو بلی کی طرح میرے آس پاس گھومتی رہتی اور مجھے ہنسانے اور خوش کرنے کی کوشش کرتی لیکن میرا دل تو جیسے مر چکا تھا، مجھے قہقہوں اور قہقہہ لگانے والوں سے سخت چڑھ تھی ..... پھر بھی اس ننھے فرشتے میں اتنی طاقت تھی کہ وہ مجھے کبھی کبھار ہنسنے

پر ضرور مجبور کر دیتی ....ابا جان......تین سال پہلے ریٹائر ہو چکے تھے......وہ پٹواری تھے......
ملازمت کے دوران کشمیر کے کوہ و بیاباں ،شہر و دیہات میں گھومتے رہے ،قسم قسم کے
لوگوں سے ملنے جلنے کی وجہ سے وہ اپنی شخصیت کو نہ جانے کہاں گنوا بیٹھے تھے......امی جان
نے ابا کی ریٹائر منٹ کے دن جشن منایا تھا، ان کا کہنا تھا کہ اب انہیں پٹواری صاحب کے
لئے مہینوں مہینوں راستہ نہیں دیکھنا پڑے گا کیونکہ وہ ہمیشہ گھر پر ہی رہیں گے، ابا جان کی
فراغت کے بعد ان بزرگوں کا تو جیسے بچپن لوٹ آیا تھا...... انہوں نے ساری زندگی کی
بھڑاس نکالنے کے لئے میرے نصف درجن بچوں کے ساتھ مل کر گھر کا نقشہ ہی بدل
ڈالا تھا......لیکن میری نوکری کچھ ایسی تھی کہ نہ اس میں ٹرانسفر تھی اور نہ ہی پرموشن
......میں اپنا باس بھی خود تھا اور ملازم بھی خود۔

گھر کی اس ساری صورتحال سے پریشان ہو کر میں نے ایک دن ایک زبردست
منصوبہ تیار کیا میری پریشان کھوپڑی میں نہ جانے کہاں سے ایک خطرناک منصوبے کا نزول
ہوا اور اب اداکاری دکھانے کی میری باری تھی ، میں گھر والوں کو ایک زبردست سبق
سکھانا چاہتا تھا......ایسا سبق کہ جس سے یہ بھانڈ پاتھر ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے ، پورے
گھر میں امن چین اور سکون قائم ہو جائے ، خاموشی..سنسناتی خاموشی اور ویرانی ......ایسا
سناٹا کہ میں سب کے سینوں میں دھڑکتے دلوں کی آواز سن سکوں ، گھر کے باہر صبح صبح
خوبصورت پرندوں کے نغمے سن سکوں، تناؤ اور کشیدگی سے پاک ماحول میں ٹانگیں
پھیلا کر آرام سے سو سکوں اور آس پڑوس کے گھروں میں ہونے والے معاملات سے آگاہ
رہ سکوں ......میں نے مرنے کا ارادہ کر لیا......سچ مچ مرنے کا نہیں بلکہ صرف مرنے کا
ڈرامہ کرنے کا منصوبہ تیار کر لیا...... گھر کے آنگن میں ابا حضور کی پرانی جیپ مدت سے بند
پڑی تھی، ان کو یہ گاڑی میری امی سے بھی زیادہ عزیز تھی اور یہ کھٹارا میری آنکھوں میں سوتیلی
ماں کی طرح کھٹکتی تھی ......ابا حضور ہر دو تین دن بعد اس جیپ کو کپڑا مار کر چمکاتے رہتے
اور کئی بار اس کی مرمت کروانے کی بھی خواہش ظاہر کر چکے تھے لیکن میری ضد تھی کہ ہم کوئی

نئی اور جدید گاڑی خریدیں گے ......اور پھر میں نے اپنے منصوبے کی تکمیل کے لئے باتوں باتوں میں ابا سے کہہ دیا کہ میں جیپ کی مرمت کروا رہا ہوں، پہلے تو انہیں بمشکل ہی یقین آیا لیکن بالآخر مان گئے ......میں نے شہر سے ایک مستری کو بلایا اس نے کئی دن کی جانچ کے بعد شہر سے ضروری کل پرزے اور دیگر سامان منگوالیا اور تقریباً ایک ہفتے کے بعد ہماری مہندرا رانی سڑک پر فراٹے مارنے کے لئے تیار کھڑی تھی......

اتوار کی صبح تھی، میں نے جیپ سٹارٹ کر لی اور خاموشی سے ایک لمبی ڈرائیو پر نکل پڑا۔ سمتھن کی پہاڑی ہمارے گھر سے تیس کلومیٹر دوری پر تھی۔ میں نے تیزی سے سمتھن ٹاپ کے آخری موڑ پر گاڑی کو پہنچا کر منصوبہ بند طریقے سے ایک گہری کھائی میں دھکیل دیا۔ گاڑی میں اپنا کچھ سامان، کپڑے اور چند دوسری چیزیں رکھ دیں اور پھر اس کے ڈیزل ٹینکر کا ڈھکن کھول کر گاڑی کو نیچے دھکیل دیا، بالکل فلمی انداز میں......گاڑی ایک بڑے دھماکے کے ساتھ خاکستر ہوگئی۔ نیچے برنگی ندی بہہ رہی تھی ......اسی کے ساتھ ......میرے گھر والوں کے لئے میں مر گیا اور گاڑی تباہ ہوگئی......لاش نالے میں بہہ گئی اور خس کم جہاں پاک !لیکن سسپنس سے بھری ہندی فلم کی طرح ہیرو، یعنی میں صحیح سلامت، زندہ تھا اور یہاں سے میری زندگی کا ایک انتہائی سنسنی خیز دور شروع ہوا۔

دو دن تک ہمارے گھر والوں کو میرے لاپتہ ہونے کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی لیکن میں نے گھر سے اس کھٹارہ گاڑی میں نکلتے وقت کئی لوگوں اور جان پہچان والوں کو جان بوجھ کو ہیلو، ہائے ،السلام علیکم اور نمستے کہا تھا، اور بہت سے لوگوں کو جان بوجھ کر باور کرایا تھا کہ میں سمتھن کی طرف جا رہا ہوں۔ تیسرے دن گھر والوں کو میری گمشدگی کے بارے میں تشویش ہوئی ...... پولیس میں رپورٹ لکھائی گئی اور کئی دن کے بعد انہیں پتہ چلا کہ میری کھٹارا گاڑی موڑ سے گہری کھائی میں گر کر تباہ ہوگئی ہے۔ میرے کپڑے اور کچھ سامان وغیرہ جائے واردات سے برآمد کر لیا گیا اور لاش کو تلاش کرنے کے لئے پولیس اور لوگوں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن......زندہ انسان کی لاش کب اور کہاں ملتی ہے کہ

میری لاش ملتی...... کچھ دن کے بعد وہ سمجھ بیٹھے کہ میری لاش یا تو برنگی نالے میں بہہ گئی یا پھر کوئی درندہ اٹھا کر لے گیا... میں انتہائی احتیاط کے ساتھ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ایک خفیہ ٹھکانے پر چلا گیا اور چھپ کر بیٹھ گیا...... ادھر میرے گھر میری موت کا ماتم ہو رہا تھا اور ادھر میں اپنی کامیابی پر بہت خوش تھا...... اور پھر اس واردات کے تقریباً دس دن بعد شام کے وقت مکئی کی لمبی فصل میں سے چھپتے چھپاتے اپنے گھر میں داخل ہوا اور گھر کے اندر جو منظر دیکھا، وہ کچھ یوں تھا...... خاموش...... اُداس...... پریشان...... شہرِ خموشاں...... سویا سمندر...... میرا گھر...... کسی قبرستان کا منظر پیش کر رہا تھا...... ہر شخص لبوں پر پٹی باندھے ہوئے تھا...... گھر میں بجلی نہیں تھی، کمرے کے بیچوں بیچ ایک پرانا لالٹین روشن تھا...... کچھ رشتہ دار خاص طور پر میرے سسرال والے گھر میں موجود تھے...... امی اور ابو پر روتے روتے غشی کے دورے پڑ رہے تھے...... نصف درجن بچوں میں سے کوئی ایک کونے میں اور کوئی دوسرے کونے میں، غم سے نڈھال ہو کر پڑا ہوا تھا...... وہ بار بار ہچکیاں لے رہے تھے...... اور گھر میں موجود مہمان انہیں یتیم سمجھ کر ان کے سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے...... میری جان، شریفہ، میری بیٹی...... میں نے اسے بہت ڈھونڈا لیکن کہیں نہ ملی ...... شاید کہیں کسی بستر میں پڑی تھی...... اور ہماری بیگم صاحبہ اپنے والدین کے درمیان لیٹ کر موٹے موٹے آنسو بہا رہی تھیں...... چولہا بجھا ہوا تھا، ٹی وی اور ریڈیو بند تھا...... گھر کے سبھی کمروں پر تالے چڑھائے گئے تھے اور سبھی لوگ جمع ہو کر بیٹھک میں جمع تھے...... میری باتیں کر کر کے وہ لوگ آنسو بہا رہے تھے اور میں خاموشی سے ایک اندھیرے کونے میں چھپ کر یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ کئی بار دل میں خیال آیا کہ ابھی باہر نکل کر ان سبھی کو بتا دوں کہ میں زندہ ہوں، لیکن پھر خیال آیا

"نہیں...... ابھی نہیں...... کچھ دن اور مزہ لیتے ہیں"

ایک ماہ بعد...... میں پھر سے چھپتے چھپاتے گھر آ گیا...... میری بیوی کے چہرے پر ابھی تک افسردگی اور اداسی تھی لیکن وہ گھر کے کام کرنے لگی تھی...... والدہ چولہے کے سامنے

بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھی......اباجان اپنے کمرے میں تلاوت کر رہے تھے (میری روح کے سکون اور مغفرت کے لئے) شیطانوں کا جلوس منتشر تھا، کوئی ایک کمرے میں اور کوئی دوسرے کمرے میں...میرے دونوں بھائی......بشیر اور سعید امتحانات کی تیاری میں مصروف تھے......انہوں نے دھما کہ دار سپیکروں کی جگہ میوزک سسٹم میں ہیڈ فون لگائے تھے......اور شریفہ......کسی دیوانے عاشق کی طرح کبھی ایک کمرے میں اور کبھی دوسرے کمرے میں مجھے تلاش کر رہی تھی......میری جان......اسے دیکھ کر میری ہچکی لگ گئی اور میں خاموشی سے گھر سے چلا گیا......!!

اگلے تین ماہ کے دوران میں نے اسی طرح پھر کئی بار اپنے گھر کا خفیہ دورہ کیا اور ہر بار اپنے گھر والوں کو پہلے سے مختلف پایا......بشیر نے میرے محکمے میں درخواست دے کر میری جگہ، میرے بدلے یعنی میری پوسٹ پر نوکری حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی تو بھی میں خاموش رہا......سعید نے میری موٹر سائیکل کی سواری کرتے ہوئے اپنی ہم جماعتی نازیہ کو پچھلے سیٹ پر بٹھانا شروع کر دیا تو بھی میں خاموش رہا۔ ابو نے میرے کپڑے اور شال وغیرہ پہننا شروع کر دئے تو میں چپ رہا......بیگم صاحبہ نے بالوں میں کنگھی کر کے سجنا سنورنا شروع کیا تو میں نے پھر بھی صبر سے کام لیا اور......اس دوران ایک چیز بہت اچھی ہو رہی تھی......یعنی گھر......اب واقعی گھر لگ رہا تھا......نہ قہقہے، نہ توڑ پھوڑ، نہ شور وغل اور نہ ہی دھینگا مشتی......پانچوں شیطان خاموشی سے اپنی اپنی کتابوں میں سر دے کر پڑھنے لکھنے میں مصروف تھے......نہ ٹی وی، نہ ریڈیو اور نہ ہی کوئی اور تفریحی پروگرام..!

لیکن آج تو حد ہوگئی!

ابھی مجھے مرے ہوئے، میرا مطلب غائب ہوئے صرف چھ ماہ ہوئے ہیں لیکن یہاں تو پورے گھر کا ماحول ہی بدلا ہوا ہے......بچوں، یعنی پانچ شیطانوں کے شور وغل کو چھوڑ کر ہر چیز پھر سے اپنی اصل جگہ پر آرہی ہے، ابو اور امی اپنے کمرے میں موجود ہیں، بیگم صاحبہ نے نیا سوٹ پہن رکھا ہے، ان کے کپڑوں میں میرا دوبئ والا

عطر بھی لگا ہوا ہے جو پورے ماحول کو معطر کر رہا ہے۔ان کی سج دھج اور پہناوے سے بالکل نہیں لگتا کہ ابھی حال ہی میں ان کی زندگی کا سب سے بڑا سہارا چھن گیا ہے، گھر میں روشنی اور خوب گہما گہمی ہے......بشیر میری جگہ ملازم لگ گیا ہے،سعید نے نئی گاڑی خرید لی ہے والد صاحب میری نسواری رنگ کی شال اور اپنی قراقلی پہن کر بڑے انہماک سے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہیں اور امی اور ابو کی گفتگو کا ایک نمونہ پیش خدمت ہے!

''لڑکی جوان ہے ...... چھ بچوں کی ماں ہے تو کیا ہوا......ابھی زیتون کی ہم عمر لڑکیاں مہندی کی منتظر بیٹھی ہیں......گھر کی عزت گھر میں رہے گی ......اور بچوں کو بھی سہارا مل جائے گا'' امی ابو سے کہتی ہیں اور اب ابو کا جواب بھی سن لیجئے!

''بات تو صحیح ہے لیکن کیا بشیر اس بات کے لئے تیار ہو جائے گا......نئے زمانے کا لڑکا ہے پتہ نہیں اس نے اپنی شادی کے لئے کوئی لڑکی پسند نہ کر رکھی ہو......اس سے بھی تو پوچھنا ہے اور پھر زیتون......اس کی مرضی اور اس کے والدین کی مرضی بھی تو معلوم کرنی ہے''

لڑکا،لڑکی دونوں راضی ہیں......میں نے پتہ کر لیا ہے ......ان کے جھگڑے ختم ہو چکے ہیں اور وہ ایک دوسرے کی بہت عزت بھی کرنے لگے ہیں......وہ چھپ چھپ کر باتیں بھی کرتے ہیں......میں تو کہتی ہوں کہ اس سے پہلے کہ بات گھر سے باہر نکل جائے ......ہمیں اس پر پردہ ڈال دینا چاہئے ،پانچ بچوں کی ماں ہے زیتون...... بدنامی ہو سکتی ہے......''

''یہ بات ہے ......تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا......اوپر والے نے تو ہمارے سارے مشکل مرحلے ختم کر دیئے ہیں......اس سے بڑھ کر اور کیا خوشی ہو سکتی ہے ......'' ابو نے جواب دیا......

ادھر......میرے کمرے میں، جہاں میں اور میری بیگم نے کئی سال گزارے، میں نے اس کی ہر خواہش اور ہر چاہت پوری کی ......اسی کمرے میں اس نے ایک ایک کر کے پانچ بچوں کو جنم دیا اور میرے ساتھ عمریں گزارنے کی قسمیں کھائیں......

وہیں......وہ میرے بھائی اوراپنے دیور بشیر کے ساتھ پیار محبت کی باتیں کررہی ہے......آنے والی زندگی کے خواب سجارہی ہے اور میں بھوت بنا اندھیری جگہ میں الماری کی اوٹ میں دیکھ اور سن رہا ہوں......اگر یہ قیامت نہیں تو پھر قیامت اور کیا ہوسکتی ہے....؟

میں اپنے ہی بچھائے ہوئے جال میں بری طرح پھنس چکا ہوں،انہوں نے میرا ماتم منا کر مجھے فراموش کردیا ہے اور خود کو بدلے ہوئے حالات کے سانچے میں ڈال دیا ہے، ان کی آنکھوں میں آنے والے کل کی خوشیاں ہیں......مجھے اس گھر کا شور شرابہ پسند نہیں تھا، میں اسے شہر خموشاں بنانا چاہتا تھا لیکن میں بھول گیا تھا کہ گھر اور قبرستان میں زندگی اور موت کا ہی فرق ہوتا ہے...... گھروں میں بچوں کی شرارتیں،شور شرابہ ،بڑوں کے قہقہے اور ہلہ گلہ ہوتا ہے اور قبرستان میں خموشی اور صرف خموشی ہوتی ہے ......اور مجھے خموشی پسند تھی ......قدرت نے میرے نصیب میں خاموشی ،سکون اور چین لکھ دیا ہے اور میں بھی یہی مانگتا تھا......میرا یہ خیال بھی غلط تھا کہ یہ لوگ میرے بعد بھوکے مرجائیں گے ...... حالانکہ وہ مجھ سے بہتر طور کھاپی رہے ہیں ......میری وجہ سے گھر میں کتنا تناؤ رہتا تھا......آج یہاں کتنا سکون ہے......بچے پڑھ لکھ رہے ہیں اور بڑے پرسکون ہیں اس گھر میں میری کوئی جگہ نہیں......اگر میں لوٹ بھی آیا تو اول تو آدھے لوگ مجھے بھٹکی ہوئی آتما یا بھوت سمجھ کر ڈر سے مرجائیں گے اور دوم میری عزت دو ٹکے کی بھی نہیں رہے گی ......وہ میرے ......جانے کے صدمے سے باہر نکل رہے ہیں اور مجھے انہیں پھر سے غمزدہ کرنے کا کوئی حق نہیں،خاص طور پر بشیر اور میری پہلی بیگم صاحبہ ایک دوسرے سے پیار کرنے لگے ہیں......وہ میری موجودگی میں اس نئے رشتے کی وجہ سے ساری زندگی پریشان رہیں گے ......مجھے ان سب کو ان کے حال پر چھوڑ کر یہاں سے دور چلے جانا چاہیئے ......یا پھر اسی موڑ سے کود کر جان دے دینا چاہیئے ......یہی میرے اور ان کے حق میں بہتر ہوگا......اس الماری کے سائے میں میرا دم گھٹ رہا ہے اور آج ہی رات میں یہاں سے چلا جاؤں گا ...... ہمیشہ کے لئے ......ان سب کی دنیا سے

دور......یا پھر کسی شہرِ خموشاں کی طرف جہاں خاموشی ہو، سکوت اور سکون ہو، نہ شور ہو، نہ ہلہ گلہ اور نہ قہقہے......میرا کوئی بھی ٹھکانہ اب قہقہوں سے دور ہی ہوسکتا ہے.!!یا پھر کیوں نہ میں وہی کروں جو پہلے میں نے کیا تھا یعنی اُسی کھائی میں 'سمتھن کی پہاڑی' سے کود جاؤں، جہاں میں نے پہلے بھی کودنے کا ڈرامہ کیا تھا....ایک ہی بار، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سارا جھگڑا ہی ختم ہو جائے گا.....'' یہ سوچ کر میں نے ایک بار پھر اپنی گاڑی کا ایکسیلیٹر دبایا اور ہوا سے باتیں کرتا ہوا دوڑنے لگا، آج مجھے کوئی پرواہ نہیں تھی، چاہے میں کسی چٹان سے ٹکرا جاؤں یا پھر کوئی میری گاڑی سے ٹکرا جائے...گاڑی دوڑتی گئی، رفتار بڑھتی گئی، اچانک گہری کھائی نظر آئی اور میری گاڑی، مجھے لے کر ایک گہرے نالے میں لُڑھک گئی، ایک دو پلٹے کھانے کے بعد میں جب اُٹھا تو دیکھا کہ....سارا جسم پسینے میں شرابور، سانس تیزی سے رواں، بدن میں تھرتھراہٹ اور دل و دماغ پر گہرے خوف کے سائے....آنکھ کھُل چکی تھی.....اور ایک بھیانک مگر طویل خواب چکنا چور ہو چکا تھا....!!

...........☆☆☆...........

ڈاکٹر ریاض توحیدی

نام :ریاض احمد بٹ

قلمی نام :ڈاکٹر ریاض احمد توحیدی

تاریخ پیدائش :یکم دسمبر ۱۹۷۳ء وڈی پورہ، ہندوارہ کشمیر

تعلیم :پی۔ایچ۔ڈی (اردو)،

تصانیف :(۱) جہانِ اقبال......۲۰۱۰

(۲) کالے پیڑوں کا جنگل......۲۰۱۱ (افسانوی مجموعہ)

پتہ :خرمن، وڈی پورہ ہندوارہ کشمیر

فون نمبر 7906834877

ڈاکٹر ریاض توحیدی

دوشالہ

خوجہ کاک کی امیدوں پر جیسے اُوس پڑی ہوئی تھی۔ ریشم خانہ چلانے کے لئے ایک تجربہ کار کاریگر کی ضرورت ہوتی ہے اور کوئی ڈھنگ کا کاریگر نہ ملنا خواجہ کاک کے لئے سوہانِ روح ثابت ہو رہا تھا۔ اُس کی حسرت بھری آنکھیں کارخانے کی بے کار مشینوں کو تکتے تکتے پتھرا سی گئی تھیں۔ چار کمروں والا معمولی سا مکان تک گروی رکھ کر اُس نے بنک سے جو قرضہ لیا تھا، سال بھر بیت جانے کے باوجود بھی وہ بنک کے قرضہ کا ایک فیصد بھی ادا نہ کر پایا تھا۔ دوسرے مل مالکوں کی کامیابی کے مقابلے میں اپنی تجارت کی ناکامی نے اُس کے ذہن میں ایک ایسا تناؤ پیدا کیا تھا کہ وہ اکثر بیوی بچوں کے ساتھ فضول میں لڑتا جھگڑتا اور کبھی کبھی خودکشی کرنے کے بُرے خیالات بھی اُس کی سوچ کو گھیر لیتے جو بھی بیوپاری ایک مرتبہ اُس کے کارخانے سے مال خرید لیتا تو نفع کے برعکس نقصان اُٹھانے کی وجہ سے وہ دوبارہ اُس کے کارخانے کا منھ تک دیکھنا گوارا نہ کرتا۔ کافی عرصہ بیت جانے کے بعد جب ایک دن بنک کے کرمچاری پولیس لے کر خوجہ کاک کے گھر میں نمودار ہوئے اور اُسے بیوی بچوں سمیت گھر سے بے دخل کرنے لگے تو یہ خبر سنتے ہی بستی کے لوگ وہاں جمع ہوگے۔ کافی منت سماجت کرنے کے بعد بستی کا ایک غریب ہمدرد شخص ریشم چاچا بنک کرمچاریوں سے چند مہینے کی مہلت دینے پر راضی کر گیا۔ آفت تو ٹل گئی لیکن خوجہ کاک گھر کی دہلیز پر غمگین صورت بنائے سر جھکا کر اپنی قسمت کو کوسنے لگا۔ ریشم چاچا اُس کی ہمت باندھے ہوئے اُسے ہاتھ پکڑ کر کارخانے کی جانب لے گیا۔ ریشم چاچا کارخانے کا بغور مشاہدہ کر کے بول پڑا۔

خوجہ کاک! آپ نے فضول میں پریشانی کو گلے لگایا ہے خدا پر بھروسہ رکھو وہ

سب کچھ ٹھیک کردے گا۔"

"بھروسہ تو خدا پر ہی ہے" خوجہ کاک سرد آہ بھر ہوئے کہنے لگا لیکن کارخانے کی ناکامی نے مجھے کہیں کا نہ رکھ چھوڑا"۔

"کوئی بات نہیں" ریشم چاچا اُس کے کندھوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہنے لگا "اگر خدا نے چاہا تو تیرا کارخانہ دن دُگنی رات چوگنی ترقی کریگا"

"لیکن وہ کیسے" خوجہ کاک ریشم چاچا کا منہ تکتے ہوئے پوچھ بیٹھا۔

"تم صرف ایک کام کرو" ریشم چاچا اُسے دلاسہ دیتے ہوئے بول پڑا۔ "کل کارخانے کی صفائی سُتھرائی کرانا اور دس دِنوں تک ریشم منگوالینا"۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن......!"

"میں تیری بات سمجھتا ہوں"۔ ریشم چاچا نے بیچ میں بولتے ہوئے کہا۔ "تمہارا کارخانہ میں چلاوں گا"۔

یہ غیر متوقع خوشخبری سنتے ہی خوجہ کاک کے چہرے پر بشاشت پھیل گئی اور اُس نے یہ کہتے ہوئے ریشم چاچا کو گلے لگایا کہ تمہارا یہ احسان میں زندگی بھر نہیں بھول پاونگا"۔

ریشم چاچا ریشمی دوشالے بننے کا ایک تجربہ کار کاریگر تھا۔ یہ ریشمی دوشالے بنانے میں اتنا ماہر تھا کہ لوگ اُسے اُس کے اصلی نام کے بجائے ریشم چاچا کے نام سے ہی یاد کیا کرتے تھے۔ خوجہ کاک نے اگرچہ کئی مرتبہ ریشم چاچا سے کہا بھی تھا کہ وہ اگر اُس کے کارخانے میں کام کرے گا تو وہ اُسے دُگنی تنخواہ دے گا، لیکن ریشم چاچا یہ کہہ کر ہمیشہ انکار کرتا رہتا کہ وہ اپنے مالک کے ساتھ چند پیسوں کے بدلے دھوکہ نہیں کرسکتا۔ برسوں سے وہ جس آدمی کا کارخانہ سنبھالتا آیا ہے وہ اُس کا بھروسہ نہیں توڑ سکتا۔

ریشم کے دوشالے بنانے میں ریشم چاچا کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ یہ اُس کا خاندانی پیشہ تھا جن لوگوں کے ہاں بھی اُس نے کام کیا تھا۔ ان کے گھروں میں ریشم چاچا کی کاریگری سے چاندی ہی چاندی دکھائی دے رہی تھی لیکن ریشم چاچا کی قسمت میں دوسرے

سینکڑوں کاریگروں کی طرح دو وقت کی روٹی کے سوا کچھ نہ لکھا ہوا تھا۔ ریشم چاچا جس بستی میں رہتا تھا وہاں کے سب لوگ ریشم کے کارخانوں میں کام کرتے تھے۔ اسی مناسبت سے اُس بستی کا نام ریشم آباد پڑا تھا۔ بستی صرف ریشم آباد نام کی تھی اصل میں وہاں غریبی اور ناداری کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ یہ لوگ مہد سے لے کر لحد تک ان کارخانوں میں محنت مزدوری کرتے رہتے اور اس کا معاوضہ بس اتنا تھا کہ گھر کا چولھا ٹھنڈا ہونے سے بچ جاتا۔ دوسری جانب فیکٹریوں کے مالک ان لوگوں کی محنت کے بل پر عیش وعشرت کی زندگی گزارتے رہتے۔

چند دنوں کے بعد ریشم چاچا نے خوجہ کاک کے کارخانے کا کام سنبھال لیا۔ اُس کے کام سنبھالتے ہی خوجہ کاک کی قسمت چمک اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے مال اتنا بکنے لگا کہ جو لوگ کل تک خوجی کاک کے مِل کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے وہی اب مال کے لئے ایڈوانس بکنگ کروانے لگے۔ خوجہ کاک کے گھر میں دولت کی ریل پیل اتنی بڑھ گئی کہ بنک کا سارا قرضہ سود سمیت ادا کرنے کے علاوہ وہ ایک بڑی جائیداد کا بھی مالک بن گیا۔ لوگ بڑی حیرانی کے ساتھ ایک دوسرے کے سامنے اُس کی دولت وحشمت کا تذکرہ کرتے رہے۔

خوجہ کاک ایک شاندار گاڑی میں مِل کی طرف جاتا تھا اور ریشم چاچا کے ساتھ دن بھر کے تجارتی معاملات پر صلح مشورہ کرتا رہتا۔ ایک دن اُس نے ریشم چاچا کو دو عدد ریشمی شال بنانے کے لئے کہا۔ شال بنانے کے بعد جب ریشم چاچا نے اُس کی خدمت میں پیش کئے تو خوجہ کاک نے ایک شال ریشم چاچا کو دیتے ہوئے کہا کہ یہ تم اپنی بیٹی کے لئے رکھنا، شادی کے دن کام آئے گا۔ ریشم چاچا حیرانی اور خوشی کے ملے جُلے تاثرات کے ساتھ کہنے لگا۔

''خوجہ صاحب! یہ قیمتی شال ہے میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہے''۔

آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں''۔ خوجہ کاک اپنایت کے لہجے میں کہنے لگا۔

''آپ کی بیٹی مجھے اپنی بیٹی جیسی ہے اور کارخانے کے اصل مالک تو آپ ہیں۔''

بہر حال ریشم چاچا آگے کچھ نہ بول سکا اور وہ شال لے کر گھر چلا گیا۔ کئی برسوں تک کارخانے میں کام کرتے کرتے ریشم چاچا کے آنکھوں کی بینائی میں فرق آنے لگا۔ ایک دن جب وہ کپڑے بننے کی مشین چلا رہا تھا تو اچانک اُس کا ہاتھ مشین کی زد میں آکر کٹ گیا۔ کئی مہینوں تک اسپتال میں ایڈمٹ رہنے کے باوجود بھی وہ ٹھیک نہ ہو سکا۔ روز بروز جب وہ کمزور ہوتا چلا گیا تو ایک دن ڈاکٹروں نے اُس کی بچی سے کہا کہ وہ پچاس ہزار روپیے کا انتظام فوری طور پر کرے تا کہ ریشم چاچا کا آپریشن ہو سکے۔ بیٹی کو پریشان دیکھ کر ریشم چاچا نے اُسے خوجہ کاک کے پاس بھیجا۔

''بیٹی کیسے آنا ہوا؟'' خوجہ کاک نے پوچھا۔

''خوجہ کاکہ''! ریشم چاچا کی بیٹی آنسو بہاتے بہاتے بول پڑی۔ ''بابا کا آپریشن کروانا ہے اس کے لئے پچاس ہزار روپیے درکار ہے''۔

''پچاس ہزار'' خوجہ کاک حیرانی کے ساتھ بول پڑا ''دیکھو بیٹی! یہ تو بڑی رقم ہے۔ اوپر سے اپنی بچی کی شادی کے دن بھی قریب آرہے ہیں جس پر بہت سے پیسے صرف ہو رہے ہیں''۔

''خوجہ کاکہ'' ریشم چاچا کی بیٹی منت سماجت کرنے لگی'' ''آپ کے بغیر ہم کس کے پاس جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر کہہ رہے تھے کہ اگر جلدی آپریشن نہ ہوا تو بابا کی جان کو خطرہ ہے''۔

''اس وقت پیسوں کا انتظام نہیں ہو سکتا ہے'' خوجہ کاک نے تُند خُوئی سے جواب دیا ''البتہ بچی کی شادی کے بعد دیکھا جائے گا''۔

ریشم چاچا کی بیٹی ٹوٹے قدموں وہاں سے واپس لوٹی۔ اسپتال پہنچ کر وہ بابا کے بیڈ کے پاس بیٹھ گئی۔ ریشم چاچا کے پوچھنے پر جب اُس نے خوجہ کاک کی دل توڑنے والی بات بتائی تو ریشم چاچا نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا ''بیٹی! ہماری قسمت میں ریشم کی گانٹھ پڑی ہے''۔

ڈاکٹروں نے چک اَپ کرنے کے بعد یہ کہتے ہوئے ریشم چاچا کو اسپتال سے

رخصت کردیا کہ جب پیسوں کا انتظام ہوجائے گا تو اُسے دوبارہ ایڈمٹ کرانا۔ ریشم چاچا کے جسم میں انفکشن زہر کی طرح پھیلتا گیا اور چند دنوں تک اس زہر نے پھیلتے پھیلتے اُس کی زندگی کا خاتمہ کرڈالا۔

خوجہ کاک کے گھر میں شادی کی تقریب بڑی دھوم دھام سے چل رہی تھی۔ سینکڑوں مہمان دعوت کا مزہ لے رہے تھے۔ دولہے کے استقبال کے لئے صحن میں قالین بچھائے جارہے تھے۔ ریشم چاچا کی بیٹی پرانے کپڑوں میں وہاں پہنچ گئی۔ اُس کے ہاتھوں میں قیمتی شال تھا۔ خوجہ کاک اپنی بیٹی کو جہیز میں دینے والی دس لاکھ کی گاڑی کا سنگار کرانے میں لگا ہوا تھا۔ ریشم چاچا کی بیٹی نے آنسو بہاتے بہاتے خوجہ کاک کی گود میں ریشمی دوشالہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"آئے امیر خوجہ کاک! مجھے ریشمی شال کے بدلے اپنے غریب بابا کے کفن کے لئے پیسے چاہیے"

سرما کی ہواؤں میں ہے عریاں بدن اُس کا
دیتا ہے ہنر جس کا امیروں کو دوشالہ

............☆☆☆............

ناصر ضمیر

نام	:ناصر امین
قلمی نام	:ناصر ضمیر
تاریخ پیدائش	:یکم جنوری ۱۹۷۰ء سوپور کشمیر
تعلیم	:ایم۔اے (اُردو)
پتہ	:محلّہ جامع قدیم سوپور، کشمیر
فون نمبر	9419031183

☆......ناصر ضمیر

اپنی بستی اپنے لوگ

کچھ لوگ زمانے میں عجب سے روگ پالے ہوئے ہوتے ہیں۔

کچھ ایسا ہی ماسٹر جی کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ میں جب بھی اپنی بھاگ دوڑ بھری زندگی میں صبح سویرے آٹھ بجے کی گاڑی پکڑنے کے لئے جلدی جلدی تیار ہو کر وقت پر ڈیوٹی پہنچنے کی غرض سے گھر سے نکلتا، باہر سامنے گلی میں یا پھر آگے نکڑ پر ماسٹر جی کا ملنا میرے معمول میں شامل تھا۔ وہ اکثر رشید ہیر کٹنگ شاپ کی دکان کے نزدیک یا پھر مشتاق ٹیلرنگ کی دکان کے تھڑے پر محلّہ کے کسی ہم عمر بڑے بزرگ سے بات کرتے ہوئے نظر آتے۔ میں انہیں دیکھتے ہی ان کے نزدیک جا کر ادب سے سلام کرتا، وہ میری طرف مسکرا کر دیکھتے، سلام کا جواب دیتے اور کہتے کیوں بیٹا آفس جا رہے ہو۔ جاؤ اللہ نگہبان ہے۔ میں ان کی دعائیں لے کر آگے بڑھ جاتا۔ کبھی کبھار ان کی اور ان کے گھر والوں کی خیریت بھی پوچھتا۔

ماسٹر جی کے گھر کے ساتھ میرے قریبی تعلقات تھے وہ اس لئے کیونکہ میری دوستی ان کے اکلوتے بیٹے انور کے ساتھ تھی۔ انور اور میں محلّہ کے پرانے سکول سے لے کر کالج تک ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ انور نے پڑھائی ختم کر کے بزنس میں دلچسپی لی اور میں نے ایک قلیل رقم کے عوض اپنی آزادی گروی رکھ کر سرکاری نوکری کر لی۔ انور کی محنت اور تقدیر نے قلیل مدت میں ہی رنگ دکھانے شروع کر دیئے۔ بہت کم مدت میں انور نے کافی روپے پیسے کمائے، شادی کر ڈالی، ایک اچھی سی گاڑی خریدی اور سِول لائنز ایریا میں

ایک اچھی سی کالونی میں نیا مکان بھی بنا ڈالا۔ انور نے اپنے والد یعنی ماسٹر جی، ماں، بیوی اور اکلوتے بیٹے سمیت تقریباً چھ مہینے پہلے نئے مکان میں شفٹ کیا۔ مگر حیرانگی کی بات جو تھی وہ یہ کہ ان چھ مہینوں میں شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہوگا جب ماسٹر جی اپنے محلے میں نظر نہ آئے ہو۔ حیرانگی اس لئے بھی کیونکہ ابھی محلے والے صبح سویرے اپنے گھروں میں ہی ہوتے کہ ماسٹر جی محلے کی گلیوں میں ایک تھیلہ ہاتھ میں لئے چہل قدمی کرتے ہوئے نظر آتے اور جب محلے والے گھروں سے نکلنا شروع کرتے تو ماسٹر جی کو سفید کرتہ پاجامہ، بھوری رنگ کی صدری اور کالا موٹا چشمہ پہنے ہوئے گلی میں یا نکڑ پر کسی بند دکان کے تھڑے پر موجود پاتے اور اگر ٹھنڈ ہوتی تو ایک لمبا سا فرن پہنے ہوئے نظر آتے اور پھر جب کوئی سوال کرتا ماسٹر جی خیریت تو ہے صبح سویرے یہاں کیسے تو ہر بار اطمینان کے ساتھ نئی نئی وجہ بتاتے۔

ایک دفعہ رشید نائی نے پوچھا ماسٹر جی کچھ خریدنے آئے ہیں کیا؟

تو ماسٹر جی نے جواب دیا

بھئی رشید کل پتہ نہیں گھر والے کہاں سے ساگ لے آئے تھے بیچاری بہو نے بڑی محنت سے پکایا تھا مگر ایک دم بے مزہ ساگ تھا۔ بھئی ماننا پڑے گا قل دید کی سبزی کی بات ہی کچھ اور ہے خاص کر ساگ کے تو کیا کہنے انسان کھائے تو انگلیاں چاٹتے رہ جائے۔ ایک بار میں نے ماسٹر جی سے پوچھا کیوں ماسٹر جی قل دید سے سبزی خریدنے آئے ہیں کیا؟ تو بولے ارے نہیں نہیں تمہارے دوست کو اتنی فرصت کہاں کہ گھر کے لئے کوئی چیز خریدے۔ آج گھر میں سب کا من چاہا کہ مچھلی کا سالن پکایا جائے تو میں نے سوچا چلو غلہ ڈار سے مچھلیاں لے آئیں۔ ہمارے غلہ ڈار کی مچھلیوں کا بھلا جواب ہے کہیں۔

غلہ کاک کی مچھلیوں کا ذکر چھڑتے ہی میرے منہ میں بھی پانی آ گیا۔ یہ سب باتیں اب روز کا معمول تھیں۔

لیکن کچھ دنوں سے ماسٹر جی کے چہرے پر عجیب سی اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ میں خود بھی پریشان ہو گیا آخر کیا سبب ہے کہ ماسٹر جی اس طرح اُداس نظر آتے ہیں۔ پھر ایک دن

میں گھر کے صحن میں کھڑے کھڑے پتہ نہیں کن سوچوں میں گُم تھا۔ میں نے دیکھا صحن کے اد کھلے مین گیٹ کے باہر ماسٹر جی ہمارے گھر کو لگاتار گھور رہے ہیں۔ میں جلدی جلدی گیا اور ماسٹر جی سے کہا

چلیئے ماسٹر اندر آیئے کچھ کھا پی لیجئے۔

میری آواز سُن کر جیسے نیند سے جاگ گئے۔ کیونکہ وہ کسی خاص گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

نہیں نہیں بیٹا میں اندر نہیں آؤں گا میں تو تمہارے گھر کی ڈب (دالان) کو دیکھ رہا تھا۔ تمہارے والد مرحوم اللہ انہیں جنت نصیب کرے، وہ اور میں اس ڈب پر اکثر گھنٹوں بیٹھتے، نمکین چائے کی چسکیاں لیتے اور جہاں بھر کی باتیں کرتے۔ باتیں، بے شمار باتیں، کبھی ختم نہ ہونے والی باتیں۔ تمہارے والد کو بچوں سے کتنی محبت تھی اور محلے کے سبھی بچے اسے پیار سے بب جان، بب جان کہہ کر پکارتے۔ آج اس ڈب پر جب نظر پڑی تو قدم خود بخود رُک گئے اور پرانے دن یاد آ گئے۔ تمہاری والدہ اسی ڈب پر خزاں کے موسم میں ہری سبزیاں سکھاتیں خاص کر ٹماٹر اور شلغم اور پھر یہی سبزیاں سردیوں میں کھانے کے لئے پڑوسیوں میں بانٹتی پھرتی۔ ایک لمبی آہ بھر کر ماسٹر جی نے کہا اچھا رہنے دو یہ سب پرانی باتیں ہیں میں اب چلتا ہوں۔

ماسٹر جی ابھی جانے ہی والے تھے کہ میں نے آگے بڑھ کر اُن کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہاتھوں میں لیا اور ہمت جُٹا کر پوچھا ماسٹر جی سچ بتایئے، آخر بات کیا ہے؟

میرے اِستفار سے وہ سوچ میں ڈوب گئے چہرہ کچھ اور اُتر گیا اور میری بات کو ٹالنے کی کوشش کرتے ہوئے بولے۔

کیا بات؟ کون سی بات؟ کچھ بھی تو نہیں۔

دیکھیئے ماسٹر جی میں بھی تو آپ کا بیٹا ہوں۔ کہیئے نا کیا بات ہے۔ کچھ دنوں سے آپ بے حد مایوس نظر آ رہے ہیں۔ آپ کی طبعیت تو ٹھیک ہے نا

طبیعت تو ٹھیک تھی لیکن شاید.................

کیا مطلب؟

بیٹا سچ کہوں تو میرا نئے گھر اور نئی کالونی میں جی نہیں لگتا۔ وہاں کچھ بھی تو نہیں۔ نہ اپنی بستی، نہ اپنے لوگ، نہ اپنا پن، نہ شادمانیاں، نہ کوئی چہل پہل اور نہ کوئی رونق۔ وہاں لوگ اپنے مرمر کے محلوں میں قید ہو کر رہتے ہیں۔ وہاں صرف خاموشی روشن رہتی ہے، ہر سُو سناٹے چھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ بیٹا تم یقین نہیں کرو گے وہاں جب چاند چمکتا ہے تو اس کی روشنی پھیکی ہوتی ہے اور جب دھوپ پھیلتی ہے تو وہ بھی اُداس اُداس سی ہوتی ہے۔ میں نے اپنی زندگی کے ساٹھ سال اپنی بستی میں لوگوں کے درمیان گزارے۔ فتح محمد، محمد رمضان، ماسٹر سلام الدین اور تمہارے والد کے ساتھ زندگی کے سکھ دکھ کے لمحات مل بانٹ کر گزارے۔ اب اس عمر میں نئی بستی اور نئے لوگوں کے درمیان بالکل اجنبی پن محسوس ہوتا ہے۔

ماسٹر جی کی آواز رُندھنے لگی اور پھر دھیرے دھیرے بالکل بچوں کی طرح رونے لگے اور روتی ہوئی آواز میں کہنے لگے مجھے اپنا گھر، اپنی بستی اور اپنے لوگ بے حد یاد آتے ہیں۔ میں نے انہیں دلاسہ دیتے ہوئے کہا یہ تنہائی اور اپنے رشتوں سے دوری کا غم فقط آپ ہی کا حصہ نہیں ہے بلکہ ہم سب اسی غم کے حصے دار ہیں۔ رشتوں کا سورج ابھی بھی چمکتا ہے یہ الگ بات ہے اب اس میں حرارت نہیں ہوتی۔

تم ٹھیک کہتے ہو بیٹا لیکن وہاں پہنچتے ہی میرا من بھاری ہو جاتا ہے پھر رات کانٹوں کے بستر پر کاٹ کر صبح سویرے یہاں واپس لوٹ آتا تھا۔ لیکن اب انور نے یہاں آنے کے لئے روک لگا دی ہے۔ کہتا ہے کہ اگر کوئی دیکھے گا کہ اتنے بڑے بزنس مین کا باپ دکانوں کے تھڑوں پر بیٹھے گپ مارتا ہے تو میری کیا عزت رہ جائے گی۔

میں نے پھر ایک سوال کیا

آپ اماں جی کو ساتھ لے کر یہیں واپس رہنے کے لئے کیوں نہیں آتے؟

میں نے انور سے کہا تھا لیکن کہتا ہے اس طرح وہ سوسائٹی میں بدنام ہو جائے گا

اور سب لوگ کہیں گے کہ انور نے اپنے بوڑھے ماں باپ کو اکیلے چھوڑ دیا اور بیٹا اب وہ پرانا گھر بھی تو نہیں رہا۔ انور نے زبردستی اسے بھی بیچ ڈالا۔

حالانکہ پرانے گھر کے پاس میں چند گز کی زمین ابھی بھی میری ہے۔ میں نے وہ بیچی نہیں۔

ماسٹر جی اگر آپ اجازت دیں تو میں انور سے بات کرتا ہوں۔

نہیں نہیں بیٹا، وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولے جو انور اس بستی میں ان گلیوں میں کھیلتے کودتے بڑا ہو گیا اب وہی انور ڈاؤن ٹاؤن کے نام سے بھی چڑتا ہے۔

میں ماسٹر جی کی حالت دیکھ کر بے حد پریشان ہوا یہاں تک کہ میری بھی آنکھیں نم ہوئیں۔

پر اب کیا ہوگا؟ اس مسئلے کا کوئی حل............

حل نکلے گا بیٹا اور ضرور نکلے گا۔

میری آنکھیں تجسُس کے مارے اور کھل گئیں

وہ کیسے؟

میرے پاس ایک ترکیب ہے۔

ترکیب!

میں نے حیرت سے پوچھا۔

ہاں اللہ نے چاہا تو میں واپس ضرور آؤں گا۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا، اس لئے پوچھ بیٹھا، لیکن ترکیب ہے کیا؟

ماسٹر جی اعتماد کے ساتھ بولے، وقت آنے پر پتہ چل جائے گا۔ ہاں البتہ اتنا ضرور کہوں گا۔ پیڑ اپنی جڑوں سے کٹ کر باقی نہیں رہتا۔ اتنا کہہ کر ماسٹر جی اپنے سینے میں غم کا طوفان لئے بوجھل قدموں سے رخصت ہوئے۔

ماسٹر جی کی پریشان حالت دیکھ کر میں دو دن تک سو نہ سکا۔ صرف ماسٹر جی

کے بارے میں سوچتا رہا، جس کے پاس سب کچھ ہو کے بھی کچھ نہیں تھا۔

کچھ دنوں کے لئے مجھے دفتر کے کام کے سلسلے میں شہر سے باہر جانا پڑا۔ تقریباً بیس پچیس روز کے بعد جب میں واپس لوٹا تو ماسٹر جی کے پرانے گھر کے سامنے ان کی خالی پڑی زمین پر مجھے ایک قبر دکھائی دی۔ میں ابھی اسی پریشانی میں تھا کہ یہ قبر کس کی ہے کہ فتح چاچا آئے اور مجھے گلے لگا کر کہا بیٹا غضب ہو گیا ماسٹر جی چل بسے۔

کیا؟

میرے حلق سے جیسے چیخ نکل گئی۔

ہاں بیٹا

لیکن کب؟

بس کچھ ہی روز پہلے۔

ماسٹر جی نے مرنے سے پہلے یہ وصیت بڑی تاکید کے ساتھ کی تھی کہ انہیں پرانے گھر کے سامنے اس خالی زمین میں دفنا دیا جائے۔ پھر وہی کیا گیا تمام محلے والوں نے انہیں اشک بار آنکھوں سے یہاں سپردِ خاک کیا۔

میں بے حد اُداس ہوا اور میری آنکھیں چھلک پڑیں۔ میں نے ماسٹر جی کی قبر پر بوسہ کیا اور دبے ہونٹوں سے کہا ماسٹر جی آخر آپ کی ترکیب کامیاب ہو ہی گئی۔ آپ نے بالکل سچ کہا تھا۔

''پیڑ اپنی جڑوں سے کٹ کر باقی نہیں رہتا''۔

............☆☆☆............

طارق شبنم

نام :طارق احمد شیخ

قلمی نام :طارق شبنم

تاریخِ پیدائش :۱۹۷۰ء اجس بانڈی پورہ کشمیر

تعلیم :ڈپلوما اِن ہارٹی کلچر

پیشہ سرکاری ملازم

پتہ :اجس بانڈی پورہ کشمیر

فون نمبر 9906526432

ای۔میل tariqs709@gmail.com

❖

☆......طارق شبنم

اعتبار

اپنے کمرے کے درو دیوار اس کو جیسے کاٹنے کو دوڑ رہے تھے۔ کمرہ روشن ہونے کے باوجود وہاں جیسے تاریکی اور خاموشی باہوں میں باہیں ڈالے اونگھ رہی تھی۔ شیشے کی الماری میں سجی ڈھیر ساری کتابیں جو اس کی زندگی کا قیمتی سرمایہ ہیں، دیکھ کر اسے اکتاہٹ اور گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کتابوں نے ہی اس کے ساتھ دھوکہ کیا ہے کہ اس کی زندگی کے سارے حسین خواب ٹوٹ کر بکھر گئے۔

برسوں بعد آج اس کے دل کے خاموش تاروں کو نہ جانے کس نے چھیڑ دیا کہ اس کے وجود میں ہلچل مچ گئی۔ دل کے کسی نہاں خانے میں دبی چنگاری دہک اٹھی اور ذہن کے دریچوں میں ماضی کی حسین اور تلخ یادیں فلم کے سین کی طرح چلنے لگی۔ تذبذب اور بے چینی سے چھٹکارہ پانے کے لئے وہ لحاف اوڑھ کر بستر میں دُبک گیا لیکن نیند کی دیوی جیسے اس سے روٹھ گئی تھی۔ لاکھ کوشش کے باوجود بھی وہ ماضی کی یادوں کو ذہن سے محو نہیں کر سکا۔ اسے رہ رہ کے مہوش اور اس کے ساتھ گزارے ہوئے بچپن کی بے فکری کے سہانے دنوں کی یادیں تڑپانے لگی۔

ماجد اور مہوش آپس میں نہ صرف نزدیکی ہمسائے تھے بلکہ دونوں نے بچپن سے جوانی تک کا سفر ہنستے کھیلتے اکٹھے طے کیا تھا۔ پہلے سکول اور پھر کالج میں دونوں ہم جماعت ہونے کے سبب ایک دوسرے کے گہرے دوست بن گئے۔ ماجد مہوش سے کچھ زیادہ ہی ذہین اور ہوشیار تھا اور پڑھائی میں بے لوث طریقے سے مہوش کی مدد کیا کرتا تھا۔ مہوش بھی

ماجد کی اس ادا کی قدر کرتی تھی اور ہر لمحہ اس کو خوش دیکھنا چاہتی تھی۔ پڑوسی ہونے کے ناطے دونوں کے گھر والوں کے تعلقات بھی کافی اچھے تھے۔ اس ماحول میں ہر گزرتے دن کے ساتھ مہوش اور ماجد کی دوستی گہری سے گہری ہوتی گئی۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی ان کی دوستی کب اور کیسے پیار میں بدل گئی انہیں پتہ بھی نہیں چلا۔ کالج میں قدم رکھتے ہی دونوں نے کھل کر ایک دوسرے سے پیار کا اظہار کر دیا اور عشق و محبت کی پینگیں بڑھانا شروع کر دی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے عشق نے جنون کی صورت اختیار کر لی اور دونوں پیار کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں غوطہ زن ہو کر ایک دوجے پر فدا ہونے لگے۔ ایک پل کی جدائی بھی انہیں کسی بڑے سزا سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ دونوں سپنوں کے اڑن کھٹولے پر سوار ہو کر آسمانوں میں اڑنے لگے۔ معصوم خوابوں کو حقیقت میں بدلنے کے لئے اور ہر حال میں دکھ سکھ بانٹنے کے لئے عہد و پیمان ہوئے۔ زندگی ساتھ نبھاتے اور وفاداری سے نباہ کرنے کے وعدے ہوئے۔ وہ ایک حسین شام تھی۔ ماجد اور مہوش مسرتوں سے پُر لمحات سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ نہ جانے کیا سوچ کر مہوش کہنے لگی۔

''ماجد...... زندگی کے کسی موڑ پر مجھے تنہا نہیں چھوڑنا۔ میں تمہاری جدائی کے تصور سے ہی کانپ اٹھتی ہوں۔''

''مہوش...... تم آج یہ کیسی باتیں کر رہی ہو۔ اچانک تمہیں تنہائی اور جدائی کا خیال کیوں آنے لگا۔''

''ماجد...... میں سوچتی ہوں اگر کسی نے تم کو مجھ سے چھین لیا تو......''

اور اگر تم نے مجھے چھوڑ کر کسی اور کا ہاتھ پکڑ لیا تو۔

ماجد نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''ایسا نہیں ہو سکتا...... ہرگز نہیں۔ کیا تم کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔''

اس نے ماجد کے مُنہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''اعتبار ہی پیار کا دوسرا نام ہے اور بھروسہ پیار کی بنیاد''۔

ماجد نے اس کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''تمہیں اپنے سارے وعدے اور قسمیں یاد ہیں نا''؟

''آف کورس مہوش...... میں آپ سے کئے ہوئے ایک ایک وعدے پر قائم ہوں''۔

''کاش اس بار ایم۔بی۔بی۔ایس میں ہمارا سلیکشن ہو جاتا پھر ہمارے سارے سپنے پورے ہونے میں ذرا بھی دیر نہیں لگتی''

مہوش نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''سب مقدر کی بات ہے۔پچھلی بار تو میرے صرف چار پوائنٹس کم تھے''۔

''اور مجھے تم سے بھی چار پوائنٹس کم تھے۔لیکن میری سہیلی سکینہ کو مجھ سے بھی کم پوائنٹس ملے تھے پھر بھی سلیکٹ ہو گئی''۔

''اوہ ہو......وہ تو ریزروڈ (Reserved) کیٹگری میں آتی ہے''۔

''وہ تو مجھے بھی معلوم ہے...... کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم بھی کسی کیٹگری میں آسکیں؟''

''کاش ایسا ہو سکتا، ہمارا سلیکشن پہلے ہی چانس میں ہو چکا ہوتا''۔

ماجد نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

دراصل ان دونوں کو ڈاکٹر بننے کا بے حد شوق تھا اور دونوں اس کے لئے کافی محنت بھی کر رہے تھے لیکن قسمت مہربان نہیں ہو رہی تھی۔اب کی بار دونوں کو یقین تھا کہ وہ اس منزل کو ضرور حاصل کرلیں گے۔

وقت گزرتا رہا۔دل وجان سے پڑھائی کرنے کے ساتھ ساتھ ان دونوں کی بے خوف ملاقاتوں کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ان کی ہر ملاقات کسی بڑی خوشی سے کم نہیں ہوا کرتی تھی۔انہیں لگتا تھا کہ جیسے سارا ماحول قوسِ قزح کے رنگوں کی طرح چمک رہا ہے۔

......اس دن بھی دونوں ملے لیکن سخت اُداسی اور غمی کی حالت میں۔انہیں چاروں طرف ہیبت ناک سائے نظر آرہے تھے۔کیونکہ ان کے سینے جیسے کانچ کے ٹکڑوں کی طرح

چکنا چور ہوئے تھے۔ایم۔بی۔بی۔ایس اینٹرنس کے نتائج آچکے تھے اور ان دونوں میں سے کوئی بھی ڈاکٹری کے لئے منتخب نہیں ہوا تھا۔مہوش تو بالکل غم سے نڈھال ہو چکی تھی۔اس نے جیسے جینے کی ساری امیدیں چھوڑ دی تھی۔اس کے کنول کے پھول جیسے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی، نیم واشربتی آنکھیں پژمردہ ہو چکی تھی اور خوبصورت یاقوتی ہونٹوں کا رنگ ماند پڑ چکا تھا۔

''مہوش...... یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے۔ہم امتحان میں ناکام ہوئے ہیں......زندگی میں نہیں''۔

ماجد نے اس کا موڑ ٹھیک کرنے کے لئے قدرے میٹھے لہجے میں کہا۔

''جب زندگی کا پہلا ہی سپنا پورا نہیں ہوا تو آگے کیا خاک کامیابی ملے گی''۔

اس نے بے رخی سے کہہ دیا۔

ضروری نہیں ہے کہ ہم ڈاکٹر ہی بن جائیں۔ہماری آنکھوں میں علم کی روشنی ہے اور ہم دنیا کو پہچان سکتے ہیں۔ڈاکٹر نہ سہی ہم پروفیسر، وکیل، جرنلسٹ کچھ بن سکتے ہیں۔ (Our future is bright)

''نو ماجد......مجھے ہر حال میں ڈاکٹر بننا ہے۔کسی بھی قیمت پر اور ہاں......آج کے بعد ہم تب تک نہیں ملیں گے جب تک نہ میں ڈاکٹری کی سیٹ حاسل کرلوں''۔

''ایسا ظلم مت کرو مہوش، میں تمہاری جدائی سہہ نہیں سکوں گا''۔

او ہو ماجد...... یہ ہمارے کیریئر کے لئے ضروری ہے۔ (Try to understand me)

''مگر مہوش......!!!''

''اگر مگر کچھ نہیں...... یہ میرا آخری اور اٹل فیصلہ ہے''

مہوش نے پُر اعتماد لہجے میں کہا اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے وہاں سے چلی گئی

اور ماجد ہاتھ ملتا رہا۔ ماجد نے اس کو منانے کی لاکھ کوشش کی لیکن وہ اپنے فیصلے پر اٹل اور بضد رہی۔ کچھ وقت تک ٹیلیفون پر ان کی بات ہوتی رہی اور آخر یہ رابطہ بھی منقطع ہوگیا۔ ماجد نے زہر کا یہ گھونٹ بھی یہ سمجھ کر پی لیا کہ مہوش اس کی منزل ہے اور وہ اسی کی جھولی میں گرنے والی ہے۔

لیکن ایک دن ماجد کی زندگی میں بھیانک زلزلہ آگیا۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا جب اسے اچانک یہ ناقابلِ یقین خبر ملی کہ مہوش کی شادی کسی دیہی علاقے سے آئے ہوئے ان کی ہمسایہ کالونی میں رہائش پذیر گھرانے میں شہباز نامی لڑکے سے طے ہوئی ہے جس کا والد اک اونچے سرکاری عہدے پر فائز ہے۔ ماجد کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اس کا دل چھلنی ہو رہا تھا اور وہ بغیر پانی کے مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ لیکن خبر سو فیصد سچ تھی اور محض کچھ ہفتوں کے وقفے کے بعد ہی باضابطہ طور مہوش کی شادی انجام دی گئی۔ ماجد یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ مہوش کو آخر ایسی کون سی مجبوری آن پڑی کہ وہ مجھے دھوکہ دے کر، میرے ارمانوں کا خون کر کے اتنی جلدی شادی کرنے کے لئے مجبور ہوگئی؟

ماجد کے زخم جو وقت کے مرہم سے کسی حد تک مندمل ہو چکے تھے، آج اس کے دوست کے چونکا دینے والے انکشاف سے پھر ہرے ہو گئے تھے۔ اس کے دل کا ہر درد جاگ اٹھا تھا۔

"کیا...... جب دیکھو مذاق کرتے رہتے ہو۔ اس کے سوا تمہیں کچھ سوجھتا ہی نہیں ہے"

سلیم کی بات سنتے ہی ماجد تلملا اٹھا۔

"میں مذاق نہیں کر رہا ہوں، یار۔ مہوش سچ مچ ایم۔بی۔بی۔ایس کے لئے منتخب ہو چکی ہے۔ یقین نہیں آتا ہے تو خود ہی مسابقتی امتحانی بورڈ کی ویب سائیٹ پر چک کر کے دیکھ لو"۔

"لیکن تمہیں کس نے بتایا؟"

مہوش نے خود فون کر کے مجھے یہ خوش خبری سنا دی"۔

سلیم کے چہرے کے تاثرات اور طرزِ کلام سے ماجد کو یقین ہو گیا کہ وہ واقعی سچ بول رہا ہے۔اس نے اپنے دل میں اٹھتے بے چینی کے طوفان کو چھپاتے ہوئے اپنے تیور بدل کر چہرے پر نقلی مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔

''چلو یار، اچھی بات ہے......اس کا یہ سپنا بھی پورا ہو گیا''۔

''لاکھ کوشش کے باوجود میری ڈاکٹر بننے کی حسرت پوری نہیں ہوئی۔''

''مگر اس کے پاس کون سی جادوئی چھڑی آگئی جو اس نے مجھے پڑھائی کے میدان میں بھی پچھاڑ کے رکھ دیا''

ماجد اس الجھن کو سلجھانے کے لئے رات بھر گہرے خیالوں میں ڈوب کر بے چینی کی حالت میں کروٹیں بدلتا رہا اور صبح پو پھٹتے ہی اس نے بازار کا رخ کیا اور اخبار خرید کر غور سے ریزلٹ نوٹیفکیشن پڑھنے لگا۔اوپن میرٹ میں ڈاکٹری کے منتخب امیدواروں کے نام اس نے ایک ایک کر کے پڑھ لئے لیکن مہوش کا نام اسے کہیں نظر نہیں آیا۔دفعتاً اس نے کچھ سوچ کر درجہ فہرست ذاتوں (Reserved Category) میں اس کا نام تلاشنا شروع کر دیا۔ کچھ لمحوں بعد اس کے پاؤں تلے کی زمین کھسکنے لگی اور سر چکرانے لگا جب اس کی نظریں ایم۔بی۔بی۔ایس کے لئے منتخب شدہ اس نام پر رُک گئی۔مہوش شہباز۔وائف آف شہباز احمد......اور پتہ کے کالم میں ایک دور دراز دیہی علاقے کا نام درج تھا۔

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم بھی کسی کیٹگری میں آسکیں۔ مجھے ہر حال میں ڈاکٹر بننا ہے، کسی بھی قیمت پر۔''

''ماجد کے ذہن میں مہوش کے کہے ہوئے یہ الفاظ طوفان بن کر گونجنے لگے اور اس سے اب یہ سمجھنے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی کہ مہوش کے پاس کونسی جادوئی چھڑی آگئی ہے اور خود غرضی کے کس خنجر سے اس کے معصوم اعتبار اور جوان ارمانوں کا خون کیا گیا ہے۔''

............☆☆☆............
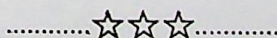
جنید جاذبؔ

نام	:محمد جنید بھٹی
قلمی نام	:جنید جاذبؔ
تاریخ پیدائش	:۵؍جنوری ۱۹۸۲ء
تعلیم	:پوسٹ گریجویشن (ماحولیات)
پیشہ	کالج لیکچرار
فون نمبر	+91 9906525666
ای۔میل	junaidjazib@gmail.com

یں

ین اس کی سوچ ہچکولے

☆......جنید جاذبؔ

آہوں کے درمیاں

ہر وقت شرارتوں، کھلکھلاہٹوں اور کلکاریوں میں بسی رہنے والی چھوٹی سی بہشت آسا کٹیا میں اچانک جاں لیوا خاموشیوں کی سنسناہٹ پھیل گئی تھی۔ بلوط کے مضبوط، کھردرے ستونوں پر اٹکے شہتیروں، اور ان پر تھمے چھال، مٹی کے چھت سے مسلسل اداسی ٹپک رہی تھی۔ تنگ وتاریک اور واجبی سا کوٹھڑی پھیل کر ایک بے انت صحرا بن گیا تھا جس کی خوف ناک وسعتوں میں وہ بھٹکتے پھر رہے تھے۔ آس پاس سے ایک کہرام سا ابھر کر ان کے وجود سے لپٹ رہا تھا۔ رُکے ہوئے وقت کا پَل پَل انھیں کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ ممتا کی ویران جھولی پھیلائے رقیہ بے آسی کے بھنور میں ہچکولے کھائے جا رہی تھی اور رشید کو اس کا ارد گرد ٹکڑوں ٹکڑوں نگلتا اور بھسم کرتا جا رہا تھا۔ سارا ماحول زہر میں بجھے تیروں کی مانند ان کے جسموں سے آر پار ہو رہا تھا۔

مُنا کو تین دن بیت گئے منوں مٹی کے نیچے پہنچے ہوئے لیکن اس دوران لمحہ بھر کو بھی وہ دونوں کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہو سکا۔ اس عرصہ میں شائد ہی کسی پَل نیند کی دیوی نے بھی ان کے بوجھل دیدوں کو مَس کیا ہو۔ اندر باہر ہر طرف متحرک بچپن کبھی ہواؤں میں ناچتا کبھی دیواروں ستونوں سے لپٹتا اور رقیہ اور رشید کو بے بس اور تڑپتا چھوڑ کر روپوش ہو جاتا۔ گارے مٹی کی دیواروں پر کوئلے سے کھچی ریکھاؤں سے ابھرتی چیخیں چلاہٹیں سماعتوں کو چیرتی ہوئی احساس کی رگوں میں کھُب جاتیں۔ معصوم شرارتیں، نوخیز پکاریں اور طفلانہ ادائیں ادھر ادھر سے گونجتیں، آس پاس تیرتیں اور کانپ کر دب جاتیں۔

آہٹیں ہوتیں، پاس پہنچتیں، اور دل کو چیر کر معدوم ہو جاتیں۔تھوڑی دیر کو یادوں کا تعاقب پناہیں بخشتا، دل بہلاتا لیکن احوالوں میں لوٹتے تو پھر یاسیت اور بے بسی سراپوں کو ڈھانپ لیتی اور دونوں بے حال ہو کر ادھ موئے پڑے رہ جاتے۔قطرہ قطرہ پگھلتے ہوئے، بیتتا سمے دلوں پر تیزاب انڈیلتا گذر رہا تھا۔امیدوں خوابوں کے سارے تانے بانے پل بھر میں عنکبوتی تاروں کے مانند بکھر کر معدوم ہو گئے تھے۔

''اب کبھی مُنا اس آنگن میں نہیں کھیلے گا.....اب کبھی مُنا یہاں نہیں ناچے گا..'' ذہن کا کینوس سوچ میں ڈھلنے لگا'' اب کبھی مُنا کی شرارتیں نہیں...مُنا اب کبھی دوڑتے ہوئے، چھلانگتے، پھلانگتے میرے پاس نہیں بھاگے گا.....مُنا اب کبھی نہیں لوٹے گا...ہائے میری جان،تو کہاں چلا گیا،تو کن دیسوں کو جا پہنچا...میں کیا کروں میرے بچے...میں کیسے جیوں..میں کیوں جئوں..میرے بچے ایک بار بس ایک بار تو بول..میں کیوں نہ مر گئی تیری آئی..ہائے مرے بچے''

رقیہ پھر روتے روتے ہلکان ہونے لگی تو وہیں ایک طرف کو ڈھیر ہو گئی۔دیر بعد اس نے اپنا جوان بدن سمیٹا اور تقریباً گھسیٹتے ہوئے دوسری طرف ڈال دیا اور پھر پہلے کی طرح پڑ رہی، دیر تک بے حس و بے حرکت۔رشید گھر کو آنے والے راستے پر نظریں جمائے جانے کب سے دروازے پر بے سُدھ پڑا تھا۔تھوڑی دیر بعد اس نے بے ارادہ رقیہ کی طرف دیکھا تو وہ سے مٹی کی بھری بوری کے مانند لگی جو کسی نے بے مصرف سمجھ کر یوں ہی چھوڑ دی ہو۔

''سب کچھ تو ختم ہو گیا...اب ہمارا جینا کیا،مرنا کیا...'' رشید نے افق کی طرف نگاہ دوڑائی۔ مایوسیوں سے اٹا ارد گرد کا سارا ماحول کھانے کو دوڑ رہا تھا۔رقیہ نے کچھ بولنا چاہا لیکن سسکی بھر کر لب بھینچ لئے۔

''معمولی سا بخار، اور گھڑیوں، پلوں میں کیا سے کیا کر گیا...''اس کی آنکھیں تر ہو گئیں اور گلا گھٹنے لگا۔پچھتاوے اور بے بسی کی آہوں کے درمیان اس کی سوچ ہچکولے

کھانے لگی...اس سے پہلے کہ وہ ٹھیکیدار سے یا کسی پڑوسی سے کچھ پیسے لے کر منّا کو لے کر شہر چلا جاتا، کسی قابل ڈاکٹر سے علاج کرواتا منا خود ہی سب سے بڑے معالج کے پاس چلا گیا...اتنی فرصت ہی نہ ملی کہ وہ اپنے لاڈلے کی جانبری کے لئے کچھ بھی کر گذرتا۔ خود کو کوسنے کے سے انداز میں سوچتا ہوا وہ پھر بڑبڑایا "اب پچھتانا کیا کام کا..." اور بے بس سی نگاہیں دور افق میں گاڑ دیں.....دور تک پھیلا صحرا خالی خالی سا، دھواں دھواں سا...سناٹا، چپی جیسے سانپ سونگھ گیا ہو، جیسے موت بے لگام ہو گئی ہو، جیسے سب رونقیں، رنگتیں، خوشبوئیں، نظارے وقت کی زہرنا کی چٹ کر گئی ہو۔

"اب کبھی مُنّا کو کھیلتا نہیں دیکھوں گا..اب کبھی منا گود میں چھلانگیں نہیں لگائے گا...اب کبھی منا پیچھے سے آ کر سر پر نہیں چڑھے گا...منا اب کبھی اس گھر میں نہیں لوٹے گا......" اس کی آنکھوں میں تیرتی شرارتیں اشکوں میں ڈھل گئیں اور گلا رندھ گیا۔

"جی" وہ دلاسا دینے آئے ایک پڑوسی کی باتوں پر دھیان دئے بغیر عادتاً بولا۔

اپنی بیوی کا بھی دھیان تمھیں رکھنا ہے" دن میں کوئی پڑوسن عورت ایسا ہی کچھ اس کی بیوی سے کہہ رہی تھی "رشید کا دھیان بھی تمھیں ہی رکھنا ہوگا..." عورت کا ادا کردہ جملہ اس کے ذہن میں گھومنے لگا۔

"اونہہ ہاہ.." وہ بے ارادہ، روکھے پن سے ہنس دیا لیکن احساس ہوتے ہی سامنے دیکھتے ہوئے پڑوسی کی جانب متوجہ ہو گیا۔ "...دیکھو تو اس کی حالت...دو دن میں سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے....دیکھو تو دو دن میں چہرہ دس سیر سے چھٹانگ بھر کا ہو کر رہ گیا ہے" رشید کے کانوں میں باتیں گڈمڈ ہونے لگیں۔

تھوڑی دیر بعد پڑوسی جانے کے لئے اٹھا تو وہ بھی ساتھ باہر تک آ گیا۔ اٹھتے ہوئے اس کا سر چکرانے لگا تو خلافِ عادت اس نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اپنا سراپا سیدھا کیا۔ تھکن سے اس کا انگ انگ مضمحل ہو چلا تھا۔ پڑوسی چلا گیا تو دیر تک وہیں کھڑے کھڑے تھک کر گرنے لگا تو وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اندر آ گیا۔ اچانک اسے رقیہ کا خیال

آیا۔اس نے پلٹ کر رقیہ کی جانب ایک نظر دیکھا وہ جوں کی توں کھوئی کھوئی، ادھ کھلی آنکھوں سے جانے کن بے دیکھی خلاؤں میں گھور رہی تھی۔اسے یوں لگا جیسے اس کے گرد و پیش بس خلاء ہی خلاء ہو اور رقیہ اس وسیع خلاء میں اوندھی پڑی اپنے وجود کو سیدھا کرنے کی بے جہت جدو جہد کر رہی ہو۔اس نے قدرے قوت سے اپنا سر جھٹکا اور دیدے جبراً وا کرتے ہوئے دو تین بار گردن ادھر ادھر گھمائی تا کہ پوری طرح ہوش حواس میں آجائے۔لیکن تو بھی اس کو لگا جیسے اس کو اپنے حواس پر کوئی خاص اختیار نہ ہو اور بدحواسی کے عالم میں وہ بے اختیارانہ ادھر ادھر ڈول رہا ہو جیسے سخت بخار میں مبتلا انسان نیم بے ہوشی کے عالم میں عجیب وغریب قسم کے خوابوں کے نرغے میں ہوتا ہے۔

رشید نے محسوس کیا جیسے گلے کی گھٹن سینے میں پھیلتی ہوئی نیچے کی طرف اتر رہی ہو۔اسے ناف کے گرد اندر کی جانب کھنچاؤ محسوس ہوا۔پھر یہ کھنچاؤ ایک بڑی کھائی میں تبدیل ہوتا ہوا لگنے لگا جس میں سینے سے اترتی گھٹن دھیرے دھیرے گھوم رہی ہو۔اچانک ایسا لگتا جیسے ایک غبار سا اس کھائی میں موجود تیزابی غبار سا اس کے اندرونی جوف کو کھائے جاتا ہو اور گڑ گڑاہٹ کی ہلکی ہلکی آوازیں معمولی سے ارتعاش کے ساتھ اٹھتی ہوئی اپنے آپ مدھم ہو جاتی ہوں۔ ہر لمحہ گہراتی کھائی میں کوئی شئے گویا اپنے آپ دھکے کھاتی بار بار گر رہی ہو۔ دوسرے ہی لمحے پیٹ کی cavity کی دونوں پرتیں ہوا نکل جانے کی وجہ سے باہم چپکتی ہوئیں معلوم ہونے لگیں۔اسے لگا جیسے ارد گرد کا ویران صحرا اس کے اپنے اندر در آیا ہو اور جو کھائی کی شکل میں ڈھل کر لحہ لحہ پھیلتا جارہا ہو، اسے نگلتا جارہا ہو، ڈستا جارہا ہو....

نقاہت کو جھٹکتے ہوئے اس نے ہمت جٹا کر گھر کو نظروں کے احاطے میں سمیٹا تو کہیں اندر سے پیدا ہونے والی ایک گہری آہ نے اس کے جسم و جان کو کچوکے بھر کر چھوڑ دیا

''تین دن''...ذہن کے کسی گوشے میں ایک خیال کوندھا۔پچھلے تین دنوں سے وہ کام پر نہیں گیا تھا...''ہفتہ،ایت وار، پیر، منگل...''وہ انگلیوں پر گننے لگا۔پھر خود کلامی کرتے ہوئے بڑبڑایا''تین دن...نہیں...چار دن''اپنے آپ کو درست کرتے ہوئے وہ

اٹھتے اٹھتے کچھ سوکر پھر بیٹھ گیا۔ چند ثانیئے گم صم بیٹھے رہنے کے بعد وہ کھڑا ہوا، ایک نظر رقیہ کی جانب دوڑائی اور چپ چاپ سا باہر نکل گیا۔ رقیہ نے دھیرے سے پپوٹے اٹھا کر ،قریب قریب پوری کھلی نظروں سے اسے جاتے دیکھا لیکن کچھ کہے بنا ساکت اپنی جگہ بے سدھ پڑی رہی۔

رشید جھونپڑی سے نکل کر سیدھا قریبی قصبہ کی طرف جانے والی سڑک کی جانب چل دیا۔ تھوڑی دیر میں وہ قریبی سڑک سے بٹی نئی بن رہی رابطہ سڑک پہ جا پہنچا جہاں کچھ روز قبل تک وہ مستری کا کام کرتا تھا۔ کام کی جگہ پر پہنچ کر اسے خیال آیا کہ وہ انگوچھا بھول آیا ہے جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا تھا اور دن کے دوران کئی طرح کے کام دیتا تھا۔ کمزوری محسوس کرنے کے باوجود وہ یوں کام پر ٹوٹا جیسے کوئی پہلوان کُشتی کے میدان میں اترا ہو۔ ہاتھ میں چھینی اور ہتوڑا لیئے وہ دن بھر دنیا و مافیہا سے بے نیاز پتھروں سے نبرد آزما رہا۔

''بے چارہ پگلا گیا ہے... اکلوتا بچہ چلا گیا ہے بے چارے کا... اولاد کی موت انسان کو اندر سے مار دیتی ہے.. دل مرجاتا ہے... دماغ ...'' ایک مزدور نے دوسرے سے کہا۔ رشید تھوڑے فاصلے پہ بیٹھا چپ چاپ ایک پتھر پہ ہتوڑے کا دستہ ٹھوکتا رہا۔

شام کو منشی سے اپنی مزدوری وصول کر، راشن کی دکان سے ہوتا ہوا وہ سیدھا گھر پہنچا۔ نقاہت سے لڑتے ہوئے رقیہ، تین دن سے بجھے چولہے میں لکڑیاں سیدھی کرنے لگی۔ تھوڑی دیر میں کھانے کی مہک دھوئیں کی مہک میں مل کر رشید کے نتھنوں سے ٹکرانے لگی تو اس نے اٹھ کر ہاتھ دھوئے، چہرے پر پانی کا چھینٹا مارا اور المونیم کی تھالی میں رکھی چپاتیوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ غذا شائد ابھی معدے سے خون میں منتقلی کے مراحل سے گذر رہی تھی کہ اس کی دائیں آنکھ سے ایک آنسو ڈھلک کر اس کے سپاٹ چہرے پر بہتا ہوا منہ میں چلا گیا۔ اسے یوں لگا جیسے منا اس کے سامنے دیوار کے ساتھ لگا کھلکھلا کر ہنس رہا ہو۔ رشید کے چہرے پر طمانیت کی خفیف سی لہر ابھر کر جذب ہوگئی۔

............☆☆☆............

SHEERAZA

ISSN NUMBER: 832-2277-9833

HUMASSAR AFSANA NUMBER

(Vol: 51, No: 01 - 03)

Published By:
J&K Academy of Art, Culture and Languages
Srinagar/Jammu

Printed By
R.M OFFSET ART PRESS
Cell:- 09796994269-097...9038...
Email:-roufshah2012@g...il.com